قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مئی 2024 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اورایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4
خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5
زبان و تعلیم
اردو ذریعہ تعلیم میں اختصاص، گنجائش اور امکانات — احمد حسین 7
تعلیم میں مصنوعی ذہانت کا استعمال — مصباح انظر 10

نکات میر
نکات الشعرا میں مستعمل تنقیدی اصطلاحات — محمد باقر حسین 13
'نکات الشعرا' میں دکنی شعرا — محمد نہال افروز 17
ادب، زاویے، جہات
ساحر کی نظم تاج محل اور جمالیات — سید محمود کاظمی 21

ابن صفی کے تنقیدی خیالات — محمد طیب علی 24
شہر وانمباڑی اور اردو لوک ادب — فوزیہ حبیب 28
سنسکرت اور فارسی کے لسانی رشتے — رانی حفیظ 30
ادب اطفال: تخلیقی تقاضے اور بچوں کی نفسیات — آفرین رضا 33
لعل و گہر
عاصی سعید کی مزاح نگاری — راشد جمال فاروقی 36
آسی رام نگری کی شعری کائنات — رشی کمار شرما 38
مصور مناظر ابوالاسرار رمزی اٹاوی — اکمل نعیم صدیقی 40
شہر، شاعری اور ثقافت
شعرائے نامور ان امرتسر — ریحان حسن 44
تاریخ و تہذیب
ممبئی: عرب تاریخی مطالعے کا ایک اہم ترین مرکز — صہیب عالم 49

اظہار الاسلام کے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت — شیخ ظہور عالم 52
ہندی جھروکہ
دشینت کمار: ہندوستانیت کا نمائندہ قلم کار — رؤف خیر 56

سلسلۂ صحافت
مجلّہ 'عالمی اردو ادب' ایک اجمالی جائزہ — سرتاج احمد میر 59
سماجیات
تہذیبی حقائق اور نسلیاتی مطالعہ — محمد آفتاب عالم 63
فلم
راہی معصوم رضا کا فلمی سفر — جگدمبا دوبے 66
نیا آسمان نئے ستارے
رشید احمد صدیقی بحیثیت مکتوب نگار — محمد امام الدین 69

اردو ادب میں اساطیر — طیبہ بانو 72
کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 76
خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 83

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد: 26، شمارہ: 05، مئی 2024
مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم
ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید
قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages: 100
• اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
• ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in
شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

ہماری بات

کتابیں انمول خزانہ ہیں، کتابوں سے ہی انسان رہنمائی حاصل کرتا ہے اور منزل مقصود تک پہنچتا ہے، کتابوں کے مطالعے سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور مدلل گفتگو کا سلیقہ بھی آتا ہے، کتابوں سے ہی آج دنیا ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔ اسی کے ذریعہ ماضی کے تابندہ نقوش تک رسائی ہوتی ہے۔

انسان اور کتاب کا رشتہ اتنا قدیم ہے جتنا کہ انسانی تہذیب وتمدن۔ کتاب انسان کو جہاں معتبر، مہذب اور باوقار بناتی ہے وہیں اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتی۔ کتابوں کے مطالعے سے تخلیقی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس سے جہاں علم میں اضافہ ہوتا ہے وہیں کتابیں پڑھنے والا اپنے علم کے اظہار کے مؤثر راستے اور طریقے بھی دریافت کرتا ہے۔ کتابوں کی اہمیت، افادیت اور اس کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں۔ اس کا افادی پہلو ہر دور میں معتبر اور مسلم رہا ہے۔

دنیا برق رفتاری سے ترقیات کے منازل طے کر رہی ہے۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے پوری دنیا کی لائبریریوں تک ہماری رسائی آسان ہوگئی ہے۔ ہم جس موضوع اور جس فن کی کتابیں پڑھنا چاہیں بہ سہولت ان کتابوں تک پہنچنا ہمارے لیے ممکن ہوگیا ہے۔ بس ضرورت ہے کتاب کلچر کو عام کرنے کی۔

اردو کی ترویج واشاعت اور بقا کے لیے کتابوں کی اشاعت وفروغ ناگزیر امر ہے۔ اس سلسلے میں قومی اردو کونسل اور دیگر اشاعتی ادارے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ قومی کونسل نے اشاعت کتب کے باب میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں سے ادبیات اور زبان ولسانیات ہی کی نہیں بلکہ عصری علوم وفنون کی بھی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اس ادارے نے اب تک ادبیات، انسائیکلو پیڈیا، لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، سوانح، مونوگراف، زبان ولسانیات، سائنس/ تکنیک/ جغرافیہ، سماجیات، سیاسیات، صحافت، طب ومعالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری وکتابیات، معاشیات/ تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب پر 1400 سے زائد کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اردو کے بہت سے اشاعتی ادارے ہیں۔ مگر ضرورت ہے کتابوں کا رشتہ قاری سے جوڑنے کی اگر قاری نہیں ہوں گے تو ان کتابوں کی اشاعت سے کیا فائدہ؟ کتابیں تو بہ کثرت چھپ رہی ہیں مگر موجودہ دور میں قاری کا فقدان ہے اور یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے۔ مشہور فلمی نغمہ نگار گلزار نے اس تعلق سے بہت عمدہ نظم کہی ہے۔

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پَردوں پر

آج بڑی تعداد میں طلبا یونیورسٹیوں میں ریسرچ کر رہے ہیں اور تحقیقی مقالے تحریر کر رہے ہیں انھیں ترغیب دینے کی ضرورت ہے کہ اپنے تعلیمی وظائف میں سے کم از کم ایک حصہ کتابوں کی خریداری کے لیے ضرور مختص کریں اسی طرح اساتذہ کے پاس بھی لغات اور حوالہ جاتی کتابوں کا ذخیرہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ اگر ان کے پاس حوالہ جاتی کتابیں نہیں ہوں گی تو طلبا کی رہنمائی کیسے کریں گے۔

قومی اردو کونسل کتابوں کی نمائش اور مذاکرات کے ذریعے بھی اردو داں طبقے کو راغب کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ قومی اردو کونسل چاہتی ہے کہ جامعات اور کالجوں کے اساتذہ وطلبا کے ساتھ محبانِ اردو بھی اس سلسلے میں تعاون فرمائیں اور اپنے احباب اور اطراف واکناف میں لوگوں کو کتابیں خریدنے کی ترغیب وتحریک دیں تاکہ اردو کا اشاعتی سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہ سکے۔ اگر ہم کتابوں کے مطالعے کو اپنے معمول میں شامل کرلیں تو اس کے مثبت، صحت مند اور خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے، زبان وادب کی بھی ترویج ہوگی اور ہماری زندگی بھی بہتر ہوگی۔

شمس اقبال

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہ اپریل 2024 کا اردو دنیا باصرہ نواز ہوا۔ سبز مائل کتابیات سے مرصع سرورق مشمولات کی عمدگی کا پتہ دے رہا ہے۔ بہت نوازشات!

اداریہ... جمود سے حرکت وعمل کی جانب گامزن ہونے کا اشاریہ ہے کہ۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

کثیر لسانی ملک ہندوستان گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار ہے اور اسی مناسبت سے تہذیبی تضادات کے تمام تر روشن امکانات کے باوصف قومی اتحاد کا پرچم بلند تر ہے کہ کثرت میں وحدت ہی ہمارے ملک کی پہچان ہے۔

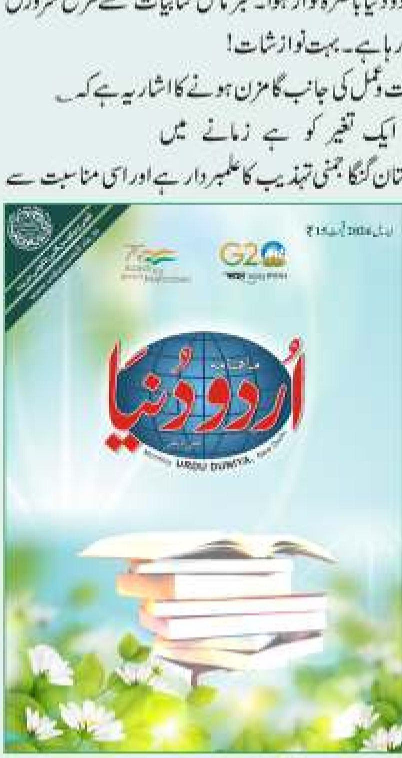

تراجم کو نئی دشا دکھانا اور اس سمت قارئین کو متوجہ کرنا ایک اجتہادی قدم ہے۔ قبائلی آدی باسی زبانیں اور شمال مشرق کی زبانوں کے تراجم یقیناً ادب میں بیش بہا اضافہ ثابت ہوں گے۔ اداریہ کا گوشہ پرلطف اور پرمغز ہے۔

اس شمارے کے مشمولات بعنوان زبان وتعلیم، لعل وگہر، ادب زاویے اور یاد رفتگاں، خصوصی گفتگو، کتابوں کی دنیا اور خبر نامہ، زبان و ادب کی تمام تر علمی و ادبی شخصیات اور اصناف شعر ونثر کو اپنی تخلیقی کاوشوں سے جلا بخشنے والے مشاہیر ادب کے رشحات قلم کی بہترین کارکردگی کا آئینہ ہے۔ زبان کے رموز، قواعد کی اہمیت، جگن ناتھ آزاد، اردو فکشن، اور فراق گورکھپوری، غرض تمام تر مشمولات معیاری اور مطالعے کے لطف کو دوبالا کر رہے ہیں!

ڈاکٹر رضوانہ ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ

اردو دنیا اپریل 2024 کا شمارہ موصول ہوا۔ رسالے کا پہلا مضمون مصطفیٰ ندیم خان غوری کا زبان اور اس کی رموز زبان کی Phonetic یعنی صوتیاتی ساخت کے حوالے سے زبان کے رموز کو ہزاروں سالوں پر محیط عالمی انسانی تاریخ کو عالمی پس منظر میں پیش کرتا معلوماتی مضمون ہے۔ خدا نے انسان کو ہنر گویائی عطا کر کے اسے تمام مخلوقات میں افضلیت بخشی ہے، زبان محض ادائے مطلب یا جذبات اور احساسات کے اظہار کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ تہذیب وثقافت کا وہ محور ہے جو انسانی علوم وفنون کی ترویج و اشاعت اور ارتقائی عمل کی ضمانت ہے کسی بھی زبان کی اساس کا مدار لفظی اور معنی اصولوں پر ہے۔ ان اصول وضوابط کا مطالعہ خاص قواعد کہلاتا ہے۔ تدریسی اعتبار سے خصوصاً زبان کے طالب علم کے لیے قواعد کی اہمیت خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ محمد ارشد کا مضمون اردو زبان کی تدریس میں قواعد کی اہمیت اس حوالے سے بہترین مضمون ہے۔ رسالے کا دوسرا گوشہ لعل وگہر کے عنوان سے ہے جہاں بہت سے اہم اور نامور غزل گو شعرا کے علاوہ پردہ خفا میں موجود جواہروں کی خوبصورت محفل سجائی گئی ہے۔ مسرور اورنگ آبادی، عبدالشکور آہ مظفر پوری کی غزلیہ شاعری پر دو مضامین شامل ہیں اس کے علاوہ کوثر چاند پوری کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے معلوماتی مضمون بھی عمدہ ہے، مضمون کے مطالعے سے کوثر چاند پوری کی نہ صرف شاعری بلکہ مختلف اصناف ادب پر ان کی گرفت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ افغان اللہ خان کی فراق شناسی پر ذاکر حسین کا مضمون بھی خوب ہے اس کے علاوہ فراق پر ایک اور مضمون بھی رسالے میں شامل ہے جو فراق کے غیر مطبوعہ خطوط پر روشنی ڈالتا ہے۔ عزیز احمد خان کا یہ مضمون بھی کارآمد ہے۔ فہیم الدین کے مضمون سے سلیم جعفری کی ہمہ جہت شخصیت سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی ادبی شخصیت پر محمد شفیع بھٹ کا معلوماتی مضمون ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی ادبی اہمیت سے پورا انصاف کرتا نظر آتا ہے۔ احمد امتیاز کا مضمون جگن ناتھ آزاد کی نظموں کی مختلف جہاتوں کا متلاشی ہے، تو فکشن میں معاشرت کی عکاسی خصوصاً زمیندارانہ معاشرے کی عکاسی پریمی اقبال کا مضمون اور فکشن کے رومانی اسلوب پر عرفان رشید کا مضمون بہترین ہے۔ آزادی کے بعد اردو نظموں میں ہندوستانی عناصر کی تشخیص، سید نفیس دسنوی کا شکیل دسنوی پر محبت سے لبریز مضمون بھی اہمیت قائل ہے۔ پروفیسر محمد اسلم خان

کی شخصیت، فاروق ناز کی غزلیہ کائنات، سالک بستوی کے تخلیقی سفر کا جائزہ، ڈاکٹر شعور اعظمی کا خصوصی انٹرویو بھی بے حد معلوماتی ہے۔ شمارہ ابتدا تا آخر ہمیشہ کی طرح چنندہ ادبی مضامین سے پر ہے، شمارے کی تزئین اور مضامین کے انتخاب پر تمام اراکین کو مبارکباد!

ڈاکٹر گلشن مسرت: کیریئر کانونٹ گرلز پی جی کالج کے لکھنؤ

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ (اپریل 2024) موصول ہوا۔ پرکشش تصویروں اور معیاری تحریروں سے مزین حسب دستور یہ شمارہ بھی دامن دل کھینچتا ہے۔ اداریہ کافی معنی خیز اور تقاضائے وقت کے مطابق ہے۔ آج اس مصرعے کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن۔ اسی سے اس ملک کی خوبصورتی ہے اور بقا بھی۔ مختلف تہذیبوں کی رنگا رنگی سے ہی اس ملک کے حسن میں جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ اردو زبان کی تدریس میں قواعد کی اہمیت محنت سے لکھا ہوا ایک طویل مضمون ہے جس میں رسم الخط، املا اور قواعد کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر بعض مقامات پر جہاں وضاحت کی ضرورت تھی سرسری گزر جانے کے سبب بات واضح نہیں ہو سکی ہے۔ رسم الخط کی بحث اگرچہ تفصیلی ہوئی ہے مگر بعض بنیادی باتیں رہ گئی ہیں اور کچھ تشنہ بھی ہیں۔ مضمون نگار کی کچھ باتوں سے اتفاق بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس شمارے کے خطوط بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں پچھلے شمارے کی تحریروں پر بے لاگ تبصرے درج ہو گئے ہیں۔

نِہاں: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، یوپی

ماہ نامہ 'اردو دنیا'، جلد: 26، شمارہ: 04، بابت: اپریل، 2024 باصرہ نواز ہوا۔ اس کرم گستری کے لیے ممنون ہوں۔ یوں تو شمارۂ ہٰذا میں مشمولہ جملہ تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی مضامین قابل ستائش اور معلومات افزا ہیں۔ تاہم، اردو زبان کے حوالے سے مرقومہ مقالہ جات، بالترتیب، بہ عنوان 'زبان اور اس کے رموز' از مصطفیٰ ندیم خان غوری، اور 'اردو زبان کی تدریس میں قواعد کی اہمیت' از محمد ارشد، خاصے وقیع ہیں۔ میری جانب سے ہر دو مقالہ نگاران کو بہت داد و دہش اور تحسین و آفرین پیش کیجیے گا۔

فریدہ انجم: پٹنہ سٹی، بہار

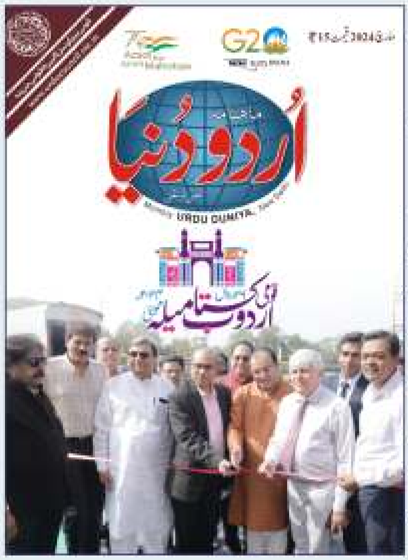

ماہنامہ 'اردو دنیا' مارچ کے شمارے کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا، شمارے کو دیدہ زیب سرورق اور بیش بہا معلومات کا خوبصورت مرقع اور ادب عالیہ کا حسین گلدستہ پایا؛ جس کا ہر ایک پھول خوشبوئے علم و ادب سے معطر ہے، شمارے میں شامل ہر ایک مضمون قابل قدر ہے اور اپنے جلو میں ذخیرۂ معلومات لیے ہوئے ہے۔ بالخصوص یادِ رفتگاں کے زیر عنوان ماسٹر محمد احمد دانش کا پروفیسر بدرالدین الحافظ کی وفات حسرت آیات پر تحریر کردہ خاکہ بنام 'پروفیسر بدرالدین الحافظ یادیں باتیں' پروفیسر مرحوم پر لکھا گیا مضمون بہت جامع اور دلکش ہے۔ اس مضمون سے جہاں پروفیسر بدرالدین الحافظ کی نابغۂ روزگار شخصیت اور عبقریت کا بھرپور علم ہوتا ہے وہیں مضمون نگار کے قلم کی جادو نگاری اور تذکرہ نویسی کا مثالی اسلوب بھی قاری کے دل کو مسحور کرتا ہے۔ انھوں نے پروفیسر موصوف کے سوانحی نقوش اور ان کی ادبی کاوشوں کو اپنے قلم گوہر بار سے بہت ہی عمدہ طریقے پر اجاگر کیا ہے، خاکے میں اگرچہ کسی شخصیت کے جملہ حالات و واقعات اور تمام تر علمی سرگرمیوں کا تفصیلی احاطہ نہیں کیا جا سکتا لیکن مختصر طریقے پر پروفیسر موصوف کی زندگی کے مطالعہ اور ان کی شخصیت فہمی کے لیے یہ مضمون ہی کافی ہے۔

محمد سعد شاد سیوہاروی: سیوہارہ، بجنور، یوپی

ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2024 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت خوب ہے۔
اس شمارے میں 'املا سے بے نیازی ایک بڑی غلطی' کے عنوان سے اسلم جاوداں صاحب کا مضمون استفادے کی نظر سے دیکھا۔ بہت مفید تحریر ہے۔ اردو زبان میں بے راہ روی کی ایک مثال املے سے بے نیازی بھی ہے۔ اس مضمون میں جتنی مثالیں دی گئی ہیں صحیح ہیں سوائے چند مقامات کے۔ اول خود عنوان میں املے لکھنا چاہیے تھا۔

دوسرے 'وہ ایک چڑیا کی طرح گاتا چلا جاتا ہے۔' اس میں چڑیا کی اصلاح کرتے ہیں کہ 'وہ ایک چڑیے کی طرح گاتا چلا جاتا ہے'۔ جب کہ اس جگہ اہل زبان چڑیا ہی بولتے ہیں 'چڑیے' نہیں۔

لکھتے ہیں: 'ڈنڈا۔ اسے ڈنڈے مار کر بھگاؤ' یہاں لفظ ڈنڈے ڈنڈا کی جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے نہ کہ املے کے لیے۔ املے کی مثال یوں دی جاتی: اسے ڈنڈے سے مار کر بھگاؤ۔

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی: 1659، بھوانی اپارٹمنٹ، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، دہلی 110002، موبائل نمبر: 9891007314

احمد حسین

اردو ذریعہ تعلیم میں اختصاص، گنجائش اور امکانات

اردو جنوبی ایشیائی برصغیر کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے اور ہندوستان کی سرکاری طور پر تسلیم شدہ قومی زبانوں میں اہم مقام رکھتی ہے۔ ہندوستانی ریاستوں میں اس کے بولنے والوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ جنوبی ایشیائی ممالک کے علاوہ دنیا کے مختلف حصوں جیسے امریکہ، یوروپ اور عرب ممالک میں بھی لاکھوں افراد اردو بولتے ہیں۔ اردو ایشیا کی سب سے اہم ادبی اور ثقافتی زبانوں میں سے ایک ہے، جس میں ایک بھرپور ادبی روایت موجود ہے جو جدید معیاری زبان اور پہلے کی بولیوں میں لکھی گئی ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان مادری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ثانوی زبان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اسکولوں اور مدارس میں بطور مضمون اور بطور ذریعہ تعلیم استعمال کی جاتی ہے۔

کسی قوم کی تعلیمی، معاشی اور عملی ترقی کا دار و مدار اس کی قومی تدریسی زبان پر ہوتا ہے، کیونکہ جب تدریسی زبان فطری اور قابل فہم ہوگی تو طلبا نہ صرف مضمون کو سمجھ سکیں گے بلکہ اس حوالے سے وہ اپنے خیالات وتصورات کو بہتر انداز میں پیش کر سکیں گے۔ اگر زبان قابل فہم نہ ہو تو کوئی اصول یا نظریہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو طلبا اس کی گہرائی میں نہیں اتر سکیں گے اور نہ ہی اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

1871 میں جرمنی کی فوج نے فرانس کے سرحدی صوبوں پر قبضہ کیا تو وہاں کے ایک استاد (مسٹر ہیبل) نے طلبا اور شہر کے معزز افراد کو جمع کر کے کہا کہ:

”فرانسیسی دنیا کی مضبوط ترین، واضح ترین اور حسین ترین زبان ہے۔ یہ ہمارے قومی ورثے کی واحد محافظ ہے۔ جب ایک قوم غلام بن جاتی ہے تو جب تک وہ اپنی زبان کو محفوظ رکھے، اس کے پاس وہ چابی رہتی ہے جس سے وہ اپنے قید خانے کا دروازہ کھول سکتی ہے۔“

(The Last Lesson Book by Alphonse Daudet)

کسی بھی ملک میں ایک بین الاقوامی زبان پڑھانا ضروری ہے تا کہ دیگر ممالک کے ساتھ سفارتی وتجارتی روابط کی ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ طلبا اپنی مادری اور قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک غیر ملکی زبان کو بھی بخوبی سیکھیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس غیر ملکی زبان کو اتنی ترجیح دے دی جائے کہ طلبا احساس کمتری کا شکار ہو جائیں اور مادری اور قومی زبان میں بھی خود کو ماہر نہ بنا سکیں۔

اپنی مادری زبان میں طلبا جتنا کھل کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کریں گے تعلیم کی بنیاد اتنی ہی مضبوط ہوگی اور تعلیم کی مضبوط بنیاد اس بات کی ضامن ہے کہ قوم اور ملک کے سامنے ترقی کے راستے کھلتے جائیں گے۔ ہندوستان میں اردو دیگر تمام زبانوں مثلاً تمل، تیلگو، سنسکرت، کنڑ اور اڑیا وغیرہ کی طرح مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

آزادی سے قبل فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی، لیکن رفتہ رفتہ مختلف زبانوں کے میل نے اردو کو جنم دیا۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی فورٹ ولیم کالج کا کردار بہت اہم ہے، جو 10 جولائی 1800 کو کلکتہ میں قائم کیا گیا اور 1854 تک قائم رہا۔ اس کالج کا سب سے اہم کام مختلف کتابیں تالیف اور ترجمہ کروا کر ٹائپ میں شائع کروانا تھا۔ ان کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ان کی زبان سادہ اور سلیس اردو نثر تھی۔

گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق، اس کالج کے قیام کا ایک اور اہم مقصد کمپنی کے عہدے دار اور عملہ جنھیں عام طور پر عوام سے معاملات کرنے پڑتے تھے اور انھیں اس میں مقامی زبانوں سے ناواقفیت کی وجہ سے دشواری پیش آ رہی تھی، ان کے لیے ضروری محسوس کیا گیا کہ انھیں ہندوستانی زبانوں اور معاشرت کی تعلیم دی جائے۔

ابتدا میں فورٹ ولیم کالج میں انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت کے ساتھ تمل، تیلگو، کنڑ، مراٹھی، بنگالی اور ہندوستانی یعنی اردو کی تعلیم کا انتظام تھا۔

ترجمے کے ذریعے اردو کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کرنے والا ایک اور اہم ادارہ 1825 میں (اورینٹل کالج/ دلّی کالج) دہلی میں قائم کیا گیا۔ یہ ملک میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا جس نے اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے 'ذریعہ تعلیم' کے طور پر روشناس کرایا۔

ہندوستان کا ایک اور اہم ترین ادارہ جس نے اردو کی ترقی میں بطور ذریعہ تعلیم نمایاں کردار ادا کیا وہ 1919 میں قائم ہونے والا جامع عثمانیہ تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ جامع ملیہ اسلامیہ اور دارالعلوم دیوبند کا قیام بھی عمل میں آیا جن کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سر جان سارجنٹ نے مشیر تعلیم کی حیثیت سے سارجنٹ پلان بنایا جو 1944 میں شائع ہوا، اس پلان میں ثانوی سطح تک ہندوستانی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس پلان میں ہندوستانی کی تعلیم پر زور دیا گیا، جو دونوں رسم الخط (دیوناگری اور فارسی) میں ہو۔ کیونکہ ہندوستانی یعنی اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان تھی۔ یہ صورت حال ہندوستان کی آزادی سے پہلے کی تھی۔

آزاد ہندوستان میں مختلف تعلیمی کمیشن وجود میں آئے، جن میں رادھا کرشنن کمیشن (1948)، سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن (1952-53)، کوٹھاری کمیشن (1964-66) وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کی سفارشات میں ذریعہ تعلیم کے اعتبار سے علاقائی/ مادری زبان کو ترجیح دینے کی بات کہی گئی۔ سہ لسانی فارمولہ (1956) میں اس بات پر زور دیا گیا کہ طلبا کو تین زبانیں لازمی طور پر پڑھنی چاہیے: مادری/ علاقائی زبان، ہندی/ انگریزی زبان (سرکاری زبان)، جدید ہندوستانی/ غیر ملکی زبان۔

تقسیم ملک اور آزادی کے بعد تقریباً ایک دہائی تک نظام تعلیم اور ذریعہ تعلیم کے بارے میں کوئی دوررس

تبدیلیاں نہیں ہوئیں اور مختلف کمیشنوں کی سفارشات پر پوری طرح عمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ 1956 میں لسانی بنیاد پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور ریاست کی اکثریت کی زبان وہاں کی سرکاری اور تعلیمی زبان بن گئی۔ جس کی وجہ سے ان زبانوں کی ترقی کی راہیں ہموار ہوگئیں۔ غرض لسانی تقسیم کے نتیجے میں بیشتر علاقائی زبانیں ریاستی زبانیں قرار پائیں لیکن بدقسمتی سے اردو کسی ریاست کی اکثریت کی زبان نہ بن سکی۔ موجودہ وقت میں اردو کو اترپردیش، بہار، دہلی، کشمیر، تلنگانہ اور ویسٹ بنگال کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

میڈیم آف انسٹرکشن یا ذریعہ سے مراد زبان کا وہ ذریعہ یا واسطہ ہے جو ذریعہ ابلاغ ہو، اگرچہ 'ذرائع' اور 'واسطے' لسانی و غیر لسانی بھی ہو سکتے ہیں۔ تاہم یہاں ذریعہ تعلیم سے مراد وہ زبان ہے جو ذریعہ تعلیم یا میڈیم آف انسٹرکشن اور تعلیم و تعلم کا ذریعہ بنائی جائے، اور جس کے ذریعے سے علم/ معلومات کا ارسال اور ابلاغ ہو۔ جو چیز انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے برتر اور ممتاز بناتی ہے وہ اس کی فکر و تخیل کی صلاحیت ہے۔ اور فکر و تخیل کو جلا بخشنا تعلیم کا ایک بنیادی مقصد ہے، جس کے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبے میں ترقی و کامیابی ناممکن ہے۔ تعلیم کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ تخلیقی تخیل یا Creative Imagination کی صلاحیتوں کو فروغ دیا جائے۔

دنیا کے تمام فلسفے، سائنس، آرٹ اور دیگر تمام علوم انسانی تخیل کی ہی بدولت ترتیب دیے گئے ہیں۔ تعلیم کا ایک اہم مقصد حصول معاش بھی ہے۔

ایڈیسن کا قول ہے: ''ہم اس تعلیم کو سرے سے تعلیم نہیں سمجھتے جو آدمی کو اس کی روزی کمانے کے لیے قابل نہ بنا دے۔''

ایسے بہت سے افراد ہیں جو تعلیم کو صرف ذریعہ معاش سمجھتے ہیں، اور اس کے برخلاف ایسے افراد بھی کافی تعداد میں موجود ہیں جو 'علم برائے علم' کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات واضح طور پر عیاں ہے کہ دور حاضر میں جہاں تعلیم علم برائے علم ہے، انسان کی نشو ونما کا ذریعہ ہے، وہیں تعلیم ذریعہ معاش بھی ہے۔

پروفیسر انعام اللہ خاں شیروانی (سابق لیکچرار ایم ای ٹی ٹیچرس کالج، سوپور کشمیر) اپنی کتاب 'تدریس زبان اردو' میں رقمطراز ہیں:

''ذریعہ تعلیم سے مراد وہ طریقہ کار ہے جس کی وساطت سے استاد طلبا کو سمجھاتا ہے اور جس کے ذریعے طلبا استاد کی باتیں سمجھتے ہیں۔ ہر ایک زبان ذریعہ تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کسی زبان میں ذریعہ تعلیم بننے کے لیے درج ذیل باتوں کا ہونا ضروری ہے:'' (ص 37)

1 معلم اور متعلم دونوں اس زبان کو سمجھتے ہوں۔
2 زبان میں خاطر خواہ وسعت ہو۔
3 ذخیرہ الفاظ کافی ہو اور مزید الفاظ کو وضع کرنے کی گنجائش ہو۔
4 اعلیٰ تحقیق و تدقیق ممکن ہو۔
5 زبان سہل اور آسان ہو، اس میں قواعد کی پیچیدگی نہ ہو۔
6 اس زبان میں ادب اور دیگر علوم و فنون کی کتابوں کی کثرت ہو۔
7 اس میں دوسری کتابوں کا ترجمہ آسانی سے ہو۔ وغیرہ۔

اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ہندوستان میں سب سے اہم سفارشات گجرال کمیٹی (1972) کی ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہندوستانی بچوں کو 15 سال تک معیاری تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے مطابق کم از کم گریڈ 5 تک کی تعلیم علاقائی یا مادری زبان میں ہو۔ بچے کو ابتدائی تعلیم اگر مادری زبان میں دی جائے تو وہ بہت آسانی سے زبان کے ساتھ ساتھ تمام مضامین بہت جلد سیکھ لیتا ہے اور دوسروں کی باتیں بھی با آسانی سمجھ لیتا ہے۔ اس لیے ماہر تعلیم اور دانشوران تعلیم کی رائے ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہی ہونی چاہیے۔ تاکہ بچہ آسانی سے علم حاصل کر سکے اور ساتھ ہی اسے دیگر زبانوں سے بھی واقف کرانا چاہیے جس سے کہ وہ باہر کی دنیا میں اپنا ایک مقام بنا سکے۔ مادری زبان سے انسان کی فطرت کھلتی بھی ہے اور نکھرتی بھی ہے۔ اور ساتھ ہی بچے کی تخیلی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ترقی یافتہ ممالک میں ابتدائی تعلیم کے لیے مادری زبان کو ذریعہ تعلیم لازمی قرار دیا ہوا ہے۔

- تمام ماہرین تعلیم اور ماہر نفسیات تعلیم کی متفقہ رائے کے مطابق تعلیم اور اس کی جانچ مادری زبان ہی میں ہونی چاہیے۔
- ادبی تخلیق مادری زبان کے ذریعے ہی بہتر طور پر ہوتی ہے اور طالب علم کے اندر چھپی ہوئی صلاحیت اسی کے ذریعے ظاہر ہو سکتی ہے۔
- فرد اور سماج میں ایک لگاؤ ہوتا ہے۔ فرد کو سماج کی ضرورت ہے۔ فرد اپنے ارد گرد ایک ماحول اور زندگی پاتا ہے۔ اسے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے سماج کی زبان کو استعمال کرنا پڑتا ہے، جو اس کی اپنی مادری زبان ہوتی ہے۔
- مادری زبان کے ذریعے طلبا آزادی سے سوچتے، سمجھتے اور پرکھتے ہیں اس سے ان کو زبان اور ذہنی کاوش و صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔
- مادری زبان سے ہمارے کردار، تہذیب اور ثقافت کو تقویت پہنچتی ہے۔
- آدم رپورٹ اور سیڈلر رپورٹ کی سفارشات کے پیش نظر مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔

(1938 کی آدم رپورٹ میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی گئی ہے:

- تعلیم کا بنیادی مقصد بچے کی مجموعی توجہ، صلاحیت اور اس کی خودی کی تکمیل۔ اس کی خودی کو ابھارنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے وہ مادری زبان ہے۔

مندرجہ بالا تمام نکات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو اپنی ان تمام خصوصیتوں کی بنا پر ذریعہ تعلیم بننے کی تمام صلاحیتیں رکھتی ہے۔

اردو ہندوستان کے ایک بڑے طبقے کی زبان ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ خود اہل زبان نے اسے ایک مخصوص کمیونٹی کی زبان بنا دیا ہے۔ لوگوں کو لگتا ہے کہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے اور اردو ذریعہ تعلیم سے تعلیم حاصل کرنے سے ان کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا ہے، اردو خود اپنے چاہنے والوں کے منفی/ دوہرے معیار کا شکار ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، اردو وہ زبان ہے جسے سیکھنے میں اگر انصاف کیا جائے تو اپنے سیکھنے والے کو کبھی مایوس نہیں کرتی۔ فرد کی شخصیت، اس کے لہجے، اس کی زبان، انداز بیان سب کچھ انفرادیت اختیار کر لیتا ہے۔

اردو کا اسکوپ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک مثلاً - برطانیہ، یو ایس اے اور کینیڈا وغیرہ بالخصوص یو اے ای ان تمام ملکوں میں بہتر ہے۔ ان ملکوں میں آسانی سے ملازمت حاصل کی جا سکتی ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں بہتر مواقع فراہم کرتی ہیں:

- اس کے علاوہ آپ علاقائی اردو صحافت اور نیوز ایجنسی میں بھی بہتر طور پر کام کر سکتے ہیں۔
- اردو پبلشنگ ایجنسیز ہندوستان اور بیرون ملک میں ایک اور بہتر متبادل ہو سکتا ہے۔
- ملازمت کے شعبوں میں تدریس، پرنٹ میڈیا سے لے کر فلم اور ٹیلیویژن کی صنعتیں شامل ہیں۔ اس میں عام طور پر ڈیٹا مصنف، ایڈیٹرز، شاعر، ناول نگار، صحافی، مترجم وغیرہ کے طور پر لیا جاتا ہے۔
- ملازمت کرنے والے افراد کو متن کے مطابق مواد تخلیق کرنے کے قابل ہونا چاہیے اور تحریر کی عصری

طرز کو مربوط کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔

- موجودہ وقت میں اردو زبان جاننے والوں کے لیے اور بھی مواقع میں اضافہ ہوا ہے، آن لائن پلیٹ فارم کے متعارف ہونے سے بڑی بھرتیاں آن لائن میگزین، پیپرز، آن لائن مٹیریل لکھنے والی کمپنیوں اور ترجمہ کرنے والی کمپنیوں میں ہوتی ہیں۔
- اردو ذریعہ تعلیم کے طور پر یا اردو کی تعلیم حاصل کر کے ڈگری لینے کے بعد عالمی سطح کی ملٹی نیشنل کمپنیوں تک کہیں بھی ملازمت حاصل کی جاسکتی ہے۔
- اس شعبے میں کیریئر کے مواقع متنوع ہیں، اس میں بہت سے ایسے پیشے ہیں جن کو با آسانی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

اردو صحافی: اس میں ایک رپورٹر کی حیثیت سے کام کرنا ہوتا ہے۔

ٹرانسلیٹر/مترجم: پارلیمنٹ سے لے کر انسانی حقوق کی تنظیموں تک مختلف شعبوں میں مترجم بھرتی کیے جاتے ہیں۔ نجی اور سرکاری شعبوں میں مترجم کے لیے بہتر مواقع ہیں۔

ایڈیٹر: اردو پبلشنگ ہاؤس کا حصہ بن سکتے ہیں اور ایڈیٹر کے طور پر مواد، مضامین اور خبروں میں ترمیم کا کام کر سکتے ہیں۔

پروفیسر/استاد: تدریسی پیشے کو وسیع تر ترجیح دی جاتی ہے، یہ سب سے محفوظ اور اعلیٰ ملازمتوں میں سے ایک ہے۔

کانٹینٹ رائٹر: مواد کے مصنف کے طور پر آپ اپنا مواد شائع کر سکتے ہیں، یا کسی کمپنی میں ملازمت اختیار کی جا سکتی ہے۔ جب تک آپ کے پاس منفرد اور دلچسپ مواد ہے آپ کے پاس پڑھنے کے لیے قابل قدر سامعین ہوں گے۔

مصنف/شاعر: ایک مصنف یا شاعر کے طور پر، آپ خود کام کر سکتے ہیں اور ایسا کام تیار کر سکتے ہیں جس میں آپ کی دلچسپی ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ کا کام تخلیقی اور نایاب ہو۔

مندرجہ بالا مذکور تمام ملازمتوں کو حاصل کرنا ناممکن نہیں ہے، بشرطیکہ آپ کے پاس اعلیٰ سطح کی مہارت ہو۔ جب تک آپ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے سیکھنے کے لیے تیار ہیں تب تک یہ آپ کی پہنچ سے دور نہیں۔

اگر آپ کے اندر صلاحیت ہے تو آپ اردو ذریعہ تعلیم سے کوئی بھی کورس کریں آپ ناکام نہیں ہو سکتے۔

بچے کی ذہنی نشوونما صرف اور صرف مادری زبان ہی میں ممکن ہے اکیسویں صدی میں ہر فرد کی ترجیح انگریزی زبان اپنے بچوں کو سکھانے کی ہے لیکن یہ بات ہمیں نہیں بھولنی چاہیے کہ انگریز بھی اپنے بچوں کو مادری زبان ہی میں تعلیم دلواتے ہیں ہمیں چاہیے کہ اپنے بچوں کو مادری زبان اردو میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کریں ساتھ ہی ساتھ دیگر علوم کو بھی سکھائیں تا کہ دور حاضر کے تقاضوں کی تکمیل ممکن ہو۔

دکن میں سب سے پہلے یونیورسٹی کی سطح پر اردو ذریعہ تعلیم کا آغاز عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں عمل میں آیا تھا اور جہاں مختلف زبانوں اور علوم کے ساتھ ساتھ طب، سائنس اور قانون کی تعلیم اردو میں فراہم کی گئی تھی جس کے نتیجے میں بہت ہی ماہر اور قابل افراد ملک کی سیاست اور دیگر شعبوں میں ابھر کر سامنے آئے تھے۔ دور حاضر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے قیام سے ہی اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا جس کے نتیجے کے طور پر آج سوشیل سائنس، پولیٹکنیک اور انجینئرنگ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تربیت کی تعلیم اردو زبان میں رائج ہے اور وہ دن اب دور نہیں جب طب اور قانون کی تعلیم بھی اردو میں فراہم ہوگی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو ذریعہ تعلیم کو اختیار کرنے پر طلبہ کو راغب کریں اساتذہ کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ طلبہ کو یہ احساس دلائیں کہ اردو میں تعلیم حاصل کرنے سے ہی ہم اپنی مادری زبان میں اچھی طرح سے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اور دیگر زبان وعلوم پر مکمل عبور حاصل کر سکتے ہیں۔ اور سائنس وٹکنالوجی کے شعبوں میں بھی آج کل اردو زبان اس سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ والدین پر بھی یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بچے کی ابتدائی تعلیم کو اپنی مادری زبان میں حاصل کرنے کا موقع فراہم کریں۔ طلبہ کو بھی چاہیے کہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوں اور اردو کو ہی اپنا ذریعہ تعلیم بنائیں اور یہ نہ سوچیں کہ اردو کا مستقبل تاریک ہے بلکہ یہ سوچیں کہ وہ اردو کے ذریعے ہی اپنے مستقبل کو بنائیں گے۔ آج ہمارے سامنے کئی ایک مثالیں ہیں کہ اردو ذریعہ تعلیم کو اختیار کرنے والے IAS,IPS,MBBS,CA اور انجینئرنگ میں اعلی کارنامے انجام دے رہے ہیں ایک مثال ہمارے پاس ڈاکٹر شاہ فیصل IAS ٹاپر کی بھی ہے جن کا تعلق علاقہ کشمیر سے ہے۔

اردو روزگار اور اردو ذریعہ تعلیم کی اہمیت سے متعلق ڈاکٹر مہتاب عالم رقمطراز ہیں:

''ہمارے اردو حلقوں میں ایک بات عام طور رکہی جاتی ہے کہ اردو میں روزگار کے مواقع نہیں ہیں بعض لوگ اسے مذہبی زبان سمجھ کر نا قابل اعتنا نہیں سمجھتے ہیں اور انھیں اپنے بچوں کا مستقبل اردو میں تاریک نظر آتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان کو چھوڑ کر ملک کی تمام زبانوں میں روزگار کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی جس میں فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اخبارات کے علاوہ محکمہ تعلیمات میں اردو اساتذہ اور مختلف سرکاری دفاتر میں اردو مترجمین اور نجی طور پر ترجمے سے متعلق کاموں کی کمی نہیں ہے مقابلہ جاتی امتحانات میں بھی جیسے UPSC,PCSC اور پبلک سرویس کمیشن کے امتحانات میں اردو کو بھی ایک اختیاری مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ یوپی ایس سی میں تو اردو میں امتحان دینے کی بھی سہولت موجود ہے۔''

(اردو کا قومی منظر نامہ، ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی، ستمبر 2010 ص 18)

اردو ذریعہ تعلیم کے ذریعے اردو کے فروغ کے لیے ثقافتی سرگرمیوں اور طلبہ کی اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے سنجیدہ کوشش ہونی چاہیے ساتھ ہی ٹکنالوجی کے استعمال کے ذریعے اردو زبان کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر کو اردو کے فروغ کے لیے استعمال کیا جائے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے طلبا میں پائی جانے والی مایوسی کو کم کیا جائے اور انھیں بھی ترقی کے بھرپور مواقع فراہم کیے جائیں تو اردو کا اور اردو ذریعہ تعلیم سے آگے بڑھنے والے طلبا کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔

ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ اسکول/کالج اور یونیورسٹیوں میں ایسے اساتذہ کی تقرری ہو جو قابل ہونے کے ساتھ ساتھ جن کا لب ولہجہ صاف ستھرا، انداز بیان دلچسپ اور تلفظ اور املے سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں۔ اردو کا پورا پورا حق ادا کرتے ہوں۔ کیونکہ طلبا اساتذہ سے ہی سیکھتے ہیں، تلفظ کی ادائیگی اور تحریر میں املے کی درستگی بہتر ہو تو وہ طلبا بھی با آسانی اردو سیکھ سکتے ہیں جو دوسرے میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

کتابیات

1 خلیق انجم، گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، دہلی 1998۔

2 ڈاکٹر محمد عبدالرشید ارشد، اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم، 1988۔

3 انعام اللہ خاں شروانی، تدریسِ زبان اردو، ساوتری آفیسٹ پرنٹنگ ڈویژن، کلکتہ، 1989۔

4 محی الدین قادر زور کشمیری، تدریسِ اردو (منہاجیات طریقیات اور مشمولات)، یونیک بک میڈیا، سرینگر

5 ڈاکٹر عزیز سہیل، اردو ذریعہ تعلیم اور ہماری زمہ داریاں، جولائی 2020۔

Ahmad Husain
Asst Prof., College of Teacher Educational
Bhopal- 462001 (MP)

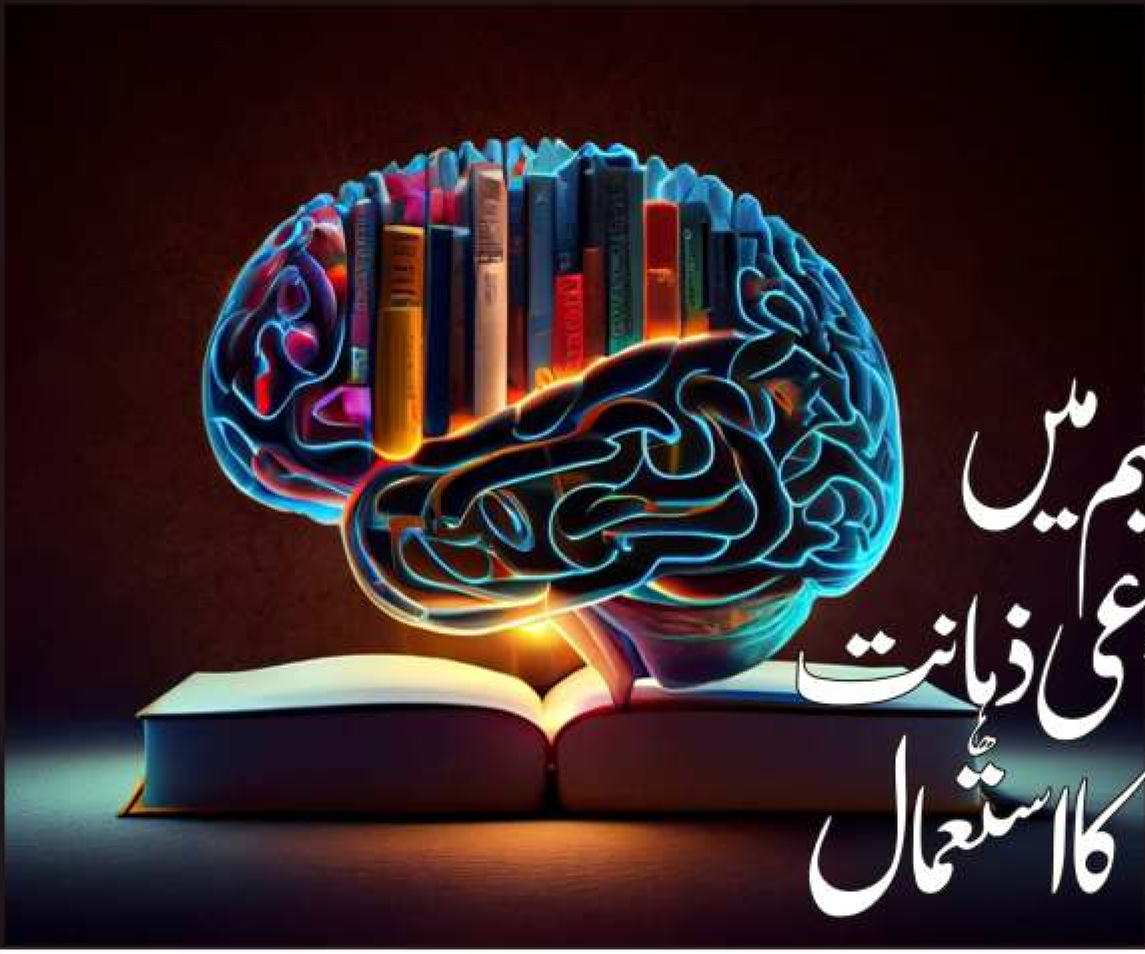

تعلیم میں مصنوعی ذہانت کا استعمال

مصباح انظر

حالیہ برسوں میں تعلیم میں مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) کے استعمال سے تدریس و اکتساب کی رفتار اور آموزش کے طریقوں میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ کمپیوٹر کا خاطر خواہ استعمال کرنے والے لوگ جانتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت نے گذشتہ چند برسوں میں ہمارے سوچنے سمجھنے، جواب دینے اور کام کرنے کے طریقوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ پہلے کسی بھی موضوع پر مواد یکجا کرنے اور اسے ترتیب دینے میں کافی محنت کرنی پڑتی تھی۔ اسی طرح تعلیم سے متعلق انتظامی امور میں وقت کافی ضائع ہوتا تھا۔ اب مصنوعی ذہانت پر مبنی نئی ٹیکنالوجی کی مدد سے اس طرح کا کام پلک جھپکتے ہی ہو جاتا ہے۔ تدریس و اکتساب کے بعض خشک سمجھے جانے والے موضوعات کو اب کمپیوٹر سوفٹ ویئر پروگراموں اور ایپلی کیشنز کی مدد سے دلکش اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ پہلے ایک وقت میں طلبہ کی محدود تعداد کی ہی رہنمائی کی گنجائش ہوتی تھی۔ اب مصنوعی ذہانت پر مبنی تعلیمی ٹیکنالوجی کی مدد سے بیک وقت ہزاروں طلبہ کی رہنمائی کی جا سکتی ہے۔

مصنوعی ذہانت سے متعلق بنیادی تحقیق کے حوالے سے اکثر مشہور انگریز ریاضی داں ایلن ٹیورنگ (Alan Turing) کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے ایک مقالے میں دعویٰ کیا تھا کہ مصنوعی ذہانت پر بہتر تحقیق کمپیوٹر پروگرامنگ سوفٹ ویئر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اردو میں سائنسی مضامین لکھنے والے معروف مصنف باقر نقوی ایلن ٹیورنگ کو بابائے مصنوعی ذہانت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایلن نے ہی عددی کمپیوٹر کے خطوط پر ایک مشین کا خاکہ پیش کیا اور اس کام کے دوران اس نے کمپیوٹر اور قدرتی صلاحیتوں کے درمیان رشتہ بندی پر کام شروع کیا اور ذہین مشین (Intelligent Machinery) کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ یہی وہ پہلی اینٹ تھی جس پر مصنوعی ذہانت کی عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔“

(مصنوعی ذہانت: ایک نیا فکری تناظر، ص 60)

اسی طرح مصنوعی ذہانت کی اصطلاح کا بھرپور استعمال جان میک کارتھی (John McCarthy) نے اس کے چند برسوں بعد کیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک ریاضی داں تھے، مگر کمپیوٹر سائنس میں بھی انھوں نے نمایاں کام کیا۔ ہندوستان میں مصنوعی ذہانت کا استعمال برسوں سے ہو رہا ہے۔ مگر، اب دن بہ دن اس کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آئندہ برسوں میں تدریس و اکتساب میں اس کا استعمال ناگزیر ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ماہر عمرانیات دیپانکر گپتا کا خیال قدرے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”مصنوعی ذہانت نہ تو کبھی انسانی ذہانت کے مدمقابل ٹھہر سکتا ہے اور نہ ہی ہر معاملے میں مصنوعی ذہانت پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔“ ان کا کہنا ہے کہ مصنوعی ذہانت سے انسانی ذہن کی طرح اختراعی کام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ انسان کا ذہن مصنوعی ذہانت کے بغیر اختراعی کام انجام دے سکتا ہے، مگر انسانی ذہن کے بغیر مصنوعی ذہانت کوئی کام نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ کام کو بہت آسان بنا سکتا ہے اور اس کی رسائی بہت زیادہ ہے۔

مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر چلنے والے سوفٹ ویئر پروگراموں کا بہتر اور مؤثر استعمال انسان اپنی ذہانت کو بروئے کار لا کر ہی کر سکتا ہے۔ حصول زبان اور مؤثر آموزش کے ساتھ ہی بہترین دلیلیں پیش کرنے اور مسئلوں کا مناسب حل تلاش کرنے میں مصنوعی ذہانت سے مدد لی جا سکتی ہے، مگر کسی مشین یا ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنے کے لیے انسان کا ہنرمند اور باسلیقہ ہونا ضروری ہے۔ کسی مخصوص کام کو مسلسل انجام دینے کے لیے عام طور پر معمولی یا ناتواں مصنوعی ذہانت سے کام چلایا جاتا ہے، جب کہ انسانوں کی طرح دانشورانہ کام انجام دینے کے لیے قوی مصنوعی ذہانت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ٹول فری فون نمبروں کے ذریعے کمپیوٹر کی مدد سے

صارفین کو جس طرح کے جوابات موصول ہوتے ہیں انھیں اول الذکر کی مثال سمجھ سکتے ہیں۔ جب کہ آخر الذکر زمرے میں چیٹ جی پی ٹی (ChatGPT)، بارڈ/جیمنی (Bard/Gemini)، جیسپر چیٹ (Jasper Chat)، یو چیٹ (YouChat)، بنگ اے آئی (Bing AI) وغیرہ شامل ہیں جو پوچھے جانے والے ہر قسم کے سوالات کے جوابات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں خان اکیڈمی کی مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر چلنے والے ٹول خامنگو (Khamingo AI) کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، جس کا تعارف 'آموزش کے لیے بہترین ٹیوٹر' کے طور پر کرایا جاتا ہے۔ یہ فی الوقت صرف متحدہ امریکہ کے صارفین کے استعمال تک محدود ہے، مگر مستقبل قریب میں اسے دنیا بھر کے صارفین کے لیے متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ یہ بیک وقت اساتذہ، طلبہ اور سرپرستوں کے لیے کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔

مصنوعی ذہانت پر مبنی پروگرامز طالب علموں کی استعدادوں، سیکھنے کے طریقوں اور آموزش کی رفتار کا تجزیہ کرکے اکتسابی مواد کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں طالب علم کی مہارتوں کے ساتھ ہی اس کی دلچسپیوں اور دوسرے رجحانات کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر آموزش سے متعلق طالب علموں کی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اور ان کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اس سے طلبہ کو انفرادی طور پر مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

مصنوعی ذہانت اکتساب کو انفرادی تقاضے کے مطابق ڈھالنے میں کافی معاون ہوتی ہے۔ اسی طرح امتحانات کے دوران طلبہ کے لیے سوالنامے تیار کرنے اور جوابات کی جانچ کرنے میں مصنوعی ذہانت سے خوب استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف وقت کی بچت ہوتی ہے بلکہ طلبہ کی اصلاح اور بہترین رہنمائی آسان ہو جاتی ہے۔ یعنی پہلے جو کام افراد کے ذریعے انتہائی احتیاط کے ساتھ خاصا وقت لگا کر انجام دیا جاتا تھا اب وہ مصنوعی ذہانت پر مبنی کمپیوٹر سوفٹ ویئر کی مدد سے جھٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ مختلف انتظامی امور کو انجام دینے اور طالب علموں کے سوالات کا جواب دینے کے لیے متعدد سوفٹ ویئر پروگرامز اور ایپلی کیشنز مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر ہی کام کرتے ہیں۔ مثلاً ایپل کمپنی کی سیری (Siri)، گوگل اسسٹنٹ، امیزن الیکسا (Amazon Alexa) وغیرہ مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر چلنے والے ورچول اسسٹنٹس (Virtual Assistants) ہیں، جن کے پاس عام طور پر صارفین کے ہر سوال کا جواب موجود ہوتا ہے۔ پہلے کمپیوٹر یا موبائل کے کی بورڈ پر ٹائپ کرکے سوالات پوچھے جاتے تھے، اب تو انداز ایسا جادوئی ہو گیا ہے کہ چند سیکنڈوں میں بول کر پوچھا جانے والا سوال جب ختم ہوتا ہے تو اگلے چند سیکنڈوں میں اس کا جواب حاضر ملتا ہے۔ اسے اکیسویں صدی کی مصنوعی ذہانت کا کمال ہی کہیں گے۔ اتنا ہی نہیں، مصنوعی ذہانت کی مدد سے طلبہ سے متعلق ڈاٹا کا تجزیہ کرکے ان کے رجحانات کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے اور ان کی تعلیمی کارکردگی کی پیشین گوئی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کے اندازوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب علموں کو درپیش چیلنجوں پر قابو پایا جا سکتا ہے، مناسب وقت پر ماہرین کی مدد سے خدشات کو دور کیا جا سکتا ہے اور متوقع منفی نتائج کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی طلبہ کے لیے تعلیمی مواد تیار کرنے میں بھی مصنوعی ذہانت سے متعلق ٹولز اور ایپلی کیشنز سے خوب مدد لی جا رہی ہے۔ اب الگ الگ نوعیت کے طلبہ کے سیکھنے کے مختلف انداز کے مطابق اسباق کو تیار کرنا آسان ہو گیا ہے۔ ایک خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ہندوستان میں اس نوعیت کے بیشتر ٹولز اور ایپس اب تک مفت میں بھی دستیاب ہیں۔

مصنوعی ذہانت کی مدد سے آموزش کو پرکشش اور معنی خیز بنانے میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔ خاص طور پر تعلیمی کھیلوں کے ذریعے اکتساب کو خوب دلچسپ بنایا جا رہا ہے۔ آموزش کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے تعلیمی سرگرمیوں میں کھیل کود کے عناصر کو شامل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مصنوعی ذہانت کے ذریعے چلائے جانے والے روبوٹس (Robots) کا استعمال تعلیمی آلات کے طور پر کیا جا رہا ہے۔ بنگلور کے بعض اسکولوں میں تو روبوٹ کو معلم کے معاون کے طور پر بھی استعمال کیا جانے لگا ہے۔ خاص طور پر کمپیوٹر پروگرامنگ اور انجینئرنگ کے شعبوں میں یہ اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ مزید برآں، آن لائن کلاسز کے دوران مصنوعی ذہانت کی مدد سے طلبہ کے چہروں کی شناخت کرکے ان کی حاضری اور اکتساب میں ان کی مشغولیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر کام کرنے والے بعض ٹولز طالب علم کے چہرے کے تاثرات، اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ اور بعض دیگر اشاروں کا تجزیہ کرکے اس کی جذباتی کیفیت کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس سے کسی طالب علم کے تناؤ کی سطح کا پتہ چل جاتا ہے اور متعلقہ عوامل کو دور کیا جاتا ہے۔ اس نوعیت کے ٹولز طالب علم کے رویوں کا بھی تجزیہ کر سکتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر طلبہ کی بہتر کارکردگی اور مجموعی بہتری کے امکانات پر غور کیا جا سکتا ہے۔

آن لائن تعلیم کو معنی خیز بنانے والی فعال امریکی کمپنی کوگنی (Cognii) کی مصنوعی ذہانت پر مبنی تعلیمی ٹیکنالوجی دنیا بھر میں دھوم مچا رہی ہے۔ یہ کمپنی دنیا بھر کے طالب علموں، تنظیموں اور تعلیمی اداروں کو نت نئی معلومات فراہم کرنے میں پیش پیش ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اکیسویں صدی کی آن لائن تعلیم کو مؤثر بنانے میں اس کمپنی کا اہم رول ہے۔ کوگنی ورچول لرننگ اسسٹنٹ (Cognii VLA) تو طلبہ کے سوال کی تصحیح کا کام بھی کرتا ہے۔ یہ طالب علم کو یہاں تک بتاتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص سوال کے جواب کو خوب سے خوب تر کیسے بنا سکتا ہے۔ اس کمپنی کی مصنوعی ذہانت پر مبنی تعلیمی ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے اب کوئی بھی طالب علم اپنے تحریری جواب کی گھر بیٹھے فوری اصلاح کرا سکتا ہے اور اس سلسلے میں مزید رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ آزادانہ طور پر سیکھنے کے لیے یہ طالب علموں کے لیے بہت معاون ثابت ہو رہا ہے۔ اسی طرح آئی بی ایم واٹسن اسسٹنٹ (IBM Watson Assistant) بھی چیٹ بوٹس بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو طلبہ کے سوالات کے فوری جوابات فراہم کرتے ہیں۔

مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر چلنے والی ٹیکنالوجی کی مدد سے تعلیم و تربیت کے شعبے میں کام کرنے والی چینی کمپنی اسکوریل اے آئی (Squirrel AI) طلبہ کے سیکھنے کے عمل کو بہتر بنانے میں سرگرم ہے۔ چین کے بیشتر اسکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعہ طلبہ کو انفرادی پروگرام فراہم کرکے آموزش کو

مصنوعی ذہانت اکتساب کو انفرادی تقاضے کے مطابق ڈھالنے میں کافی معاون ہوتی ہے۔ اسی طرح امتحانات کے دوران طلبہ کے لیے سوالنامے تیار کرنے اور جوابات کی جانچ کرنے میں مصنوعی ذہانت سے خوب استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سے نہ صرف وقت کی بچت ہوتی ہے بلکہ طلبہ کی اصلاح اور بہترین رہنمائی آسان ہو جاتی ہے۔

بہتر بنانے کے لیے ٹکنالوجی کا استعمال کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اس سے بہتر آموزش کے ساتھ ہی تعلیم و تربیت کو کارگر بنانے میں بھی کامیابی مل رہی ہے۔اس سلسلے میں طلبہ سے متعلق ڈاٹا کا تجزیہ کر کے ہر طالب علم کی انفرادی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر اس کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اکتساب سے متعلق ہر طالب علم کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے، ان کی فہم کا جائزہ لیا جاتا ہے اور پھر حسب ضرورت اضافی توجہ دی جاتی ہے اور سیکھنے کی رفتار کے مطابق اکتسابی مواد فراہم کیا جاتا ہے۔

مصنوعی ذہانت سے متعلق ٹولز کی مدد سے کسی بھی زبان کا سیکھنا آسان ہو گیا ہے۔ بلکہ ان سے معیاری تلفظ سیکھنے اور الگ الگ لہجہ اختیار کرنے میں بھی مدد مل رہی ہے۔ زبانیں سیکھنے سے متعلق مفت میں دستیاب موبائل ایپ ڈولنگو (Duolingo) بھی مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر ہی کام کرتا ہے۔رسم الخط سے معمولی واقفیت رکھنے والا کوئی بھی فرد اس ایپ کی مدد سے متعدد زبانیں خود بخود سیکھ سکتا ہے۔ یہ ایپ مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر سیکھنے والے کی انفرادی استعدادوں کے مطابق مواد اور اسباق فراہم کرتا ہے، مشق کراتا ہے، صارفین کے دیے گئے جوابات کی تصحیح کرتا ہے اور ساتھ ساتھ مسلسل تعین کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔

تعلیم میں مصنوعی ذہانت کے استعمال سے اساتذہ کی کارکردگی میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ اساتذہ پر کام کے بوجھ کو کم کیا جا سکتا ہے۔مصنوعی ذہانت پر مبنی تعلیمی ٹیکنالوجی کے استعمال سے کم وقت میں زیادہ کام کی گنجائش ہے۔ساتھ ہی طالب علم کی انفرادی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے تعلیم کے معیار کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بیک وقت طلبہ کی بڑی تعداد تک رسائی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں، کمپیوٹر میں ایسے بے شمار ٹولز ہیں جن کی مدد سے اساتذہ دلکش اور دیدہ زیب تعلیمی مواد تیار کر سکتے ہیں۔ اس میں مواد مضمون کی بہترین تفہیم کے لیے متن سے متعلق متعدد نوعیت کے ڈیزائین ڈال سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں مصنوعی ذہانت سے چلنے والے ٹولز کا استعمال ہوتا ہے اور بعض میں مختلف نوعیت کی ایپلی کیشنز سے مدد لی جاتی ہے۔

مصنوعی ذہانت کی مدد سے اساتذہ کلاس روم میں پڑھائے جانے والے مخصوص سبق کا منصوبہ جھٹ پٹ تیار کر سکتے ہیں، آموزشی ماحصل دریافت کر سکتے ہیں اور اس کے اطلاق کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی مدد سے اکتسابی مواد تیار کرنا آسان ہو گیا ہے۔اس کی وجہ سے اب تعلیم میں تعین قدر کا کام آسان ہو گیا ہے۔ سوالات تیار کرنے، ان کی درجہ بندی میں اور صحیح جواب معلوم کرنے کے سلسلے میں اساتذہ کا بوجھ کم ہوا ہے۔ جو اساتذہ صاحب علم ہیں اور اپنے مضامین پر جن کی گرفت بہت مضبوط ہے، ان کے لیے مصنوعی ذہانت سے چلنے والے کمپیوٹر پروگرام نعمت ثابت ہو رہے ہیں۔ ان سے نہ صرف اساتذہ کے وقت کی بچت ہوتی ہے بلکہ انسانی غلطیوں کے امکانات بھی کم ہوتے ہیں۔ یوں تو اساتذہ اپنے طالب علموں کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں۔ مگر، امتحانات میں ان کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے جوابی پرچوں کی جانچ منصفانہ انداز میں کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مرحلے میں اساتذہ مصنوعی ذہانت سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس سے ہر طالب علم کی کمزوری کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور تصحیح کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی طالب علم کی تنقیدی سوچ اور تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں بھی مزید باریک بینی سے جانچنے کا سراغ مل جاتا ہے۔ مصنوعی ذہانت سے اساتذہ کے لیے مسلسل پیشہ ورانہ ترقی کی راہیں بھی ہموار ہوئی ہیں۔ اس سے اساتذہ کو جدید ترین تعلیمی رجحانات اور طریقوں سے واقف ہونے میں مدد ملتی ہے۔ اساتذہ کی انفرادی ضروریات کی بنیاد پر متعلقہ وسائل، ورکشاپس اور تربیتی پروگراموں کے بارے میں بھی مصنوعی ذہانت سے خاصی مدد ملتی ہے۔

مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر کام کرنے والے مذکورہ سوفٹ ویئر ٹولز اور ایپلی کیشنز کو صرف ایک نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔اس شعبے میں جس رفتار سے ترقی ہو رہی ہے، اسے پہلے بعید از قیاس سمجھا جاتا تھا۔ اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں آج ہر لمحہ باقاعدہ نئے ٹولزتیا ر کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔اس سلسلے میں خاص طور پر مغربی ممالک میں ہونے والی تحقیق اور متعلقہ صنعت کے جدید رجحانات سے واقفیت ناگزیر ہے۔

اردو میں سرقہ کا پتہ لگانا آسان نہیں ہے۔ مگر انگریزی میں لکھے گئے جوابات پڑھ کر مصنوعی ذہانت سے چلنے والے ٹولز فوراً سرقہ کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ اس طرح مصنوعی ذہانت کی مدد سے طلبہ کی نقل نویسی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی طلبہ کو بہتر اور جامع تحریر لکھنے کے لیے بھی کافی مدد ملتی ہے۔ مصنوعی ذہانت سے چلنے والے ٹولز طلبہ کی تحریری صلاحیتوں کو بہتر بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ ٹولز زبان سے متعلق قواعد، اسلوب اور مواد کا تجزیہ کر کے تعمیری آرا اور بہتری کے لیے تجاویز فراہم کرتے ہیں۔

مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر کام کرنے والے مذکورہ سوفٹ ویئر ٹولز اور ایپلی کیشنز کو صرف ایک نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔اس شعبے میں جس رفتار سے ترقی ہو رہی ہے، اسے پہلے بعید از قیاس سمجھا جاتا تھا۔ اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں آج ہر لمحہ باقاعدہ نئے ٹولز تیار کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔اس سلسلے میں خاص طور پر مغربی ممالک میں ہونے والی تحقیق اور متعلقہ صنعت کے جدید رجحانات سے واقفیت ناگزیر ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ تدریس و اکتساب میں مصنوعی ذہانت پر مبنی ٹولز اور کمپیوٹر سوفٹ ویئر کے استعمال سے انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ مستقبل میں ان کے خوب سے خوب تر ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ مگر انسانی ذہن اور انسانی اقدار کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ سچ ہے کہ مشینوں کی مدد سے ترقی کے لامحدود امکانات ہیں۔ مگر کسی بھی سطح پر ٹیکنالوجی اور انسانی اقدار کے مابین اچھے تال میل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تو سارے معاملات ٹیکنالوجی کے حوالے کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انسانی اقدار سے سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ دونوں کی اہمیت ہے۔ دونوں میں مناسب توازن قائم کرتے ہوئے تدریس و اکتساب کو خوب سے خوب تر بنایا جا سکتا ہے۔اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مصنوعی ذہانت پر مبنی ٹولز میں کام کی رفتار اور اس کے انداز کو بدلنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ کوئی بھی طالب علم یا معلم مصنوعی ذہانت کو ایک معاون کے طور پر اس سے خوب استفادہ کر سکتا ہے، مگر بہتر آموزش کے لیے یا مؤثر تدریس و اکتساب کے لیے اس پر منحصر نہیں رہ سکتا۔

کتابیات

1 باقر نقوی، مصنوعی ذہانت: ایک نیا فکری تناظر، اکادمی بازیافت، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی، 2006

2 Dipankar Gupta, No HI, No AI, Times of India, Hyderabad, 13.02.2024

3 Miao, Fengchun & Holmes, Wayne, Guidance for Generative AI in Education and Research, UNESCO, Paris, France, 2023 (unesdoc.unesco.org)

■

Dr. Misbahul Anzar
CPDUMT, MANUU
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mobile - 9948412484
misbahanzar@manuu.edu.in

نکات الشعرا میں مستعمل تنقیدی اصطلاحات

نکات الشعرا

مصنفہ

میر تقی میر

مرتبہ

مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

سنہ ۱۹۳۵ع

طبع ثانی

محمد باقر حسین

اردو میں تنقیدی شعور کا اظہار اولاً مشاعروں، استادی شاگردی کے سلسلوں، اصلاحِ سخن اور ان میں مستعمل اصطلاحات سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ماقبل ادوار میں تنقیدی شعور موجود تھا لیکن تنقید کی اصطلاح رائج نہیں تھی۔ اس تنقیدی شعور کی دو سطحیں ہیں: ایک شاعر کا اپنا تنقیدی شعور جس کو داخلی سطح (Intrinsic) کہتے ہیں اور دوسری سطح ادبی معاشرے میں مضمر وہ روایات ہیں جو کسی ادب کے محاسن و معائب کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اسے تنقید کی خارجی سطح (Extrinsic) کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے اولین نقوش تذکروں میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شعرا کے کلام پر پیش کیے گئے مشورے اور اشارے ابتدائی تنقید ی اصول و معیار متعین کرتے ہیں۔ علم بیان و معنی پر محیط اصطلاحات کو ناقدین نے اردو کی اولین تنقیدی اصطلاحات کا نام دیا ہے۔ اردو کی متعدد اصناف جو عربی اور فارسی سے مستعار ہیں اور جو اصناف ان کے زیر اثر اردو میں شامل ہوئیں ان کی شعریات میں اظہار کی ترسیل اور ان پر تنقید کرنے کے اصول و نظریات بھی عربی/ فارسی ادبیات سے مستعار لیے گئے ہیں۔ اس عہد میں رائج قدیم اردو تنقید کے طرزِ عمل کا اطلاق بیک وقت سماعی تنقید مثلاً مشاعروں اور شعری مشوروں، منظوم تنقید جیسے سبیل ہدایت از سودا، نثری تنقید مثال کے لیے تذکروں اور دیباچوں وغیرہ میں یکساں پایا جاتا ہے۔ تحریری شکل میں اردو کی نظریاتی تنقید اور شعریات کے قدیم ترین اشاروں کا سلسلہ چودھویں صدی عیسوی میں اس وقت قائم ہوا جب امیر خسرو نے 'روانی' جیسی اصطلاح کا تصور پیش کیا۔ یہ عہد اردو کا ارتقائی عہد تھا۔ اس عہد میں تخلیقی شعور کے پہلو بہ پہلو تنقیدی شعور کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ امیر خسرو سے لے کر دکنی شاعروں اور بعد میں شمالی ہند کے سخنوروں نے اپنے کلام میں شعری تنقیدی اصول موزوں کیے ہیں جس سے ان میں موجود تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے لیے وجہی کہتے ہیں 'جو بے ربط بولے بتیاں پچیس'، ولی فرماتے ہیں 'ادا فہمی سخندانی بلا ہے' غواصی علم بیان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں 'جو کچھ تشبیہاں خوب معقول ہیں/ میرے خیال کے بن کے وہ پھول ہیں'۔ سودا ''تاثیر'' سے متعلق لکھتے ہیں 'نہیں آفاق میں دلکش سخن بے تاثیر/ گر اثر ہو تو کریں دل کو مسخر اشعار'۔ اس طرح کے شعری رموز انتقادِ سخن میں شامل کیے جاتے رہے ہیں جو تنقید کی داخلی سطح ہے۔ چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی اور اس کے بعد تذکروں تک میں اردو کی کلاسیکی/ قدیم تنقیدی شعریات تشکیل پاتی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے تحقیقی کلمات ملاحظہ فرمائیے:

''شعریات کے میدان میں پہلی بڑی بات یہ ہوئی کہ مضمون اور معنی کے درمیان امتیاز دریافت کیا گیا۔''

آگے چل کر فاروقی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''اسی طرح شعری قواعد سے متعلق بہت سے تصورات تھے جنھیں اٹھارویں صدی کے پہلے بحث میں نہ لایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر 'ربط' کا ذکر کر سکتے ہیں جس پر میر نے خاص زور دیا ہے۔ 'رعایت' اور 'مناسبت' کی اصطلاح بھی اسی زمانے سے رائج ہونے لگتی ہیں۔''

(اردو کا ابتدائی زمانہ، ص 56 اور 171)

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق اردو شعرا نے معنی آفرینی کے ذیل میں تین نئے طریقے: ایہام، رعایت اور مناسبت خود دریافت کیے ہیں۔ اسی عہد میں شعرا نے جمالیات کی دیگر اصطلاحات 'کیفیت'، 'جذباتیت' اور 'ایہام' وغیرہ کی تلقین اپنے اشعار میں کی۔ ساتھ ہی ان کی اطلاقی مثالیں بھی پیش کیں۔ شاعری سے متعلق یہ مشورے یک رخے اور جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ اردو میں فارسی طرز پر متقدمین اور معاصرین کے کلام کی جانچ پرکھ اور تعین قدر کے لیے پہلی بار عملی طور پر ان تنقیدی اشاروں اور اصطلاحوں کا استعمال تذکروں میں کیا گیا ہے۔ تذکراتی تنقید کی خوبی یہ ہے کہ اس میں معنی سے زیادہ لفظ پر زور دیا جاتا ہے۔ شعر میں الفاظ کے درمیان 'مناسبت'، 'ربط'، 'رعایت'، وغیرہ سے معنی کو زیادہ قوت ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی قدیم مشرقی تنقید میں 'لفظ' کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعر کے جذبات کی بھی ایک مخصوص آواز ہوتی ہے۔ اس کے خیالات بھی ایک مخصوص آہنگ رکھتے ہیں۔

الفاظ کو اسی مخصوص آواز یا آہنگ کا پابند ہونا پڑتا ہے جب شاعری میں یہ صورت حال ہو تو وہ زندہ نظر آتی ہیں... الفاظ شاعری میں بڑا کام کرتے ہیں۔ وزن، آہنگ، علامتیں اشارے، رمزیت، ایمائیت جن کے ہاتھوں شاعری کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ یہ سب کے سب الفاظ ہی کے سہارے وجود اختیار کرتے ہیں الفاظ نہ ہوں تو شاعری کے ان لوازم وعناصر کا کوئی تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔'' (شاعری اور شاعری کی تنقید:ص33)

میر تقی میر نے فارسی زبان میں اردو شعرا کا پہلا تذکرہ 'نکات الشعرا' 1752 عیسوی میں لکھا۔ میر نے اس تذکرے میں 103 شعرا کا احوال، کلام پر تنقید واصلاحیں اور نمونہ کلام پیش کیا ہے۔ میر لکھتے ہیں:

''پوشیدہ امانت کہ در فن ریختہ کے شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلی شاہجہان آباد دہلی کتابے تاحال تصنیف نشدہ کے احوال شاعران این فن باصفحے روزگار بماند۔'' (تذکرہ نکات الشعرا،ص:23)

میر نے 'نکات الشعرا' میں نقدِ سخن اور اصلاحِ سخن کے لیے جن علوم مثلاً بدیع، بیان و معانی، عروض وقواعد اور شعری جمالیات کی اصطلاحوں کو برتا ہے، ان کی تفصیل اس طرح ہیں: خوش فکر، شور انگیز، ربط، تلاشِ لفظِ تازہ، ایجادِ معنی، سخن فہمی، تاثیر، تہ داری، ایہام، شیریں گفتاری، مناسبت، رنگینی کلام، ہزل گوئی، آورد اور معنی پروری وغیرہ۔ عہدِ میر تک تنقید کی درجہ بندی نہیں ہوئی تھی اس لیے ان اصطلاحات میں خلطِ مباحث بھی پایا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ششم انداز است کے ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہا تشبیہ صفہ گفتگو فصاحت بلاغت ادابندی خیال وغیرہ ای ہما با درد ابن جمی است وفقیر ہم ازہمیں وتیرہ محظوظم۔'' (نکات الشعرا:ص 163)

میر کے اس بیان میں تجنیس، تشبیہ، اور فصاحت وغیرہ کو ایک ہی زمرے میں رکھا گیا ہے، جبکہ تجنیس علمِ بدیع، تشبیہ علم بیان اور فصاحت زبان کا تصور ہے۔ آگے چل کر ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے اپنی کتاب 'تنقیدی مطالعے' میں واضح کیا ہے اور تذکروں میں استعمال کردہ اصطلاحوں کی درجہ بندی پانچ زمروں میں کی ہے: (ا) منطق کی کتابوں سے اخذ کردہ اصطلاحات جیسے تخیل، تصور (ب) معنی بیان سے متعلق اصطلاحات جیسے فصاحت، بلاغت (ج) عروض وقوافی کے رسائل سے ماخوذ اصطلاحات جیسے مربوط گوئی، سرقہ (د) لغت سے اخذ کردہ یا جن کا مفہوم ان کے محل استعمال سے معلوم ہو مثلاً فکر رنگین، مرصع خوانی۔

قدیم اردو تنقید کو اس کے اختصار کے باعث کلیم الدین احمد نے عبارت آرائی سے تعبیر کرتے ہوئے عنقا کہا ہے۔ جبکہ علما مثلاً سید عابد علی عابد، نیر مسعود، فیض احمد فیض، آل احمد سرور، شارب ردولوی، سید عبداللہ، شمس الرحمٰن فاروقی، ابوالکلام قاسمی اور دیگر نقادوں نے سماعی اور تذکراتی تنقید کو قدیم تنقیدی سرمایہ مانتے ہوئے جدید نقطۂ نظر سے ان نامانوس لفظیات کی تشریح وتوضیح کرنے کی حمایت کی ہے جس سے اردو تنقید کی ابتدائی شعریات کی تفہیم وتسہیل ہو سکے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''تذکروں کے دور تک تو ہماری تنقیدی اصطلاحات منفرد تھی تذکروں کا اسلوب اشارات کا اسلوب تھا۔ مگر ایک سنجیدہ اور مثبت فکر ضرور مل جاتی تھی جب مغرب کے اثر سے تنقید کا آغاز ہوا تو مغربی فکر سے گہرا اثر قبول کرنے کی وجہ سے ان قدیم اصطلاحات کو نظریوں پر کما حقہ توجہ نہ رہی۔'' (اردو شعریات:ص7)

واضح ہو کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے 'شعر شور انگیز'، 'اردو غزل کے اہم موڑ' اور 'اردو کا ابتدائی زمانہ' میں کلامِ میر کی روشنی میں قدیم تنقیدی شعریات کی تاریخ، اصطلاحات اور رموزِ علامت کی توضیح کی ہے۔ اس مقالے کا مقصد میر کی تنقیدی صلاحیتوں کو مترشح کرنا اور نکات الشعرا میں مستعمل تنقیدی اشارات اور تصورات کی توضیح کرنا ہے۔ ''نکات الشعرا'' میں مستعمل ان اصطلاحات کی توضیح حسب ذیل ہے:

آورد:

شاکر ناجی کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے میر لکھتے ہیں:

'آورد خود نمی خندید' (نکات الشعرا:ص 41)

ادابندی: شاعر اپنے کلام میں محبوب کی اداؤں کو موزوں کرے۔ عزلت اور کرم اللہ خاں درد کی شاعری پر نکتہ چینی کرتے وقت میر نے 'دردمندی' کی اصطلاح کو برتا ہے۔ مثال بالترتیب ملاحظہ فرمائیے:

''از اسالیب کلام شان واضح می گردد کہ بہرۂ بسیارے از دردمندی دارند''

''بسیار خوش فکر، و عاشق سخن، خالی از دردمندی نیست'' (نکات الشعرا:ص93 اور 75)

ایجادِ مضامین: ہم اسے مضمون آفرینی بھی کہہ سکتے ہیں اس کے دو پہلو ہیں ایک کوئی نیا مضمون ایجاد کرنا یا کسی پرانے مضمون میں کسی نئے پہلو کا اضافہ کرنا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے الفاظ میں:

''مضمون کی تلاش' جو شعر میں بندھ سکیں اور پرانے مضامین میں کوئی نئے رنگ بھی باندھنے کی سعی شاعر کے لیے قابل قدر مسئلہ ٹھہری۔ اسے مضمون آفرینی کہا گیا ہے۔'' (اردو کا ابتدائی زمانہ:ص 157)

ایہام: ہندوستانی شعری اصطلاح: اس سے مراد جب شاعر اپنے کلام میں ایسا لفظ استعمال کرے جس کے دو معنی ہوں ایک نزدیک کا دوسرا دور کا اور شاعر نے دور کے معنی مراد لیا ہو۔ جہاں کہیں بھی ایہام کا استعمال سلیقے سے کیا گیا وہاں اس نے لطف اور معنی دونوں میں اضافہ کیا۔ احسان اللہ احسن کے کلام کے متعلق میر لکھتے ہیں۔

''طبعیش بسیار مائل بہ ایہام بود
ازیں جہت شعر او بے رتبہ ماند''

(نکات الشعرا:ص 44)

بندش:

میر سجاد کے لیے رقمطراز ہیں:

''ہر مصرعہ بندش را طرف لطف ناچارے'' (نکات الشعرا:ص 66)

تاثیر: عام طور پر تاثیر شاعری کا بنیادی وصف ہے لیکن اس اصطلاح کو وہاں زیادہ استعمال کیا جاتا ہے جہاں کیفیت کا عملی دخل زیادہ ہو چنانچہ کیفیت والا شعر قاری یا سامع کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اپنے تذکرے میں محمد حسین کلیم کی شاعرانہ خصوصیت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''شعر پیچدار پر تاثیر او تیر کا کل رہا۔''

(نکات الشعرا:ص 55)

تلاش لفظ تازہ: شاعری میں استعمال کیا جانے والا ہر کلیدی لفظ مجاز کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ عموماً استعارہ ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر نیا لفظ ایک نیا استعارہ ہے، اور ہر نیا استعارہ ایک نئے معنی کی تشکیل کرتا ہے۔ چنانچہ تلاش لفظِ تازہ اصل میں نئے معنی اور نئے مضمون کی بنیاد ہے۔ اٹھارویں صدی میں ایہام گوئی کی تحریک تلاش لفظِ تازہ اختیار کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔ میر، شیخ شرف الدین مضمون کے لیے لکھتے ہیں'' ہر چند کم گو بود، لیکن بسیار خوش فکر اور تلاش لفظ تازہ زیادہ۔'' اور میر سجاد کے لیے رقمطراز ہیں ''اگرچہ در بند لفظ تازہ است۔''

(نکات الشعرا:ص 34 اور 66)

تہ دار: پر از معنی، ایک ایسی اصطلاح جو میر کے یہاں تو ملتی ہے لیکن دوسرے تذکروں میں اس کا فقدان ہے جبکہ تنقید کے باقاعدہ آغاز کے بعد 'تہ داری' کا لفظ ہمیں کئی جگہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ 'تہ دار' سے مراد کسی معمولی سے تجربے کو اہم اور معنی خیز بنانے سے ہے۔ محمد حسین کلیم کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے میر لکھتے ہیں: ''درفہم شعر تہ دار او فکر عاجز سخناں پشت دست برزمیں می گزارد۔''

(نکات الشعرا:ص 55)

تہ دار کی وضاحت ڈاکٹر غلام آسی رشیدی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''وہ کلام جس میں معنی کی کثرت ہوتہدار یا پیچدار کہلاتا ہے۔کلام میں تہ داری پیدا کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں ان میں رعایت ایہام انشائیہ اسلوب استعارہ اورصرفی نحوی تراکیب کی بنیادی اہمیت ہے۔''

(اردو غزل کا تاریخی ارتقا،ص 338)

میر نے یہ اصطلاح میر سجاد اور خاکسار کے لیے بھی استعمال کی ہے۔

خوش فکر: نئے مضامین کو اپنے خیال کی گرفت میں لے کر انھیں مناسب طریقے سے پیش کرنے والا شاعر خوش فکر کہلاتا ہے۔خوش فکری سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے کلام میں دلی جذبات اور احساسات کو فطری طور پر موزوں کرے یعنی جو کچھ کہے اس میں وارداتِ قلبی اور کیفیت موجود ہو۔میر 'نکات الشعرا' میں شرف الدین مضمون کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر'' (نکات الشعرا:ص 34)

ڈاکٹر مسیح الزماں خوش فکری کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نئے مضامین کی تلاش اور انھیں مناسب طریقے سے پیش کر دینا شاعر کی خوش فکری کی علامت ہے۔اسی سے کلام میں انفرادیت پیدا ہوتی ہے اور زبان کی ترقی میں بھی مدد ملتی ہے۔'' (اردو تنقید کی تاریخ:ص 85)

میر نے سودا اور محمد حسین کلیم کے لیے بھی یہی اصطلاح استعمال میں لی ہے۔

خیال: کلام موزوں کو شاعری کی سطح پر لانے والے اہم عناصر میں سے ہے۔تخلیق کار کا خیال عام انسانی خیال سے مطالعہ کائنات، ادراک، اعلی اقدار اور جذبے کے موجب بالاتر ہوتے ہیں۔مسعود رضوی ادیب کے مطابق:

''خیال کی بلندی سے مراد یہ نہیں کہ کوئی ایسی عجیب اور انوکھی بات کہی جائے جو عام آدی کی سمجھ سے باہر ہو بلکہ خیال رکیک اور عامیانہ نہ ہو، شریفانہ ہو اور جو جذبہ اس خیال سے وابستہ ہے اس میں حیوانیت نہ ہو انسانیت ہو اگر کہیں پست فطرت بندۂ نفس کے خیالات دکھانا ہوں تو اس میں رکاکت اور عامیانہ پن اور حیوانیت سب کچھ ہونا چاہیے ورنہ شعر اصلیت سے دور ہو جائے گا۔'' (ہماری شاعری معیار و مسائل:مسعود حسن رضوی ادیب،ص...)

دردمندی: کلاسیکی شعریات میں کلام کے سوز و گداز اور دردمندی سے پر ہونے کی سفارش کی گئی ہے۔یہ غالباً تصوف کا اثر بھی ہے اور تصور حیات و کائنات کا زائیدہ بھی۔خود میر کے کلام میں رنج و غم اور درد و الم کا قابل لحاظ حصہ موجود ہے۔

ربط: شعر کی قواعد سے متعلق تصورات میں سے ایک۔مربوط کلام سے مراد ایسے کلام سے ہے جس میں تمام اجزا ایک وحدت کی تشکیل کرتے ہوں۔غزل کے شعر میں اگر دونوں مصرعے مربوط نہ ہوں تو وہ غزل گوئی کا بڑا عیب ہے۔اسی لیے بے ربط مصرعوں کو دولخت بھی کہا جاتا ہے یعنی شعر کے تمام اجزا ایک معنوی اکائی میں ڈھلے ہوئے ہونے چاہیے۔ملا وجہی لکھتے ہیں جسے بات کے ربط کا فام نیں/اسے شعر کہنے سے کچھ کام نیں''۔فضلی کے ایک شعر کے متعلق میر لکھتے ہیں:

''رکھا ہوں نیم جاناں تصدق تجھ پہ کرنے کو/ کیا سب تن کو میں درپن اجھو درسن نپائے ہوں'' ربط بین المصرعین ایں شعر سبحان اللہ عجب ربط چسپانی است کو مطلق معلوم نمی شود کہ چہ گوید و چہ ارادہ است''

(نکات الشعرا،ص 101)

رنگینی کلام: زبان رنگین/ نثری اسالیب کی ایک قسم۔نثر میں تخلیقی زبان کا استعمال رنگین نثر کہلاتا ہے،اور شاعری میں چونکہ بلاغت نثر سے زیادہ ہوتی ہے اور مجازی معنی کی تعمیر کی جاتی ہے،اس لیے وہاں زبان کی رنگینی بڑھ جاتی ہے۔میر نے اس اصطلاح کو عبدالحی تاباں کے کلام کی خصوصیت بیان (زبان رنگینش) میں کیا ہے۔بقول پروفیسر محمد حسن:

''رنگینی کلام کو تنقیدی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اس رنگینی سے محض الفاظ کی رنگینی مراد نہیں لی گئی ہے بلکہ شعر سے پیدا ہونے والی کیفیت کی رنگینی مراد ہے۔شعر میں الفاظ اول تو راست لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتے پھر ان کے استعمال کی مختلف مجازی سطحیں ہوتی ہیں۔یہی لفظ کہیں تشبیہ ہے تو کہیں استعارہ، کہیں مجاز مرسل ہے تو کہیں کنایہ، کہیں علامت ہے، تو کہیں ایہام اور ان حیثیتوں سے ان کے درمیان مختلف قسم کے رشتے ابھرتے ہیں اور نئے تلازمے پیدا ہوتے ہیں۔پھر ہر لفظ کی اپنی موسیقی اور ہر مصرع یا شعر کی اپنی مجموعی موسیقی بھی ہوتی ہے اور ہر لفظ کی اپنی محاکاتی یا تصویری فضا اور ہر مصرع یا شعر کی اپنی بصری تلازموں سے پیدا ہونے والی فضا ہوتی ہے اور رنگینی اسی موسیقی اور اسی تمثالی فضا سے پیدا ہونے والی کیفیت ہے جس کی تشریح ممکن نہیں۔'' (مشرقی تنقید:ص 63)

سخن فہمی: شعر فہمی/ سخن فہمی اور بیان شاعر کے لیے اپنے طرزِ اظہار پر قادر ہونے کے ساتھ پیش رو اور ہم عصر شعری اظہارات کا سمجھنا بھی اہم ہے اس سے خوش بیانی اور تازگی کے سرے بھی ملتے ہیں چنانچہ 'یادگار غالب' میں شمس الرحمٰن فاروقی نے باذوق الفاظ کے ذریعے سخن فہمی کو نشان زد کیا ہے۔خان آرزو اور انعام اللہ خاں یقین کے کلام پر رائے دیتے ہوئے میر رقم طراز ہیں:

''شہرۂ آفاق در سخن فہمی طاق''

''ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد'' (نکات الشعرا،ص 25 اور 83)

محتشم علی خاں، کرم اللہ درد اور آرزو کے احوال میں اس اصطلاح کی معاونت سے ان کے شعری ذوق کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی شعر فہمی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شعر فہمی ایک تنقیدی عمل ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یا قوت یہ ہے کہ یہ ذوق کے پیدا کردہ ردعمل کے بعد بروئے کار آتا ہے مثلاً جب میرا ذوق مجھے بتاتا ہے کہ در دشت جنون من....... بہتر شعر ہے تو میں شعر فہمی کی کوشش کرتا ہوں اور نتیجے کے طور پر مجھے محسوس یا معلوم ہوتا ہے کہ موضوع کی تقریباً وحدت کے باوجود خود ہی کو کر بلند اتنا....... معنی کے اعتبار سے کمتر ہے۔اس لیے میں اسے کمتر شعر سمجھنے میں حق بجانب تھا یہ بات ملحوظِ خاطر

خیال کی بلندی سے مراد یہ نہیں کہ کوئی ایسی عجیب اور انوکھی بات کہی جائے جو عام آدی کی سمجھ سے باہر ہو بلکہ خیال رکیک اور عامیانہ نہ ہو، شریفانہ ہو اور جو جذبہ اس خیال سے وابستہ ہے اس میں حیوانیت نہ ہو انسانیت ہو اگر کہیں پست فطرت بندۂ نفس کے خیالات دکھانا ہوں تو اس میں رکاکت اور عامیانہ پن اور حیوانیت سب کچھ ہونا چاہیے ورنہ شعر اصلیت سے دور ہو جائے گا۔

رکھیے کہ تنقیدی عمل سے میری مراد نقاد کا عمل نہیں ہے۔"
(شعر، غیر شعر اور نثر:ص 154)

شاعر زبردست: میر اسے قادر الکلام شاعر کی تعریف میں استعمال کرتے ہیں۔ اسے شاعر پرزور بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ شاعر جو مستند اور معتبر ہو شعری نکات کی واقفیت رکھتا ہو، اسے اہل سخن میں اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

شور انگیزی: شور کے معنی غل اور شورش کے ہیں۔ بظاہر ایسے کلام کو شور انگیز کہا جاتا ہے جس میں جذبات کی شدت معمول سے زیادہ ہو لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ حیات وکائنات کے بارے میں شدت کے ساتھ اس طرح اظہار کیا جائے کہ خود شاعر کی شخصیت اس میں نمایاں نہ ہو، گویا شور انگیزی شاعر کی نہیں اسلوب کی مانی جائے گی۔ کریم اللہ درد کے کلام پر رائے دیتے ہوئے میر لکھتے ہیں:

"طبع شور انگیزے وارد....." (نکات الشعرا ص 75)

'شور انگیز' کے ضمن میں شمس الرحمان فاروقی کے خیالات ملاحظہ فرمایئے:

"وہ کلام شور انگیز تھا جس میں حیات وکائنات کے معاملے شدت جوش کے ساتھ بیان میں آئیں لیکن اسلوب ایسا ہو کہ شاعر خود ذاتی حیثیت سے کلام میں موجود نہ دکھائی دے۔" (اردو کا ابتدائی زمانہ:ص 170)

شیریں گفتاری: شیریں کلامی/ خوش لہجگی - اس سے مراد معنی، مفہوم، لہجے اور صوتیات تک میں ایک ایسی ہم آہنگی ہے جو پڑھنے اور سننے والے کو شیریں اور پرعصر معلوم ہوتی ہے۔

صفائے گفتگو: میر نے اس اصطلاح کو صفائی بیان کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں:

"مضمون آفرینی کا ایک ذیلی تصور بیان کی صفائی بھی تھا بیان کی صفائی سے مراد یہ تھی کہ مضمون ایسا نہ ہو یا اسے اس طرح نہ بیان کیا جائے کہ اس کو سمجھنے میں محنت اور مشکل صرف ہو اور جب اسے سمجھ لیں تو محسوس ہو کہ ساری محنت بے کار گئی۔" (تعبیر کی شرح:ص 10)

طرز: اسے اسلوب بھی کہا جاتا ہے۔ طرز کے معنی طریقے کے ہیں کسی بات کو ایک خاص طریقے سے ادا کرنے کا نام طرز ادا ہے۔ یہ عام طور پر مروجہ طرز سے الگ تخلیقی سطح کا اظہار ہوتا ہے جس میں شاعر کی انفرادیت مضمر ہوتی ہے۔ میر محمد حسین کلیم کے لیے لکھتے ہیں:

"طرزش بطرز کسے ماننا نیست۔" (ایضا ص 55)

غالب، میر مہدی کو ایک خط میں لکھا: "یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے اس کو باہر کیا اللہ برکت دے۔" (بحوالہ یادگار غالب:ص 200)

مناسبت: مناسبت سے مراد یہ ہے کہ شعر میں جتنے الفاظ استعمال کیے جائیں وہ سب شعر میں مضمر معنی سے نسبت رکھتے ہوں اور ایک لفظ دوسرے لفظ یا الفاظ کی ناگزیریت کی جانب اشارہ کرے۔ مثال کے لیے یک رنگ کے اس شعر پر میر کی رائے پر غور فرمایئے۔

اصل سچ کہے جو کوئی مارا جائے
راستی ہے گی دار کی صورت

مصرع اولیٰ پر میر کی رائے ملاحظہ فرمایئے "حق کہے جو کوئی سو مارا جائے"

اس شعر کے مصرع اولیٰ میں میر صاحب نے لفظ 'اصل' کی جگہ 'حق' کر دیا جس کی مناسبت لفظ 'دار' سے ملتی۔ اس باعث شعر کے معنی میں اضافہ ہوتا ہے اور شعر میں لفظ 'حق' اور 'دار' کی مناسبت سے صنعت تلمیح یعنی منصور حلاج کے واقعہ 'انالحق' کی جانب بھی اشارہ مترشح ہوتا ہے۔

معنی پروری: کسی شاعر کو معنی پرور کہنے سے مراد معنی آفرینی بھی ہو سکتی ہے اور کثیر المعنویت کی خوبی بھی۔ دونوں صورتوں میں یہ فنکار کی بڑی خوبیوں میں شامل ہیں۔ آگے چل کر معنی پروری کی جگہ معنی آفرینی کی اصطلاح رائج ہوگئی۔ سید عابد علی عابد کے الفاظ میں:

"معنی پروری سے مراد یہ ہے کہ شاعر پامال راستوں سے ہٹ کر حقیقت کو نئے پہلوؤں سے دیکھنے کی کوشش کرے، مطالب کی بلندی کی طرف اشارہ بھی اس ترکیب میں موجود ہے۔" (انتقاد وادبیات:ص 308)

ہزل: غیر سنجیدہ کلام۔ شاعری میں مزاح کے ساتھ فحاشی اور عریانی شامل ہو جائے تب اسے ہزل کہتے ہیں۔ کمترین کی شاعری پر نکتہ دانی کرتے ہوئے میر لکھتے ہیں:

"مزاجش میلان ہزل بسیار دارد- موافق استعداد خودمی گوید .بندہ شعر معقول او نہ شنیدہ ام" (ایضا،ص 140)

اسی طرح میر نے 'سلیقۂ شاعری' کے حوالے سے میر "تذکرہ نکات الشعرا" کے باب 'خاتمہ' میں ریختہ کی اقسام کی وضاحت کے بیان میں اسے تیسری قسم میں شمار کرتے ہیں۔ شارب ردولوی اپنی کتاب جدید تنقید اصول ونظریات میں اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ نامانوس اور معیوب الفاظ کی پرکھ 'سلیقۂ شعری' پر رکھی ہے۔ سلیقۂ شعری کو تنقیدی شعور بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں پر میر کی مراد اس لفظ سے صحیح اور غلط ،بہتر و بدتر، مناسب اور نامناسب کی پرکھ نہیں بلکہ فصاحت اور بلاغت اور تمام محاسن شعری سے ہے۔

مطالعۂ 'نکات الشعرا' سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میر کی تنقید میں لفاظی نہیں تھی اور نہ ہی وہ تاثراتی تھی بلکہ اس عہد میں رائج ادب کی شعریات مثلاً قواعد کی پابندی، شعری اظہار، عروض، فصاحت اور بلاغت سے آگاہی، محاوروں اور الفاظ کا برمحل استعمال وغیرہ پر مبنی تھی۔ ادب کی شعریات میں مستعمل ان اصطلاحات کی روشنی میں کسی تخلیق کا معیار متعین کر کے اس پر تنقید کی جاتی تھی۔ عہد میر سے لے کر عہد محمد حسین آزاد تک لکھے گئے تذکروں میں موجود مشرقی تنقیدی اصطلاحات کو تذکراتی تنقید کے زمرے میں شامل تو کیا گیا ہے لیکن باقاعدگی سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ اس لیے تذکروں میں موجود مشرقی معیار نقد کی اصطلاحات کی تشریح وتعبیر لازمی ہے۔

ماخذ

1. اُردو کا ابتدائی زمانہ از شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی،2011
2. اُردو تنقید کی تاریخ از ڈاکٹر مسیح الزماں، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ،2003
3. اردو شعریات مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، اقبال انسٹیٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر،1987
4. اردو غزل کے اہم موڑ از شمس الرحمٰن فاروقی، غالب اکیڈمی، نئی دہلی،2006
5. اصول انتقاد وادبیات از ڈاکٹر سید عابد علی عابد
6. جدید اردو تنقید اصول ونظریات از پروفیسر شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
7. رموز بلاغت از ڈاکٹر ارشد عبدالحمید، راجستھان اردو اکادمی، جے پور، جون 2022
8. شاعری اور شاعری کی تنقید از ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،1975
9. شعر، غیر شعر اور نثر از شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،2021
10. مشرقی تنقید از محمد حسن
11. مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت از پروفیسر ابو الکلام قاسمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،2000
12. نکات الشعرا از میر تقی میر مرتب ڈاکٹر محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ،1984

■

Mohammed Baqir Husain
Asst Prof. Govt. College
Tonk- 304001 (Rajasthan)
Cell.: 9214000097
baquir97@gmail.com

محمد نہال افروز

’نکات الشعرا‘ میں دکنی شعرا

’نکات الشعرا‘ اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے، جو فارسی زبان میں لکھا گیا۔ اس تذکرے کو میر تقی میر نے محض 28 سال کی عمر میں لکھا تھا۔ نکات الشعرا کو مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی نے 1922 میں، مولوی عبدالحق نے 1935 میں اور ڈاکٹر محمود الٰہی نے 1984 میں مرتب کر کے شائع کیا۔ اس تذکرے کا حمیدہ خاتون نے 1994 میں فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہی ترجمہ میرے اس مضمون کا ماخذ ہے۔

نکات الشعرا کے بارے میں ویکی پیڈیا میں لکھا ہے:

’’نکات الشعرا ایک کتاب ہے، جس میں شمالی ہند کے شعرا کا تذکرہ ہے۔ میر تقی میر کا لکھا یہ تذکرہ سنہ 1751 کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس میں سب سے پہلے امیر خسرو کا تذکرہ ملتا ہے اس کے بعد مرزا عبدالقادر بیدل، خان آرزو، فطرت، مظہر جانِ جاں وغیرہ کا ذکر کیا ہے، مگر اس میں صرف شمالی ہند کے شعرا کا تذکرہ پایا جاتا ہے، جب کہ جنوبی ہند میں کئی نامور شعرا موجود تھے۔‘‘[1]

ویکی پیڈیا میں جو باتیں لکھی ہیں، ان میں سے بیشتر باتیں بالکل درست ہیں کہ نکات الشعرا میر تقی میر کا تذکرہ ہے، یہ تذکرہ 1751 کو پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس میں سب سے پہلے امیر خسرو کا تذکرہ ہے، اس کے بعد دیگر شعرا کا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت جنوبی ہند میں کئی نامور شعرا موجود تھے، لیکن یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ نکات الشعرا میں صرف شمالی ہند کے شعرا کا تذکر پایا جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ویکی پیڈیا کا ماخذ کیا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ نکات الشعرا میں شمالی ہند اور جنوبی ہند دونوں جگہوں کے شاعروں کا تذکرہ ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ جنوبی ہند کے کئی نامور اور اعلیٰ پائے کے شاعروں کا ذکر نہیں ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ میر کے اس تذکرے میں شمالی ہند کے بیشتر شعرا کے احوال و آثار کا بیان تفصیل سے ہے جب کہ جنوبی ہند کے بیشتر شعرا کا ذکر نہایت ہی مختصر ہے۔ اس بات کا اعتراف خود میر نے نکات الشعرا کے مقدمے میں کیا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

’’پوشیدہ نہ رہے کہ فنِ ریختہ میں جو قلعۂ معلیٰ شاہ جہان آباد، دہلی کی زبان میں فارسی شاعری کے طرز کی شاعری ہے۔ آج تک ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی جس سے اِس فن کے شاعروں کا حال صفحۂ روزگار پر (باقی) رہے۔ اسی لیے یہ تذکرہ جس کا نام ’نکات الشعرا‘ ہے، لکھا جا رہا ہے۔

حالانکہ ریختہ دکن سے (تعلق رکھتی) ہے مگر چوں کہ اس مقام سے ایک بھی مربوط شاعر نہیں اٹھا اس لیے ان کے ناموں سے شروع نہیں کیا گیا اور اس ناقص (یعنی مصنف) کی طبیعت اس طرف یوں بھی مصروف نہیں ہے کہ اس میں سے اکثر کا احوال کرتا پھر بھی ان میں سے بعض کا احوال لکھا جائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔‘‘[2]

میر کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دکن سے ایک بھی مربوط شاعر نہیں اٹھا، جس کا مطلب ہے کہ دکن میں ایک بھی بڑا یا نامور شاعر پیدا نہیں ہوا۔ چونکہ میر کا تعلق دکن سے بالکل بھی نہیں تھا، جس کی وجہ ان کو دکن کے شعرا کے

بارے میں علم بھی نہیں تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے ایسی باتیں کہی ہیں۔ تذکرے یا تحقیق میں ایسی باتیں کہنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ دراصل میر نے عبدالولی عزلت کی بیاض اور ان کے بیان پر ہی دکنی شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''شعرائے دکن والے حصے کی بات کسی قدر سمجھ میں آتی ہے۔ یہ حصہ عبدالولی عزلت کا رہین منت معلوم ہوتا ہے۔ عزلت 1146ھ کے وسط میں دہلی آئے۔ ان کی ملاقات میر سے بھی ہوئی۔ میر نے ان کی بیاض سے بھرپور استفادہ کیا۔ جوں ہی میر کو عزلت کی بیاض ملی ہوگی، انھوں نے اس کی مدد سے اپنے تذکرے میں شعرائے دکن کا حصہ شامل کرلیا اور پھر شمالی ہند کے باقی شعرا کا ذکر مکمل کیا۔[3]

اس کے علاوہ ایک بات اور غور کرنے کی ہے کہ دکن میں تخلیقی کام تو بہت پہلے سے ہو رہا تھا، لیکن تحقیقی اور تنقیدی کام بہت بعد میں شروع ہوا اور جتنا مواد دکن میں موجود ہے اس کے مطابق بہت کم بھی ہوا۔ آج بھی دکنی ادب پر کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی کا قادرالکلام اور ملک الشعرا شاعر ملا وجہی، دکنی غالب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جب کہ ملا وجہی مرزا غالب سے تقریباً دو سو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ قیوم صادق نے 'دکنی غالب ملا وجہی' کے عنوان سے ایک کتاب بھی مرتب کردی ہے۔ اسی طرح نظمیہ شاعری میں محمد قلی قطب شاہ جیسے عوامی شاعر کی اہمیت نظیر اکبرآبادی سے کم ہے۔ جب کہ نظیر اکبرآبادی سے بہت پہلے ان تمام موضوعات پر محمد قلی قطب شاہ نظمیں لکھ چکے تھے، جن پر بعد میں نظیر نے نظمیں لکھ کر شہرت حاصل کی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دکنی کے بیشتر شعرا کے حالات زندگی آج بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ اگر صحیح وقت پر دکن کے شعرا پر تحقیقی و تنقیدی کام ہوئے ہوتے تو ممکن ہے کہ آج ان تمام شعرا کے احوال و آثار ہمارے سامنے ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کے بڑے اور نامور شعرا کا تذکرہ نکات الشعرا میں نہیں ملتا۔ ہاں دکن کی کئی مثنویوں میں دکنی شعرا کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے۔

> ”نکات الشعرا میر تقی میر کا تذکرہ ہے، یہ تذکرہ 1751 کو پایہ تکمیل کو پہنچا، اس میں سب سے پہلے امیر خسرو کا تذکرہ ہے، اس کے بعد دیگر شعرا کا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت جنوبی ہند میں کئی نامور شعرا موجود تھے، لیکن یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ نکات الشعرا میں صرف شمالی ہند کے شعرا کا تذکر پایا جاتا ہے۔“

واضح رہے کہ نکات الشعرا میں 100 سے زیادہ شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں 25 یا اس سے بھی زائد شعرا کا تعلق دکن اور اس کے گردونواح سے ہے۔ ذیل میں ان دکنی شعرا کے متعلق چند باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے، جن کا تذکرہ نکات الشعرا میں درج ہے۔

احمد گجراتی: ان کا پورا نام شیخ احمد شریف گجراتی تھا۔ احمد گجراتی کا تعلق دبستان گولکنڈہ سے تھا اور ان کو دبستان گولکنڈہ کا پہلا مثنوی نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ احمد گجراتی ملا وجہی اور غواصی کا ہم عصر تھا۔ میر نے اپنے تذکرے میں اس کا نام درج کیا ہے اور اس کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ اس کے احوال و آثار کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ نکات شعرا میں درج احمد گجراتی کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ہوئے دیدار کے طالب خودی سے خود گزر نکلے
نہ پائی راہ دانش میں خرد شاں بے خبر نکلے

اشرف: ان کا اصل نام محمد اشرف تھا اور یہ اشرف تخلص کیا کرتے تھے۔ اشرف کا تعلق دکن کی نظام شاہی سلطنت سے تھا، جس کا دارالخلافہ احمد نگر تھا۔ احمد گجراتی کی طرح میر نے اشرف کا صرف نام اور ایک شعر درج کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

پیا بن میرے تئیں بیراگ بھایا ہے جو ہونی ہے سو ہو جاوے
بھبھوت اب جوگیوں کا رنگ لایا ہے جو ہونی ہے سو ہو جاوے

بیچارہ: یہ گولکنڈہ کا باشندہ تھا اور عالم گیر کے زمانے میں دہلی بھی گیا تھا۔ میر نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے محض ایک شعر درج کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

سر سے جدا ہونا نہ تھا، چاہا خدا کا یوں اتھا
جز صبر اب چارہ نہیں بے چارہ ہو رہنا پڑا

آزاد: ان کا اصل نام گوبرسن بلی تھا اور یہ آزاد تخلص کیا کرتے تھے۔ ان کے باپ اور دادا دونوں شاعر تھے۔ میر نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آزاد ولی کا ہم عصر تھا اور بچوں کی طرح بات کرتا تھا۔ میر نے ان کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔ شعر یوں ہے کہ۔

آئیں جہاں کی ساری آزاد صفتیں پر
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

تجرد: ان کا اصل نام میر عبداللہ تھا اور تجرد تخلص کرتے تھے۔ ان کے متعلق نکات الشعرا میں صرف اتنا تذکرہ ملتا ہے کہ یہ سید عبدالولی عزلت کے شاگرد تھے، جس سے گمان گزرتا ہے کہ ان کا شمار بھی دکن کے شعرا میں ہوتا ہے۔ میر نے ان کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

تجھ رو میں لطف ہے سو ملک کو خبر نہیں
خورشید کیا ہے اُس کی فلک کو خبر نہیں

> واضح رہے کہ نکات الشعرا میں 100 سے زیادہ شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں 25 یا اس سے بھی زائد شعرا کا تعلق دکن اور اس کے گردونواح سے ہے۔

جعفر: ان کا اصل نام مرزا علی جعفر اور تخلص جعفر تھا، جو ناجی کے شاگرد تھے۔ (یہ شاکر ناجی نہیں بلکہ دکن کے ایک الگ شخص تھے۔ ان کا تذکرہ نصیر الدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' میں کیا ہے) نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ جعفر کو بچپن ہی سے شعروسخن کا ذوق تھا اور نوحہ، سلام، قصائد، مرثیہ اور رباعی موزوں کرتے تھے۔ میر نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ شعر یوں ہے:

غمزیاں سوں دیکھو شوخ مجھے مار کر چلے
مجروح تسن پہ راہ منیں نثار کر چلے

حسیب: میر نے لکھا ہے کہ حسیب کا احوال معلوم نہیں ہے۔ سید عبدالولی صاحب مذکور کی بیاض سے لکھ دیا گیا ہے۔ نکات الشعرا میں ان کے نام کے ساتھ ان کا ایک شعر درج ہے۔ شعر دیکھیے۔

گلبدن پھول کی مت توڑ کے ڈالی آرے
دیکھ ابھی شور کریں بلبل و مالی آرے

خوشنود: ان کا پورا نام ملک خوشنود تھا۔ یہ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا حبشی غلام تھا اور خدیجہ سلطانہ کے ساتھ خانگی ملازم کی حیثیت سے بیجاپور چلا گیا تھا۔ ملک خوشنود اپنے عہد کا بڑا شاعر تھا، جس نے ادب کی کئی اصناف میں

طبع آزمائی کی۔ میر تقی میر نے خوشنود کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا محض ایک شعر درج کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

سب رین جاگے سحر پڑھ تو بھی سجن آیا نہیں
جب جب کے دیکھی باٹ میں درشن دکھلایا نہیں

داؤد: ان کا اصل نام مرزا داؤد تھا۔ یہ اورنگ آباد کے باشندے تھے۔ میر کے مطابق داؤد سید صاحب یعنی سید عبدالولی عزلت کے شاگرد تھے اور میر کو یہ بات بھی سید صاحب کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ میر نے اپنے تذکرے میں مرزا داؤد کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

زلف دلبر سے مجکو سودا ہے
خلق کہتی ہے تجکو سودا ہے

سراج: اردو دنیا میں آج سراج اورنگ آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، لیکن جس وقت میر نکات الشعرا لکھ رہے تھے اس وقت سراج کے نام سے (خاص طور پر شمالی ہند میں) لوگ واقف نہیں تھے۔ سراج کے تعلق سے میر تقی میر لکھتے ہیں کہ ''میاں شاہ سراج، سنا ہے اورنگ آباد میں رہتا ہے۔ سید حمزہ کا شاگرد ہے۔ اتنا ہی سید صاحب مذکور (عبدالولی) کی بیاض سے استفادہ ہو پایا ہے۔''[4] نکات الشعرا میں درج سراج کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تم پر فدا ہیں سارے حسن و جمال والے
کیا خط و خال والے، کیا صاف گال والے
مجھ زرد رنگ اوپر غصہ سے لال مت ہو
اے سبز شال والے اودھی رومال والے

پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات چاند نہیں ستاروں کی کیا کمی

سعدی: ان کو میر نے سعدی دکھنی لکھا ہے۔ انھوں نے آگے یہ بھی لکھا ہے کہ ''بعضوں نے اس پر شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا گمان کیا ہے، مگر یہ غلط ہے، کیونکہ یہ الگ شخص ہے۔'' میر نے نمونے کے طور پر ان کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ یہاں ایک بات غور کرنے کی ہے کہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں سعدی نام کے کسی شاعر یا ادیب کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ سعدی کے چند اشعار میر نے نقل کیے ہیں۔ اشعار دیکھیے۔

ہمنا تمن کو دل دیا، تم نے لیا اور رکھ دیا
تم یہ کیا، ہم وہ کیا، ایسی بھلی یہ ریت ہے
دونین کے کھپر کروں، رو رو بخون دل بھروں
پیش سگ کو یت دھروں پیاسا نچاوے میت ہے
سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے، ہم گیت ہے

صبائی: ان کے نام اور احوال کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ میر نے انھیں صبائی احمد آبادی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک شعر بھی درج کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

زر سے ہے آشنائی، زر سے ملے ہے بھائی
زر نہیں تو ہے جدائی دنیا جو ہے سوز رہے

ضیا: ان کا اصل نام مرزا عطا بیگ تھا اور یہ ضیا تخلص کیا کرتے تھے۔ ضیا کا تعلق اورنگ آباد، دکن سے تھا۔ ابتدا میں یہ سراج اورنگ آبادی سے اپنی شاعری پر اصلاح لیتے تھے، بعد میں میر غلام علی آزاد سے اصلاح لینے لگے تھے۔ میر نے ان کی ایک بیت اپنے تذکرے میں درج کی ہے، بیت۔

پھول کے منہ پر ستم سیں مار مت دم اے سموم
یہ چراغ خانہ بلبل ہے گل ہو جائے گا

عاجز: ان کا اصل نام عارف علی خاں تھا اور یہ عاجز تخلص کرتے تھے۔ نصیر الدین ہاشمی نے ان کا نام عارف الدین خاں لکھا ہے۔ ان کے والد اورنگ زیب کے زمانے میں بلخ سے ہندوستان آئے تھے اور اورنگ آباد، دکن میں سکونت اختیار کی تھی اور یہیں عاجز کی پیدائش ہوئی۔ میر تقی میر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''عارف علی خاں، عاجز تخلص۔ دس بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ یہ شاہ جہاں آباد تشریف لائے تھے۔ بندہ نے ان کا شور سنا تھا، لیکن ان کی خدمت میں نہ پہنچ پایا۔ کچھ عرصے پہلے دکن کی جانب چلے گئے ہیں۔ ابھی سید مذکور کی زبان سے سنا ہے کہ برہان پور میں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے حسب نسب کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔''[5] میر نے ان کے چند اشعار اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں۔ اشعار دیکھیے۔

ترے رنگ تبسم سے بتوں کو دانت گلتی ہے
ترے عارض کے تل سے گل رُخوں کو تاب ملتی ہے
ہماری آہ کے نیزے سے اے ظالم حذر کریوں
کہ افلاس اس کی زہر آلودائی کے آگے چھلنی ہے
کہاں سے قافیہ لا لا کے اپنے شعر میں ڈھالا
ہیں عاجز دل میں تیرے داغ یا توں شیخ چلی ہے

عزیز اللہ: ان کے بارے میں میر نے بس اتنا لکھا ہے کہ ''اس نے ایک ایسی غزل کہی ہے کہ اس میں تمام اولیا اللہ کا ذکر ہے۔ اس کا مقطع یہ ہے۔

مجھ نوجواں میں کیا سکت بولوں جو ولیاں کے صفت
عاجز عزیز اللہ اوپر دکھن کے سب پیراں مدد'

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ عزیز اللہ دکن کا شاعر تھا، لیکن نصیر الدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اردو' میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔

عزلت: ان کا پورا نام سید عبدالولی اور تخلص عزلت تھا۔ یہ گجرات کے شہر سورت کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں میر نے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ان کے بہت سارے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ میر نے ان ہی کی بیاض اور ان کے بیان پر تمام دکنی شعراء تذکرہ نکات الشعرا میں کیا ہے۔ میر نے عزلت کے بہت سارے اشعار اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں۔ ان میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فقیروں سے نہ ہو بیرنگ لا لافضل ہولی میں
ترا جامہ گلابی ہے تو میرا خرقہ بھگوا ہے

جس خوش نگہ کو پہنچوں غفلت کی نیند لیوے
میں خفتہ بخت شب کا افسانہ ہو رہا ہوں
عزلت گمان یوں تھا کہ جل کر ہوا ہے راکھ
پھر دود آہ دل نیں مرا دیدہ تر کیا

اردو دنیا میں آج سراج اورنگ آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، لیکن جس وقت میر نکات الشعرا لکھ رہے تھے اس وقت سراج کے نام سے (خاص طور پر شمالی ہند میں) لوگ واقف نہیں تھے۔ سراج کے تعلق سے میر تقی میر لکھتے ہیں کہ ''میاں شاہ سراج، سنا ہے اورنگ آباد میں رہتا ہے۔ سید حمزہ کا شاگرد ہے۔ اتنا ہی سید صاحب مذکور (عبدالولی) کی بیاض سے استفادہ ہو پایا ہے۔

غواصی: یہ قطب شاہی دور کا عظیم المرتبت اور بلند قامت شاعر تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں غواصی مشہور ہوا اور عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں شاہی دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اس کی تین مثنویاں مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ بہت مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ غواصی نے غزل، قصیدہ اور مرثیہ میں بھی اپنا نام پیدا کیا ہے۔ میر نے نکات الشعرا میں غواصی کا محض نام درج کرکے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ تذکرے میں درج غواصی کا شعر ملاحظہ ہو۔

جو کوئی اس مزرعِ دل پر برہ کا بیج بوتا ہے
تو ہرگز اس کے بستاں میں گل امید ہوتا ہے

لطفی: ان کا اصل نام میر لطف علی اور تخلص لطفی تھا۔ لطفی کا تعلق دکن کی بہمنی سلطنت سے تھا۔ اب تک ان کی ایک ہی غزل کے چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ میر تقی میر نے ان کے نام کے ساتھ ان کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

تجھ عشق کی اگن سے شعلہ ہو جل اٹھا جیو
دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے
جیو کا چمن جلا سو جلتی انکارے کر
اکلا کے آگ دینے ٹیسو جنگل گیا ہے
مَیں عشق کی گلی میں گھائل پڑا تھا تس پر
جو بن کا ماتا آ کر تجکو کھندل گیا ہے

محمود: یہ بھی قطب شاہی دور کا استاد سخن شاعر تھا۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کا پورا نام سید محمود لکھا ہے۔ میر نے نکات الشعرا میں اس کے نام کے ساتھ اس کے دو اشعار نقل کیے ہیں۔ اشعار دیکھیے۔

لوگاں کہیں پتھر سے کچھ سخت نہیں لیکن
جو کوئی پیا سے بچھڑا وہ سخت ہے پتھر سے
محمود تجھ میں دستا پورا ہنر و فا کا
ہے کیا عجب جو بھاوے تو پیو کو اس ہنر سے

موزوں: ان کا پورا نام خواجم قلی خان تھا اور یہ موزوں تخلص کرتے تھے۔ یہ برہان پور کے ہفت ہزاری صوبے دار تھے۔ میر نے ان کا تذکرہ عزلت کی بیاض سے لے کر کیا ہے اور لکھا ہے کہ موزوں سید صاحب عزلت کے معتقدین میں سے تھے۔ موزوں کا ذکر نصیر الدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اردو' میں نہیں ملتا۔ نکات الشعرا میں موزوں کا یہ شعر درج ہے۔

موزوں نیں راہ عشق میں پھر اب قدم رکھا
ہے مصلحت سے دور نجانوں کرے گا کیا

ولی: ولی کا نام اردو شاعری میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کو اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔ ولی کا اصل نام ولی محمد تھا۔ میر تقی میر نے ولی کے تعلق سے لکھا ہے کہ ''ولی محمد، المتخلص بہ ولی۔ ملک الشعرا، ریختہ کا زبردست شاعر، دیوان کا مالک، اورنگ آباد کی خاک سے ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں آباد دہلی میں بھی ایک مرتبہ آیا تھا۔ میاں شاہ گلشن صاحب کی خدمت میں گیا اور اپنے اشعار جستہ جستہ پڑھ کر سنائے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ فارسی کے جو تمام مضامین بیکار پڑے ہوئے ہیں، اپنے ریختوں میں لاؤ ورنہ (روزِ محشر) تم سے پوچھا جائے گا اور تمہاری پکڑ ہوگی۔ اس کے کلام کی بہت کچھ تعریف و تحسین بھی شاہ صاحب نے فرمائی۔ اس کی شہرت اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ یہاں اس کی تعریف کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے حالات زندگی جیسا کہ چاہئیں مجھے معلوم نہیں۔''6 میر تقی میر نے ولی کے بہت سے اشعار نکات الشعرا میں درج کیے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

نہ پوچھو مشق میں جوش و خروش دل کی ماہیت
برنگ ابر دریا بار ہے رومال عاشق کا
اس کے قدم کی خاک میں صد حشر ہے نجات
عشاق کے کفن میں رکھو اس عبیر کو
غرور حسن نے تجھ کو کیا ہے اس قدر سرکش
کہ خاطر میں نہ لاوے تو اگر تجھ گھر ولی آوے
سن ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق
کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

ہاشم: ان کا پورا نام ہاشم علی تھا۔ ہاشم علی برہان پور کے رہنے والے تھے۔ نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ ''یہ ایک بلند پایہ مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔ 1169ھ تک ان کے بقید حیات رہنے کا پتہ چلتا ہے۔'' میر نے ان کے نام کے ساتھ ان کا ایک شعر اپنے تذکرے میں درج کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

> نکات الشعرا کی مترجمہ حمیدہ خاتون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ ''نکات الشعرا میں 104 شعرا کا ذکر لکھا گیا ہے، جن میں بتیس شعرائے دکن ہیں۔

دکھن ہور ہند کے دلبر ہمن سے بے حجاب اچھے
کہ ٹکڑے چاند سے پر جن کے خط پر پیچ و تاب اچھے

یونس: ان کا نام حکیم یونس تھا۔ میر نے لکھا ہے کہ ''اس کے حالات معلوم نہیں ہیں کہ کہاں کا ہے۔ جناب سید صاحب کی بیاض سے لکھ رہا ہوں۔'' اس کا تذکرہ بھی نصیر الدین کی کتاب میں نہیں ہے۔ عزلت کی بیاض میں ذکر ہونے کی وجہ سے گمان گزرتا ہے کہ یونس کا تعلق بھی دکن سے تھا۔ میر نے ان کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

صبح جب گلشن سے وہ گل رو گیا
باغ سے باہر نکل کر گل رو گیا
ہے معطر اب تک صحرا تمام
اس زمیں اوپر کوئی گل بو گیا
سو گیا جن نے جگایا تھا مجھے
بخت میرا جاگ اٹھا تھا سو گیا

مذکورہ بالا شاعروں کا تذکرہ میر نے اس وقت کیا تھا جب لوگ ان کے ناموں سے بالکل بھی واقف نہیں تھے۔ آج جو لوگ دکن کی ادبی تاریخ سے تھوڑا بہت بھی شغف رکھتے ہیں وہ ان شاعروں سے ضرور واقف ہوں گے لیکن یہاں ایک بات کھٹکتی ہے کہ دکن کے اہم اور نامور شعرا مثلاً سید محمد حسینی گیسودراز، فخر دین نظامی، ملا وجہی، قلی قطب شاہ، ابن نشاطی، میراں جی حسن خدا نما، محمد نصرتی وغیرہ کا تذکرہ نہیں ہے، جب کہ ہونا چاہیے تھا، کیوں یہ شعرا دکن میں بہت پہلے سے مشہور ہیں۔

گمان گزرتا ہے کہ نکات الشعرا میں محولہ بالا شاعروں کے علاوہ بھی اور دکنی شعرا کا تذکرہ ہوگا، کیوں کہ اس تذکرے میں بہت سے ایسے شاعروں کا ذکر ہے جو آج بھی غیر معروف ہیں۔ مثلاً قاسم مرزا، سالک، ملک، فخری، عبدالرحیم، عبدالبر حسن، ہاتمی وغیرہ۔ نکات الشعرا میں ان شعرا کا صرف نام اور ان کے کلام کا نمونہ درج ہے، ان کے احوال و آثار کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نکات الشعرا کی مترجمہ حمیدہ خاتون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ ''نکات الشعرا میں 104 شعرا کا ذکر لکھا گیا ہے، جن میں بتیس شعرائے دکن ہیں۔''7 حمیدہ خاتون کی اس بات پر تحقیق کی ضرورت ہے، کیوں کہ مولوی عبدالحق کے نسخے میں 102 اور ڈاکٹر محمود الٰہی کے نسخے میں 104 شاعروں کا تذکرہ ہے۔ لہٰذا مزید تحقیق کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ نکات الشعرا میں جملہ کتنے دکنی شعرا شامل ہیں۔

حواشی

1. نکات الشعرا، https://ur.wikipedia.org/wiki، آخری ترمیم: 19 ستمبر 2021، 06:08 بجے شام
2. میر تقی میر، تذکرہ نکات الشعرا: مترجمہ حمیدہ خاتون، جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، 1994، ص 14
3. ڈاکٹر محمود الٰہی (مرتب)، تذکرہ نکات الشعرا، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1984، 16-15
4. حمیدہ خاتون (مترجمہ) تذکرہ نکات الشعرا، جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، 1994، ص 86
5. ایضاً، ص 88
6. ایضاً، ص 81
7. ایضاً، ص 8

Dr. Md Nehal Afroz
Assistant Professor (Urdu)
Room No. 202, DDE, MANUU
Gachibowali, Hyderabad-500032 (Telangana)
Email: nehalmd6788@gmail.com
Mob: 9032815440

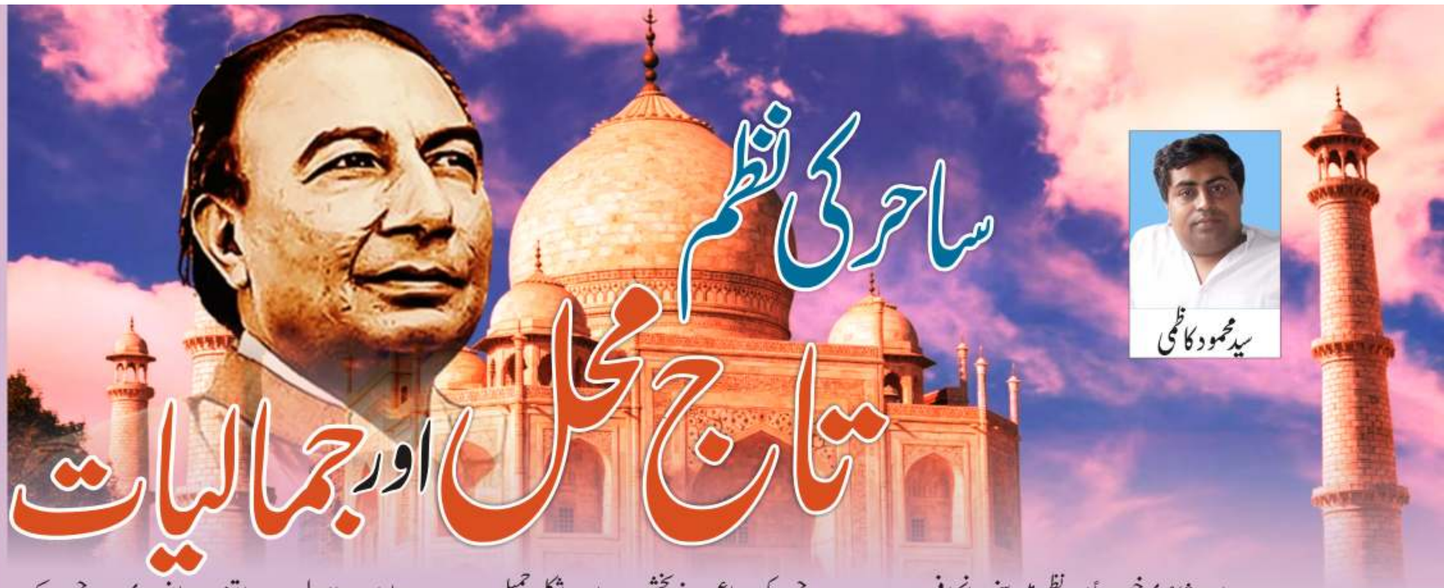

ساحر کی نظم تاج محل اور جمالیات

سید محمود کاظمی

اردو شاعری خصوصاً اردو نظم میں سخت انحرافی رویے اور ردعمل کی اگر کوئی مثال دیکھنی ہے تو ساحر لدھیانوی کی نظم 'تاج محل' کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔ یہ نظم ساحر کے پہلے شعری مجموعے 'تلخیاں' میں شامل ہے جو پہلی بار پریت نگر شاپ لاہور کے زیر اہتمام 1945 میں منظر عام پر آیا۔ 1946 میں اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ اردو لاہور سے اور تیسرا ایڈیشن نیا ادارہ لاہور سے 1947 میں شائع ہوا۔ ساحر کا سنہ پیدائش 1921 ہے اس لحاظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ ساحر نے یہ نظم جس وقت کہی ہے اس وقت ان کی عمر تیئس یا چوبیس برس رہی ہوگی۔ اس نظم پر مزید گفتگو سے قبل آیئے قندِ مکرر کے طور پر ایک بار اس کی قرأت کر لی جائے:

تاج تیرے لیے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادی رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوت شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی
میری محبوب پس پردۂ تشہیر وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں
مری محبوب انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
مری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

تاج محل پر کہی گئی تقریباً ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر نظموں میں نذیر اکبرآبادی کی 'تاج گنج کا روضہ' شاید پہلی نظم ہے۔ اس کے علاوہ سیماب اکبرآبادی کی نظم کو بھی اولیت حاصل ہے، ان دو نظموں کے علاوہ زیادہ تر نظمیں وہ ہیں جو ساحر کی نظم 'تاج محل' کے بعد لکھی گئی ہیں۔ دنیا کی اس بے مثال عمارت سے متعلق یہ تمام نظمیں انحراف سے ہٹ کر اعتراف کے جذبے کے تحت کہی گئی ہیں اور ان نظموں میں سے بیشتر کی حیثیت 'کلمۂ ستائش' سے زیادہ نہیں ہے۔ کچھ نظمیں ایسی ضرور ہیں جو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور جن پر گفتگو کی جاسکتی ہے مثلاً کیفی اعظمی اور صابر دت کی نظم۔ کیفی کی نظم ایک طرح سے ساحر کی نظم کی ہی صدائے بازگشت ہے۔ وہ بھی 'روئے ہستی پہ دھواں قبر پہ رقص انوار' کہہ کر ساحر کی آواز میں آواز ملاتے ہیں۔ کچھ اور نظمیں بھی اس نوعیت کی ہوں گی جو مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہی ہیں۔ صابر دت کی نظم بطور خاص اس لیے یاد رہ گئی کہ اردو تحقیق و تنقید کی قدآور شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی نے اس نظم کو ساحر کی نظم سے اس بنا پر بہتر قرار دیا ہے کہ اس کا بیانیہ جدید زندگی سے قریب ہے۔ تاج محل کے تعلق سے ساحر نے عام طور پر رائج اس اسطور سے ہٹ کر کہ تاج محبت کی علامت ہے ایک دوسرا اسطور یہ قائم کیا ہے کہ تاج محبت کی نہیں شاہی استحصال کی علامت ہے۔ ساحر کے قائم کردہ اس اسطور کو فرسودہ تاریخی شعور اور بچکانہ جذباتیت کا نتیجہ قرار دینے سے قبل ہمیں مارکسی جمالیات کے ان معیارات واصول سے واقف ہونا ضروری ہے جن کے زیر اثر ساحر نے یہ نظم لکھی ہے۔ کسی بھی تخلیق کار یا فن کار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو کسی بھی ایسے نظریے کے تابع رکھ سکتا ہے کہ جس پر اس کا ایمان ہو اور جسے وہ درست سمجھتا ہو بشرطیکہ تخلیق کے فنی وادبی اوصاف پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ساحر کی نظم کو سطحی اور مصنوعی انقلابیت کا نمونہ قرار دینے والوں کو ایک تخلیق کار کا یہ حق بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ ہمارے جن ناقدین نے ساحر کو بی اے پاس نوجوانوں کا شاعر کہا ہے اگر وہ اس نظم کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھ لیتے تو شاید اس میں پائی جانے والی مارکسی جمالیات کے گہرے شعور اور احتجاجی شاعری کے رموز و نکات کی روشنی میں ایک بہتر اور منصفانہ رائے قائم کر سکتے۔

احتجاج ساحر کی شعری کائنات کا سب سے اہم وصف ہے جو انتہائی فنکارانہ طور پر ان کی بیشتر نظموں میں ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے 'تلخیاں' میں 'تاج محل' کے علاوہ 'چکلے' اور 'نور جہاں کے مزار پر' جیسی دو اور نظمیں احتجاجی شاعری کی خوب صورت مثال قرار دی جاسکتی ہیں۔ ساحر کے اس اولین مجموعے کا عنوان ہی قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ ساحر کی شاعری تلخ حقائق کا اظہار بھی ہے اور بحیثیت ایک دردمند انسان اور بیباک شاعر کے صورت حال کی خرابی وابتری کا مرثیہ بھی۔ ساحر شہنشاہیت کی خرابیوں کا ذکر اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی مطلق العنانیت کو عام انسانی تحقیر کے مترادف سمجھتے ہیں اور ان کا یہی رویہ انھیں 'تاج محل' اور 'نور جہاں کے مزار پر' جیسی تلخ اور سخت انحرافی نوعیت کی نظمیں لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سردار جعفری کے مطابق ساحر نے کرشن ادیب کو بتایا تھا کہ انھوں نے جب یہ نظم کہی تھی تو اس وقت تک انھوں نے تاج محل نہیں دیکھا تھا لیکن میں سردار جعفری کے اس قول سے متفق نہیں ہوں کہ اگر وہ تاج محل دیکھ چکے ہوتے تو شاید یہ نظم نہ کہتے اور اگر کہتے تو ان کا رویہ اس تعلق سے مثبت ہوتا۔ مجھے لگتا ہے کہ ساحر تاج محل دیکھنے کے بعد بھی اگر اس

موضوع پر کوئی نظم کہتے تو اس کی حیثیت بھی ایک صدائے احتجاج کی ہی ہوتی کیونکہ یہاں مسئلہ تاج محل کے حسن کا نہیں ہے، اس کی صناعی وکاریگری سر آنکھوں پر، اس کے ایک معجزۂ فن ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ ساحر نے بھی تاج کے اس حسن کا اعتراف کیا ہے، وہ بھی اس 'شکل جمیل' کی صناعی وکاریگری کا معترف ہے، اس عمارت کے 'منقش در و دیوار' اور 'محراب وطاق' اس کے بھی احساس جمال اور شعور حسن کی تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ساحر کو فن کے عروج وکمال میں کوئی شبہ نہیں لیکن وہ فن کے پیچھے چھپی ہوئی محنت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا وہ ان ہاتھوں کی عظمت واہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے جو اس معجزۂ فن کو وجود بخشتے ہیں۔ ساحر کی اس نظم اور اس کے تخلیقی محرکات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس مخصوص تصور جمال سے بھی واقف ہوں جو فلسفہ اشتراکیت کے زیر اثر ایک ایسی انسان دوستی کے سائے میں پرورش پاتا ہے جو فن کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ محنت کی اہمیت اور قدر وقیمت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن اس سے پہلے اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ احساس جمال یا تصور جمال کیا ہے اور جمالیات کسے کہتے ہیں۔ احساس جمال اور جمالیات کی مختصر تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے کہ حیات وکائنات کی مثالی صورتوں کے عرفان وادراک کو ہم احساس جمال سے تعبیر کرتے ہیں اور انسان میں پائے جانے والے اسی احساس جمال یا شعور حسن کے اسباب وعلل اور اوصاف و خصائص کا مطالعہ 'جمالیات' کہلاتا ہے۔ ہیگل نے جمالیات کو فنون لطیفہ کا فلسفہ قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ فن کی کون سی شکل لطیف ہے اور کون سی غیر لطیف اس کا فیصلہ انسان کے ذوق حسن کے مطابق ہی ہوگا اور یہ ذوق حسن صرف اسی حد تک اجتماعی ہوتا ہے کہ ہم خوب صورتی کو پسند کرتے ہیں لیکن یہ خوبصورتی کس طرح کی ہو یہ معاملہ انفرادی ذوق حسن کا ہے۔ بہر حال اتنا تو طے ہے کہ انسان کے اندر پایا جانے والا یہ شعور حسن ہی اسے دوسرے حیوانوں سے ممتاز ومیّز بناتا ہے۔ یعنی صاف ظاہر ہے کہ احساس جمال یا شعور حسن انسانی جبلت کا خاصہ ہے نہ کہ ایک عام حیوانی ضرورت۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم احساس جمال کے حوالے سے انسان اور حیوان کے درمیان ایک واضح فرق کی نشاندہی کرتے ہیں تو پھر ہمیں یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ جمالیاتی شعور کا تعلق اظہار (Expression) سے ہے یا تاثر (Impression) سے تو اس ضمن میں لینگر کا کہنا ہے کہ

''جمالیات کے تناظر میں فنکار کے نقطۂ نظر یا فنی قدر وقیمت کے اعتبار سے فن کا مطالعہ اظہار کا مطالعہ ہے اور حساس قاری کے نقطۂ نظر سے یا حساس ناظر اور حساس سامع کے نقطۂ نظر سے فن کا مطالعہ تاثر کا مطالعہ ہے۔''

(بحوالہ جمالیات اور ہندوستانی جمالیات از قاضی عبدالستار، ص 16)

اظہار وتاثر، دونوں مطالعاتی صورتوں کے تحت حسن وفنکاری کی تفہیم، تفسیر، تعبیر اور تشریح کے لیے جس فلسفیانہ نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ دراصل اس خیال کے بطن سے جنم لیتا ہے کہ یہ کائنات ایک ازلی وابدی حسن کا پرتو ہے جسے صوفیا نے حسن حقیقی بھی قرار دیا ہے۔ افلاطون کے مطابق اسی حسن حقیقی اور اس کے تخلیق کردہ عالم حقیقت کی نقل فن کار اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا طرز احساس جس ماحول میں تشکیل کے مراحل سے گزرے اس کے اثر سے محروم ہو۔

> **ساحر کی نظم کوسطحی اور مصنوعی انقلابیت کانمونہ قراردینے والوں کو ایک تخلیق کار کا یہ حق بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ ہمارے جن ناقدین نے ساحر کو بس اے پاس نوجوانوں کا شاعر کہا ہے اگر وہ اس نظم کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھ لیتے تو شاید اس میں پائی جانے والی مارکسی جمالیات کے گہرے شعور اور احتجاجی شاعری کے رموز و نکات کی روشنی میں ایک بہتر اور منصفانہ رائے قائم کرسکتے۔**

مارکسزم نے بھی تخلیق کار کے لیے سماجی سروکاروں کو فطری اور لازمی قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تخلیق کار فطری طور پر موجودات سے متاثر ہوتا ہے اور پھر انھیں اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بناتا ہے۔ اس کا شعور ذات اور احساس جمال یا تصور حسن خلا میں نہیں اس کے سماجی انسلاکات کے درمیان پرورش پاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے معیارات حسن اور سماجی رویے یکساں ہوتے اور ان میں جو تنوع ہمیں نظر آتا ہے وہ موجود نہ ہوتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فنی معیارات ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود عہد و ماحول سے بھی ماورا ہوتے ہیں؟ تو اس تعلق سے ارنسٹ فشر نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف The Necessity of Art میں ایک بڑے کام کی بات کہی ہے، اس کا کہنا ہے کہ:

''بدلتے ہوئے سماجی حالات کے باوجود فن میں کچھ ایسی شے ہے جو ناقابل تغیر سچائی کا اظہار کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم بیسویں صدی میں رہنے والے لوگ بھی قبل از تاریخ غار کی تصاویر یا قدیم نغموں سے محظوظ ہوتے ہیں۔'' (بحوالہ مارکسی جمالیات از اصغر علی انجینئر، ص 32)

جب ہم متذکرہ بالا قول کی روشنی میں تاج محل کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ فن زماں ومکاں کی حدود سے اکثر وبیشتر ماورا ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب فن نے خون جگر کی آبیاری سے نمود حاصل کی ہو۔ تاج محل کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے یعنی فن نے ایک معجزے کی شکل اختیار کر لی ہے اور چار صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ عمارت ہماری توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ سماج اور معاشرہ بدلا، وقت اور حالات بدلے، جدید طرز تعمیر نے قدیم طرز تعمیر کی جگہ لے لی لیکن تاج محل کا جادو آج بھی برقرار ہے لیکن جن ہاتھوں کی محنت اور فنکاری نے یہ جادو جگایا ہے وہ ہاتھ گم نام ہیں۔ ان کی محنت کا کہیں کوئی ذکر نہیں، ان کے استحصال کا تذکرہ نہیں، معمار تاج کے طور پر اس شہنشاہ کا نام آتا ہے جس نے اس عمارت کی تعمیر کے لیے اپنے خزانے کا منھ کھول دیا تھا لیکن جن ہاتھوں نے اپنی محنت سے اس معجزۂ فن کو نمود بخشی ہم نے کبھی ان کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے اپنے مرقد بے چراغ اور ان کے پیاروں کے مقابر بے قندیل کیوں رہے؟ یہ عمارات ومقابر مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کا ستون تو قرار پائے لیکن محنت کشوں کی سعی مسلسل کا شناخت نامہ کیوں نہ بن سکے۔ یہی ساحر کا Main concern ہے۔ اور یہ صرف ساحر کا ہی Concern نہیں ہے بلکہ ہر اس انسان کا ہے جو مارکسی جمالیات کا صاف اور واضح تصور رکھتا ہے کہ جس کے مطابق فن اور فن کار کی عظمت اسی میں پوشیدہ ہے کہ اس میں ازلی انسانی اقدار کی جھلک پائی جاتی ہو۔ اور اگر یہ اقدار مجروح ہوں یا کی جائیں تو فن بھی متاثر ہوتا ہے اور فن کی عظمت کا تصور بھی۔ مارکس اس بات پر زور دیتا ہے کہ محنت جب ایک مخصوص درجے پر پہنچ جاتی ہے تو فن کی تخلیق عمل میں آتی ہے اس لیے کسی بھی فنی تخلیق کا مطالعہ اور اس کا محاکمہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم محنت کو Recognize نہیں کرتے۔ مارکس کے مطابق محنت حیاتیاتی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ اس کے داخلی یا جمالی تقاضوں کی تکمیل بھی کرتی ہے مثلاً تعمیر اور فن تعمیر میں سے 'تعمیر' کی حیثیت یہ ہے کہ وہ ہماری بنیادی

ضرورت کو پورا کرتی ہے جب کہ 'فن تعمیر' ہمارے داخلی یا جمالی تقاضوں کی تکمیل کو یقینی بناتا ہے اور یہی فرق ایک معمولی عمارت اور تاج محل کے مابین پایا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ محنت دونوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ تاج محل بھی اسی محنت کا نتیجہ ہے جو ایک مخصوص درجے پر پہنچ کر فن کی صورت اختیار کر گیا۔اب اگر یہ محنت اختیاری ہو اور محض محنت کش کی تخلیقی قوت کا اظہار ہو تو یہ مستحسن ہے اور اگر ایک مخصوص سماجی نظام میں بازار کی ضرورتوں یا دوسروں کی خواہشات کی تابع ہو تو پھر محنت کش کے استحصال اور اس کی بشری تحقیر کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔معماران تاج کے ساتھ بھی یہی ہوا کیونکہ ان کی صناعی وکاریگری کسی دوسرے کی خواہش نمود کی تابع تھی۔شہنشاہ کو مہیا بے پناہ مادی وسائل نے سنگ مرمر کے ساتھ محنت کو بھی خرید لیا اور اس تشہیر وفا کے پردے میں سطوت کے نشانات گم ہو کر رہ گئے۔

اب اسی مارکسی جمالیات کی قائم کردہ ایک اور اہم بحث کی طرف آتے ہیں اور وہ بحث ہے حسن یا شعور حسن کے تعلق سے ازلی صداقت کی ۔ مارکسی تصور جمال کے مطابق ہمیں انسان ،محنت اور پیداوار کے اس تکون کو اس وقت بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جب ہم یہ طے کر رہے ہوں حسن کی صداقت ازلی کہاں موجود ہے اور کس میں پائی جاتی ہے۔اب تک ہمارا شعور حسن عظمت ورفعت کے اس مخصوص تصور کے زیر اثر رہا ہے جو حسن کو ایک روحانی و جمالیاتی تجربہ قرار دیتا ہے اور اس کی ارضیت کا منکر ہے۔ ہماری ارضی یا جسمانی ضرورتوں کی تکمیل جن اشیا سے ہوتی ہے نہ ان میں حسن ہے اور نہ ہی وہ ہمارے فنون لطیفہ بالخصوص شعروادب کا موضوع بن سکتی ہیں۔ اس تصور حسن کے برعکس مارکس حسن کے افادی پہلو کو بھی ملحوظ خاطر رکھتا ہے اور شعور حسن یا احساس جمال کی تربیت ان خطوط پر بھی چاہتا ہے کہ ہم ان اشیا اور لوگوں میں بھی حسن دیکھیں جو ہماری ارضی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے جب پریم چند نے کہا تھا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا تو اس سے ان کی یہی مراد تھی اور پھر اپنے افسانے عید گاہ میں انھوں نے اسی مارکسی تصور جمال کو فنکارانہ طور پر افسانے کی بُنت کا حصہ بنایا تھا جب مٹی کے رنگ برنگے خوب صورت کھلونوں کے مقابلے میں لوہے کا ایک ٹیڑھا میڑھا بدصورت چمٹا حسن کا معیار بن جاتا ہے۔یہاں پریم چند نے اس نکتے کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے کہ حسین وہی ہے جو مفید ہے۔اگر ہمارا شعور حسن بنی نوع انسان کی بہتری اور بھلائی کے تصور سے آشنا ہو جائے تو اس کی تعبیر وتفسیر کا دائرہ از خود تعمیر حیات کی ان مختلف صورتوں تک پھیل جائے گا جنھیں ابھی تک ہمارے کسی بھی جمالیاتی تجربے کا حصہ نہیں سمجھا گیا ہے۔

مارکسی جمالیات کا ایک اہم ترین وصف اس کا تاریخی شعور ہے جو جمالیات کے دوسرے تصورات میں عام طور پر نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مارکس سے قبل کانٹ اور ہیگل جیسے فلسفی ایک واضح تصور جمال رکھتے تھے لیکن ان دونوں کے نزدیک جمالیات کا تعلق محض تصورات وتخیلات کی دنیا سے ہے اور تاریخ کا ایک مخصوص دور اور اس دور کے مثبت ومنفی عناصر کا ادراک ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔اس کے برعکس مارکسی تعبیر جمالیات زیادہ ارضی ہے اور وہ کسی بھی طرح کے شعور حسن کے تحت جبر واستحصال کو جمالیاتی پیکر نہیں عطا کر سکتی۔ ساحر چونکہ ایک ترقی پسند شاعر تھے جو مارکسی فلسفۂ حیات سے متاثر تھے اس لیے وہ کسی واضح تاریخی شعور کے بغیر مجرد جمالیاتی تعبیر حسن کو قبول نہیں کر سکتے تھے ،یہی وجہ ہے کہ انھوں نے 'پس پردہ تشہیر وفا' اقتدار وقوت کی کارفرمائی کی نشاندہی کی اور اپنی محبوب سے یہ تقاضا کیا کہ وہ مردہ شاہوں کے عالی شان مقابر کے حسن میں ہی کھو کر نہ رہ جائے بلکہ تاریک رہ جانے والے ہزاروں مکانات کی جانب بھی نظر کرے ۔ یہاں پر مجھے برتول بریخت کا وہ قول یاد آتا ہے جس کے مطابق ایک سماجی حقیقت نگار جس فن پارے کی تخلیق کرتا ہے اسے زندگی اور انسان کی تقدیر پر قدرت حاصل کرنے کا حوصلہ عطا کرنا چاہیے۔وہ تب ہی کارآمد وکامیاب قرار دیا جائے گا جب وہ انسانی مجبوری کے مقابلے میں انسانی آزادی، ذلت اور پستی کے مقابلے میں بلندی، روایت پرستی کے مقابلے میں خلاقانہ آزادروی کے جذبے کو پروموٹ کرے۔ساحر نے اس نظم کے ذریعے یہی کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر وہ تاج محل کے اس Stablished اسطور کو کہ تاج محل یادگار محبت ہے، چیلنج نہ کرتے اور ایک دوسرا اسطور یہ قائم نہ کرتے کہ تاج محل مطلق العنانیت کے پیدا کردہ استحصال کی علامت ہے تو وہ ایک بڑے سماجی حقیقت نگار کے طور پر نہ ابھرتے اور نہ ہی ان کا تخلیق کردہ فن پارہ ہمیں روایت پرستی کے مقابلے میں آزادروی کا شعور بخشتا۔ ساحر نے ایک Stablished اسطور کی تکرار کے بجائے ایک نئے زاویے سے گفتگو کی اور اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھا کہ فن یا ادب ہمیشہ اپنے عہد ،ماحول اور سماج کی پیداواری قوتوں میں تبدیلی کے ساتھ نئے سماجی وژن کی تشکیل کرتا ہے۔صیغہ متکلم کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اس کی محبوبہ اس وادی رنگیں سے عقیدت رکھے اور اسے ایک مظہر الفت کے طور پر قبول کرے،وہ اسے تصویر کے ایک دوسرے رخ کی جانب بھی متوجہ کرنا چاہتا ہے۔وہ فن کی قدرشناسی کے ساتھ محنت کی ناقدری اور جبر واستحصال کی کئی دوسری صورتوں کو بھی روشنی میں لانا چاہتا ہے اور بحیثیت ایک سماجی حقیقت نگار یہ اس کا فرض بھی ہے اور حق بھی۔

ارسطو نے عظیم ادب کی شرط المیہ کو قرار دیا تھا۔یہ المیہ فنکار یا تخلیق کار کا ذاتی بھی ہو سکتا ہے اور اس کے معاشرے اور سماج کا بھی۔ المیہ دراصل ان دو تضادات کے باہمی ٹکراؤ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے کہ تاریخی طور پر جو ضروری ہو اس کا حصول عملی طور پر ممکن نہ ہو۔اب اگر کسی فنکار کی تخلیق میں ان تضادات کا گہرا شعور پایا جاتا ہے تو وہ تخلیق المیہ کی ایک فنکارانہ صورت گری کی حامل ہوتی ہے ۔ساحر نے تاج محل کو موضوع سخن بناتے وقت المیے کے اس پہلو کو ذہن میں رکھا کہ تاج کی تعمیر تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جس نے معماران تاج کی محنت کی جگہ شہنشاہ کی سطوت وشوکت کے تصور کو Stablish کیا اور جس کے نتیجے میں قوت وطاقت کی وہی اجارہ داری قائم ہوئی جو ہر دور میں کمزور کے استحصال اور اس کی بشری اہانت کے نت نئے طریقے ڈھونڈتی ہے۔ظاہر ہے کہ مارکسی جمالیات کسی بھی ایسے المیے کے نتیجے میں وجود میں آنے والی شئے کو حسین نہیں قرار دے سکتی۔مارکسی جمالیات کا یہ تصور اشرافیہ کے قائم کردہ اس تصور جمال سے یکسر مختلف ہے جو ارفع واسفل کی بنیاد پر کسی شئے کو حسین یا بدصورت قرار دیتا ہے۔اس حقیقت پسندانہ شعور حسن یا تصور جمال نے روایتی ہیروازم کی تمام تر تعبیرات کو الٹ کر رکھ دیا۔ساحر نے نظم تاج محل میں اسی نئی جمالیاتی تعبیر سے کام لیا اور سوشلسٹ ریلزم کی ایک اچھی مثال قائم کی۔

ساحر کی اس پوری نظم میں اسی مارکسی تصور جمال کا واضح شعور ہمیں شعری وادبی تجسیم کاری کا حصہ بنتا نظر آتا ہے۔یہ پوری نظم بہت اچھی اور ہر لحاظ سے جملہ فنی تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے لیکن اس کی بے پناہ شہرت کا سبب اس کے آخری دو مصرعے ہیں اور انہی مصرعوں نے لہجہ کی تلخی اور درشتگی کے باوجود اس نظم کے مجموعی تاثر کو اس طرح قائم کیا ہے کہ یہ ایک بڑے اور پھیلے ہوئے سماجی المیے کا شناخت نامہ بن گئے ہیں۔

■

Dr. Syed Mahmood Kazmi
Head Dept. of Translation
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli Hyderabad 500032 (Telangana)
Mobile : 9949060358

محمد طیب علی

ابن صفی کے تنقیدی خیالات

(پیش رس کے حوالے سے)

ابن صفی شاعر تھے، طنز و مزاح نگار تھے اور جاسوسی ناول نگاری کی وجہ سے انھیں شہرت، مقبولیت اور عظمت حاصل ہوئی۔ وہ تنقید نگار نہیں تھے لیکن ہر تخلیق کار ایسی تنقیدی نظر ضرور رکھتا ہے جس سے وہ اپنی اور دوسروں کی تخلیق میں امتیاز کر سکے، یا اپنی تخلیقات کے درمیان امتیاز کی صورت پیدا کر سکے۔ اسی تنقیدی نظر سے وہ اپنی تخلیقات کا جواز پیدا کرتا ہے اور ان کی تراش خراش کا کام لیتا ہے۔

ابن صفی جب ناول لکھتے ہوں گے تو ان کے پیش نظر بھی کچھ معیارات ضرور ہوں گے، عموماً تخلیق کار ان معیارات کو قاری کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ ابن صفی نے بھی کوئی منظم انداز میں اپنے خیالات و معیارات کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اپنے ناولوں پر 'پیش رس' کے عنوان سے جو پیش لفظ لکھا کرتے تھے ان میں متعدد مقامات پر ان کے تنقیدی خیالات و معیارات غیر شعوری پر قاری کو حاصل ہوتے ہیں۔ زیر نظر مقالے میں انھی خیالات کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ابن صفی کا پہلا جاسوسی ناول دلیر مجرم فروری 1952 میں الٰہ آباد سے شائع ہوا۔ اس کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ اردو میں جاسوسی ناول سرے سے ہیں ہی نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو جاسوسی ناول اردو میں اب تک لکھے گئے ہیں وہ آج کے اردو داں طبقے میں زیادہ مقبول نہیں۔ ان کی غیر مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے محیر العقول واقعات کی بنا پر وقتی طور پر قاری کے ذہن کو مسحور تو کر لیتے ہیں لیکن منطقی شعور کی تسکین نہیں کر سکتے۔ انھیں زیادہ سے زیادہ طلسم ہوش ربا کے بعد جگہ دی جا سکتی ہے، اس کے آگے گنجائش نہیں۔''[1]

یہاں در اصل ابن صفی اس ممکنہ سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جاسوسی ناول نگاری کی ضرورت کیوں ہے؟ وہ جاسوسی ادب کی ضرورت منطقی شعور کی تسکین کو بتاتے ہیں۔ ابن صفی محیر العقول واقعات پر تنقید کرتے ہیں اور اسے گزرے ہوئے زمانے کا رجحان قرار دیتے ہیں۔ سائنسی عہد میں انسانی شعور نے ترقی کے منازل طے کیے ہیں، ایسے میں ابن صفی کے خیال میں ادبی شہ پاروں میں ایسے واقعات پیش کیے جانے چاہئیں جو جدید ذہن کو منطقی طور پر مطمئن کر سکیں۔ اس سلسلے میں وہ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''اصل میں انگریزی کی اسپائی اسٹوریز پر مبنی فلموں نے بعض پڑھنے والوں کا ٹیسٹ بگاڑ دیا ہے اور وہ مجھ سے بھی یہی چاہتے ہیں کہ میرا ہیرو بھی ہر حال میں 'فولاد کا پٹھا' ثابت ہو۔ اوپر ہوائی جہاز، نیچے توپیں، دائیں سمندر، بائیں آتش فشاں۔ کبھی وہ بموں سے بچتا ہے تو کبھی توپ کے گولوں سے۔ توپیں چلیں اور وہ دھم سے گر پڑا۔ ارض و سما سمجھے قصہ پاک ہوا لیکن یہ کیا؟ اس نے توپ کے دہانے میں چھلانگ لگائی تھی اور اس کی دم کی طرف سے نکل کر سمندر کی ایک کشتی میں جا بیٹھا۔ توپیں منہ دیکھتی رہ گئیں، ہوائی جہاز نے منہ کی کھائی! آتش فشاں منہ پیٹنے لگا اور قاری کا منہ دیکھنے کے قابل ... لیکن وہ ہیرو دوبارہ بھی منہ کی کھاتا ہے۔ ... میں باز آیا. خدا مجھے معاف کرے! اور آپ اس قسم کی فرمائش کرنا چھوڑیے۔ میں تو کہانی کی دل چسپی کا قائل ہوں کہ آپ کچھ ہی دیر کے لیے سہی اپنی الجھنوں سے نجات پا لیں ... اور بس۔[2]

یعنی ابن صفی نہ صرف طلسم ہوش ربائی محیر العقول

واقعات کے خلاف تھے بلکہ وہ سائنسی دور کے محیر العقول کارناموں کی بھی حوصلہ شکنی کرتے ہیں، ابن صفی اپنے قارئین کی ذہنی تسکین ایسے دلچسپ واقعات سے کرنا چاہتے ہیں جو منطقی طور سے مطمئن کرنے والے ہوں۔ چنانچہ دلیر مجرم کے پیش رس میں وہ جاسوسی دنیا کے معروف کردار بہرام کو بھی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مثال کے طور پر بہرام کے ناولوں کو لے لیجیے۔ بہرام کا کردار حد درجے دلچسپ ہے۔ اس کے کارنامے تھوڑی دیر کے لیے قاری کو گم صم کر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں لیکن جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ اس کا طریقہ کار کیا تھا تو اس کی مافوق البشریت پر ایمان لائے بغیر کام نہیں چلتا۔ ابھی جسے آپ سپرنٹنڈنٹ پولیس سمجھ رہے تھے وہ تو بہرام تھا ... جسے آپ کوتوال صاحب کی بیوی سمجھ رہے تھے لیجیے وہ بھی بہرام نکلا۔ ... غرضیکہ کائنات کے ذرے ذرے میں بہرام ہی کا جلوہ نظر آتا ہے لیکن اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کچھ دن تک تو اس قسم کے ناول مقبول رہے لیکن آہستہ آہستہ پڑھنے والوں کا دل ان کی طرف سے اچاٹ ہوتا گیا۔''[3]

یعنی مافوق البشریت جدید سائنسی اور منطقی ذہن کے لیے وقتی تفریح کا ذریعہ تو بن سکتے ہیں لیکن ان کا نقش تادیر قائم نہیں رہتا۔ یہ وہ نظریہ ہے جو ابن صفی کی تخلیقات کو عظمت بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن صفی کے قارئین میں ہر طبقے کے لوگ شامل رہے اور ان کے ناولوں کو ایک خاص قسم کا ناول کہتے رہنے کے باوجود ان سے دامن بچانا ان کے لیے مشکل رہا۔ ابن صفی اسی پیش رس میں انگریزی سے ترجمہ کردہ جاسوسی ناولوں اور اردو کا جامہ پہنے انگریزی جاسوسی ناولوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کی خامیوں پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس کے بعد ان ناولوں کا نمبر آتا ہے جن کا انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ ان کو پڑھ کر وہی کیفیت ہوتی ہے جو ایک انگریز کو بہترین سوٹ پر گاندھی کیپ پہنے دیکھ کر ہوسکتی ہے۔ ان کی عبارت جھول دار ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ ناول ہیں جن کا پلاٹ انگریزی سے آیا ہوتا ہے۔ ان میں دشواری یہ آپڑتی ہے کہ کرداروں کے نام تو ہندوستانی ہوتے ہیں لیکن ان کا طور طریقہ، بولنے اور سوچنے کا انداز قطعی غیر ملکی معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ناول سوفی صدی چوں چوں کا مربہ بن کر رہ جاتے ہیں جن کے دو تین باب پڑھنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ کتاب سر پر مار لیں۔''[4]

اس طرح وہ اردو میں موجود تین طرح کے جاسوسی ناولوں کا ذکر کرکے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں:

1. طبع زاد جاسوسی ناول جن میں محیر العقول واقعات بیان ہوئے، جن کے کرداروں کی مافوق البشریت پر ایمان لائے بنا کوئی چارہ نہیں۔
2. انگریزی سے ترجمہ شدہ جاسوسی ناول، جن کی عبارت جھول دار ہوتی ہے۔ زبان کی غیر صفائی اور بے محل محاورے کے استعمال سے ان میں مضحکہ خیزی در آتی ہے۔ اس کو بیان کرنے کے لیے وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے تمثیل لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی انگریز کو بہترین سوٹ پر گاندھی کیپ پہنا دیا جائے۔ یعنی اچھی خاصی تخلیق کا غیر معیاری ترجمہ۔
3. ایسے جاسوسی ناول جن کا براہ راست تو ترجمہ نہیں کیا گیا لیکن پلاٹ انگریزی ناولوں سے اڑا لیے گئے۔

ابھی تک اردو میں اچھے جاسوسی ناولوں کا فقدان ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اردو کے اچھے ادیبوں کی اس طرف سے عدم توجہی ہے۔ دنیا کے ہر اچھے ادب میں اس کا جاسوسی لٹریچر اچھی خاصی جگہ رکھتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اردو اس سے محروم رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پلاٹ کرداروں سے مطابقت پیدا نہ کر پانے کی وجہ سے ناول نہ ہندستانی رہ پاتا ہے اور نہ انگریزی، اس طرح وہ چوں چوں کا مربہ بن جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صفی اپنے عہد کے رجحانات و میلانات سے خوب واقف ہیں اور ان کی خوبیوں خامیوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ یہ بھی کہ انھوں نے ماہ بہ ماہ اپنی ناول نگاری خوب سوچ سمجھ کر منصوبہ بند طریقے سے شروع کی اور اس کی ضرورت و اہمیت کے لیے وہ مضبوط دلائل و جواز رکھتے ہیں۔ چنانچہ آگے وہ لکھتے ہیں:

''بہر حال ابھی تک اردو میں اچھے جاسوسی ناولوں کا فقدان ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اردو کے اچھے ادیبوں کی اس طرف سے عدم توجہی ہے۔ دنیا کے ہر اچھے ادب میں اس کا جاسوسی لٹریچر اچھی خاصی جگہ رکھتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اردو اس سے محروم رہے۔ ممکن ہے کہ بعض ساتھی اسے غیر ضروری اور غیر افادی کہہ کر ٹال جائیں لیکن یہ درست نہیں کیونکہ جب تک پرانا نظام قائم ہے جرائم بھی زندہ رہیں گے اور ان کا پرتو بھی ادب پر پڑتا رہے گا۔ اس لیے اس سے دامن بچانا مشکل ہے۔

مگر یہ ضروری ہے کہ اسے پیش کرنے میں ایسی خوش سلیقگی سے کام لیا جائے کہ پڑھنے والوں کے دل میں جرائم کی طرف سے نفرت پیدا ہو سکے اور ایک ایسی سوسائٹی بنانے کا خیال پیدا ہو جس میں جرائم کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ رہے۔ جاسوسی دنیا کا اجرا اسی مقصد کے تحت عمل میں آیا ہے۔ ایک طرف تو یہ اردو میں جاسوسی ناولوں کی کمی پوری کرنے کے لیے صرف وہی چیزیں پیش کرے گا جو موجودہ سائنسی دور کے دماغ کو مطمئن کر سکیں اور دوسری طرف ان رجحانات سے عوام کو باخبر کرتا رہے گا جن کی بدولت جرائم جنم لیتے ہیں اور پرورش پاتے ہیں۔ ہمارا پہلا ناول آپ کے سامنے ہے۔ یہ کہاں تک موجودہ تقاضوں کو پورا کرتا ہے اس کا فیصلہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ یقین بھی دلاتے ہیں کہ اس سلسلے کا اگلا ناول اس سے بھی زیادہ شان دار ہوگا۔''[5]

یہاں ابن صفی کے تنقیدی خیالات وسیع ہو جاتے ہیں، ان سے قبل اردو میں اچھے جاسوسی ادب کی غیر موجودگی کی وجہ وہ اس رجحان کو قرار دیتے ہیں جو جاسوسی ادب کو دوئم درجے کا ادب ماننے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یعنی ضروری بات یہ ہے کہ جاسوسی ادب کو پہلے ایک مقام حاصل ہو، اس صورت میں اچھے ادیب بھی اس کی طرف متوجہ ہوں گے، اور تب امید کی جاسکتی ہے کہ اچھا جاسوسی ادب بھی سامنے آئے۔ وہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ جب دنیا کی دوسری زبانوں میں جاسوسی ادب کو ایک خاص مقام ملا ہوا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اردو والے اس سے منہ پھیرے ہوئے ہیں؟ حالانکہ جرائم تو انسانی سماج کی ہی دین ہے۔ جہاں انسانی سماج ہے وہاں جرائم ہیں، اور بہ قول ابن صفی ''جرائم کسی خاص طبقے تک محدود نہیں۔ مصلح بھی مجرم ہوسکتا ہے۔ ایک ادیب بھی جرم کرسکتا ہے۔ مجرم وہ لوگ بھی ہوسکتے ہیں جنھیں لوگ منصف سمجھتے ہیں۔''[6]

تو پھر جرائم سے نفرت سکھانے والا ادب کیوں معرض وجود میں نہ آئے؟ پھر ابن صفی جاسوسی ناولوں کے لیے گویا ایک منشور تیار کرتے ہیں کہ اچھا جاسوسی ادب وہی

ہوسکتا ہے جو سائنسی دور کے دماغ کو مطمئن کرسکے اور جو جرائم کے اسباب پر روشنی ڈالے۔

ابن صفی کے ناولوں کی مقبولیت کے ساتھ قارئین سے ان کے روابط بھی گہرے ہوتے گئے، بایں معنی کہ ابن صفی اپنے پیش رسوں میں اپنے قارئین کے بعض خطوط پر اپنے مخصوص انداز میں مخاطب ہوتے تھے۔ ان خطوط میں وہ اپنے سراہنے والے قارئین کا صرف شکریہ ادا کرتے ہیں جب کہ تنقیدی خطوط کے جوابات لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ناقدین کو خوش آمدید بھی کہتے ہیں اور ان کی نقد پر اپنے تنقیدی خیالات بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مذکورہ اقتباس بھی قارئین کے خطوط کا مجموعی جواب ہے۔ وہ اپنے قارئین کو بھروسا دلاتے ہیں کہ وہ جاسوسی ناول نگاری کا سلسلہ تاعمر جاری رکھیں گے اور بہتر سے بہتر تخلیقات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ اتنے بہتر ہوں گے کہ اچھی تخلیقات کے لیے انھیں یورپ کا منہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ایسے ہی ایک خط کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ایک صاحب رقمطراز ہیں کہ ابن صفی صاحب! اب آپ کی کتابوں میں سراغرسی کم اور بکواس زیادہ ہوتی ہے۔ آپ فن کا خیال نہیں رکھتے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر یا تو مزاح ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں یا معاشرے کی اصلاح کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ صرف جاسوسی ناول لکھیے خالص فنی نقطہ نظر سے۔ ان صاحب کے پورے خط کے مضمون سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ فن سراغ نویسی پر بحث کرتے وقت لازمی طور پر ان کے ذہن میں انگریزی کے جاسوسی ناول تھے۔ لیکن میں ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج کل اردو میں انگریزی جاسوسی ناولوں کے ترجمے ردی کے بھاؤ کیوں بکتے ہیں؟ کوئی پبلشر اب ترجمے چھاپنے کی ہمت کیوں نہیں کرتا؟ ظاہر ہے کہ ترجمے عموماً بہترین اور نامور مصنفین ہی کے پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن اردو میں ان کا حشر دیکھ لیجیے۔''[7]

ظاہر ہے مکتوب نگار کا تنقیدی خط اسی بنا پر معرض تحریر میں آیا ہوگا کہ ابن صفی کا اسلوب نگارش عالمی جاسوسی ناولوں سے جداگانہ تھا۔ مکتوب نگار نے اس میں دو نکات کو خاص طور سے پیش کیا ہے۔ ایک تو مزاح اور دوسرا اصلاح معاشرہ۔ یہ دونوں نکات ابن صفی کے ناولوں کے امتیازات ہیں۔ اس پر ابن صفی نے الزامی جواب میں کتنا اہم سوال اٹھایا کہ عالمی جاسوسی ادب کے بہترین ناولوں کے اردو ترجمے اس قدر بدذائقہ کیوں ہیں۔ کیونکہ ابن صفی نے قارئین کے ذوق کی تسکین بھی کی اور تربیت بھی۔ اس کی وجوہات پر بھی وہ روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ اسی پیش رس میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''ہر قوم کا مزاج جداگانہ ہوتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم بھی وہی پسند کریں جو دوسری قوم میں پسند کرتی ہیں اور پھر بھئی میں فن برائے فن کا قائل بھی نہیں ہوں۔ انگریزی کے جاسوسی ادب میں جسے آپ خالص فن کا آئینہ دار سمجھتے ہیں بعض چیزیں معاشرہ کے لیے تباہ کن بھی ہیں۔ مثلاً ہیرو پرستی کے جوش میں جرائم پیشہ افراد کی طرف داری۔''[8]

یہاں ابن صفی کا ادبی نظریہ قدرے واضح ہو جاتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ہر قوم کا ادب اس کے مزاج کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیونکہ پسند ناپسند کا تعلق مزاج سے ہے۔ دوسرے یہ کہ ابن صفی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی جیسے نظریات کو زیر بحث لاتے ہوئے ثانی الذکر کو اپنا مطمح نظر بتاتے ہیں اور اس کی وجہ بھی وہ بتاتے ہیں۔ وہ ادب برائے ادب کو نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ایسا فن جو چپکے سے معاشرے میں جرائم پسند لوگوں کو ہیرو بنادے ان کے نزدیک تباہ کن ہے۔ چنانچہ وہ سائمن ٹمپلر سینٹ اور آرسین لوپن جیسے جاسوسی کرداروں پر مخصوص انداز میں تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں مثال کے لیے انگریزی کے صرف دو مشہور کرداروں کا تذکرہ کروں گا جو اردو میں لکھنوی پاجامہ پہن کر مقبول ہونے کی کوشش کر چکے ہیں۔ یہ کردار ہیں سائمن ٹمپلر سینٹ اور آرسین لوپن۔ یہ ایسے قانون شکن کردار ہیں جو صریحی مجرم ہونے کے باوجود بھی قانون کی زد پر نہیں آتے اور پڑھنے والے پولیس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مصنفین کا انداز تحریر ایسا ہوتا ہے جیسے وہ خود ہی پولیس کا وقار خاک میں ملانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ بہر حال مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ قانون اور قانون کے محافظ، قاری کے لیے مضحکہ خیز بن کر رہ جاتے ہیں۔ مجھ سے اس کی توقع نہ رکھیے۔ میرے شروع سے اب تک کے ناول دیکھ لیجیے۔ آپ کو قانون کے احترام ہی کی ترغیب نظر آئے گی۔ میرے پڑھنے والوں کی ہمدردیاں قانون اور قانون کے تحفظ ہی کے لیے ہوتی ہیں اور پھر میں انگریزی ناولوں کی پیروی کیوں کروں؟ میں نے اپنے لیے الگ راہیں نکالی ہیں۔ میرے زیادہ تر پڑھنے والے مجھے پسند کرتے ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے میرے لیے۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے انگریزی ہی سے سیکھا ہے۔ لیکن انگریز تو نہیں ہوں۔''[9]

یعنی ایسے مجرم کردار جو قانون کی زد میں نہ آسکیں، اگر ان کو مصنفین ہیرو کی طرح پیش کریں گے یا ایسی تخلیق جس میں قانون اور اس کے محافظ کا مضحکہ اڑانے کی صورت حال پیدا ہوگی، معاشرے کی تنزلی کا سبب ہوں گے۔ چونکہ ابن صفی ادب برائے زندگی کے قائل تھے اس لیے انھوں نے اپنی تخلیقات سے قانون کا احترام اور جرم سے نفرت سکھانے والی نگارشات پیش کیں۔ دوسرے یہ کہ وہ انگریزی ناولوں سے مرعوب نہیں ہیں، یورپ کی تقلید ایشیائی ادب کو آزادانہ طور سے سوچنے اور تخلیقی تجربے بیان کرنے کے مواقع سے باز رکھے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ مغربی ادب سے ابن صفی نفرت کرتے تھے، بلکہ ان کا اصرار اس بات پر ہے کہ ہمیں اپنے سرمایے کو معیاری بنانا چاہیے اور ان پر فخر کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے انگریزی سے ہی سیکھا، لیکن سیکھنا اور تقلید کرنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔

ابن صفی کی ناول نگاری کو مقبول عام ادب کہہ کر خارج از ادب رکھا گیا۔ گویا مقبول عام ادب کوئی ایسی بری بات تھی جس سے احتراز ضروری ہو۔ ایسا کر کے اہل اردو نے بڑا نقصان کیا۔ تمام طرح کی بے رخی کے باوجود ابن صفی کے ناول خود کو منوانے میں کامیاب رہے۔ جن لوگوں نے ان کے ناولوں کو پڑھا ہے انھیں پتا ہے کہ ان کے ناول 60، 70 برس بعد بھی ویسے ہی تازہ معلوم ہوتے ہیں اور وقت کی گرد کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ابن صفی جن دنوں اپنی تخلیقات پیش کر رہے تھے، انھیں اس بات کا احساس تھا کہ جس ادب کو سنجیدہ کہا جا رہا ہے ان کا کیا حال ہونے والا ہے اور خود ان کے ناولوں کے ساتھ وقت کیا برتاؤ کرے گا۔ انھوں نے اس موضوع پر اپنے مدلل تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ بیچارہ/بیچاری ناول کا پیش رس اگر ہو بہو پیش کردیا جائے تو یہ اپنے موضوع پر ایک جامع مضمون کہلانے کا مستحق ہوگا۔ وہ اپنے اس ناول کو ہمیشہ زندہ رہنے والے ادب میں ایک کہانی کا اضافہ کہتے ہیں پھر اس کی دلیل میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ ادب ہمیشہ اس لیے زندہ رہتا ہے کہ اس کا تعلق براہ راست Instinct of curiosity سے ہے۔ تجسس کی جبلت مرتے دم تک زندہ رہتی ہے۔ آدمی اس وقت بھی متجسس رہا ہے جب وہ غریب اپنی اس جبلت کو کوئی مخصوص نام دینے کا سلیقہ نہیں رکھتا تھا۔ اگر یہ غلط کہہ رہا ہوں تو پروفیسر صاحبان ہی اس کی تصدیق کردیں جو چھپا چھپا کر جاسوسی ناول پڑھا کرتے ہیں لیکن اگر کسی نشست میں کسی کی زبان پر جاسوسی ناولوں کا ذکر بھی آجائے تو اس طرح ناک بھوں سکوڑتے ہیں جیسے اس نے خواتین کے مجمع میں 'مغلظات' شروع کردی ہوں۔ ادب کی زندگی

> ہر قوم کا مزاج جداگانہ ہوتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم بھی وہی پسند کریں جو دوسری قو میں پسند کرتی ہیں اور پھر بھئی میں فن برائے فن کا قائل بھی نہیں ہوں۔ انگریزی کے جاسوسی ادب میں جسے آپ خالص فن کا آئینہ دار سمجھتے ہیں بعض چیزیں معاشرہ کے لیے تباہ کن بھی ہیں۔ مثلاً ہیرو پرستی کے جوش میں جرائم پیشہ افراد کی طرف داری۔

یا موت کا پیمانہ آدمی ہے۔لہٰذا آدمی کی مختلف قسم کی صلاحیتوں کے انحطاط کے ساتھ ہی مختلف قسم کے ادب کا بھی تیا پانچہ ہوتا رہتا ہے۔ بہتیرے لوگوں کو جوانی کی بداعمالیوں کی یہ سزا ملتی ہے کہ وہ بڑھاپے میں صوفی ہو جاتے ہیں۔ لیجیے صاحب ختم ہوئیں پر شباب قسم کی گرما گرم کہانیاں۔اب وہ مذہبی کتب کی تلاش میں سرگرداں نظر آئیں گے یا پھر ایسی کتابیں ٹٹولتے پھریں گے جو انھیں 'مجاز' سے حقیقت تک پہنچا دیں۔(جوانی میں چلتے تو ہیں مجاز ہی کے سہارے لیکن حقیقتاً جنسی ناکارگی تک جا پہنچتے ہیں)۔''10

تجسس کی جبلت ہی سنجیدہ کہانیوں کی بھی بنیاد ہے۔'پھر کیا ہوا' کی گردان ہی کسی بھی کہانی کو آگے بڑھاتی ہے۔ابن صفی کا ماننا ہے جب انسان میں تجسس کی جبلت ازل سے پائی جاتی ہے اور ابد تک باقی رہنے والی ہے تو جاسوسی کہانیاں کیوں کر ختم ہوسکتی ہیں۔خواص کا وہ طبقہ جو ابن صفی کے ناول چھپا چھپا کر پڑھتا رہا اسے تجسس کی جبلت سے انکار نہیں ہوسکتا، پھر جاسوسی ادب کو مقبول عام کہہ کر کیوں کر رد کیا جائے۔ابن صفی سوال اٹھاتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ طبقہ خواص ان ناولوں کو پڑھتا بھی ہے اور ان سے نفرت بھی کرتا ہے۔ان کی دلیل ہے کہ کسی ادب کی موت یا زندگی کا تعلق آدمی سے ہے۔ ابن صفی نے بڑھتی عمر کے ساتھ بدلنے والے رجحان کا جو ذکر کیا وہ تو دیکھا بھالا اور مجرب ہے۔بڑے بڑے ناقد و تخلیق کار آخر عمر میں زیادہ مہذب و مذہبی ہو جاتے ہیں۔وہ مزید طنزیہ اسلوب میں لکھتے ہیں:

''ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تجسس کی جبلت مرتے دم تک قائم رہتی ہے۔ کچھ نہیں تو مرنے والا یہی سوچنے لگتا ہے کہ دیکھیں اب دم نکلنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔اس لیے اس بات کی تسکین فراہم کرنے والا ادب بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔لاحول ولاقوۃ! میں بھی کتنی غلط باتیں کرنے بیٹھ گیا ..... نہیں بابا یہ آفاقی ادب ہرگز نہیں ہے جسے ہم پیار سے جاسوسی ادب بھی کہتے ہیں۔ زندہ رہنے والا ادب تو وہ تھا جو قحط بنگال کے زمانے میں اسی موضوع پر پیش کیا گیا جسے آج کوئی بھی پڑھنا پسند نہیں کرتا، زندہ رہنے والا ادب تو وہ تھا جو 47ء کے فسادات کے دوران اس موضوع پر پیش کیا گیا اور جواب دور سے بھی نظر آجائے تو پڑھنے والے ناک کم اور بھوں زیادہ چڑھاتے ہیں (ویسے ذرا سے ہیر پھیر سے یہ موضوعات بھی آفاقی ادب کے شاہ کار بن سکتے تھے۔بس اتنا کرنا پڑتا کہ ان کی تباہ کاریاں بیان کرنے کے بجائے ان کے اسباب وعلل پر جاسوسی ناول لکھ دیے جاتے۔الا ماشاء اللہ)''11

یہاں ابن صفی کے طنز کی کاٹ گہری ہوگئی ہے۔وہ قحط بنگال اور تقسیم ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات کے تعلق سے لکھے گئے ادب کا ذکر کر کے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اب انھیں کون پڑھتا ہے؟ واضح ہو کہ یہ تحریر 1964 میں معرض تحریر میں آئی تھی اور تقسیم وطن کو بیس برس بھی نہیں ہوئے تھے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابن صفی نے یہاں غلو آمیز باتیں لکھ دی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہنگامی ادب کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ایسے ادب میں صرف وہ شہ پارے زندہ رہ پاتے ہیں جن میں آفاقی عناصر بھی شامل ہوں۔ابن صفی مانتے ہیں کہ واقعات وسانحات کے بھیانک پن کو بیان کرنے سے ادب زندہ نہیں رہتا بلکہ وہ ادب زندہ رہتا ہے جس میں واقعات کی بدنمائی کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالی جائے۔اسی طرح کا خیال انھوں نے ایک دوسرے پیش رس میں ظاہر کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی کبھی کوئی کردار کسی دوسرے کردار کے طریقہ کار کی وضاحت کے لیے گڑھا جاتا ہے۔وہ اپنے ایک ناول کے کردار صبیحہ کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس کا کردار ناول میں مذکور انجمن کے طریقہ کار کی وضاحت کے لیے لایا گیا ہے۔اس کی وضاحت کے دو ہی طریقے ہوسکتے ہیں یا تو چند حرفوں میں لکھ دیا جائے کہ انجمن کا پیشہ بلیک میلنگ تھا۔یا پھر کسی واقعے کے سہارے یہ چیز قاری کے ذہن نشیں کرائی جائے۔ پہلا طریقہ رپورٹ کہلاتا ہے اور دوسرا طریقہ کہانی۔یعنی رپورٹ اور کہانی میں فرق ہے۔ابن صفی کہتے ہیں کہ وہ کہانی لکھتے ہیں نہ کہ رپورٹ۔

ابن صفی نے سماجی اور تاریخی ناولوں کے تعلق سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔انھوں سماجی ناول کے تعلق سے بھی ذوق اور صلاحیتوں کی تبدیلی کا حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اب ذرا سماجی مسائل پیش کرنے والے ادب کو بھی دیکھتے چلیے۔اس کے متعلق بھی یہی خوش فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے لیکن جہاں سے سماجی مسائل پیش کرنے والے ادب کی تحریک شروع ہوئی تھی وہاں کا حال بھی سن لیجیے۔ابھی کچھ ہی دن ہوئے یہ خبر سننے میں آئی کہ روس میں میر امن کی باغ و بہار ترجمہ ہو کر کروڑوں کی تعداد میں بک گئی۔سخت حیرت ہوئی سن کر۔ بھلا الیا اہرن برگ کے وطن مالوف میں یہ حادثہ کیوں کر ہوا؟ مایوکوفسکی کے دیس میں چاسر کی کینٹر بری ٹیلس کو کیوں کر مقبولیت حاصل ہوئی؟ ابھی حال ہی میں ایک روسی فلم ''دی سیکرٹ فورٹ'' دیکھ کر سر پیٹ لینا پڑا تھا۔ بچوں کی تعلیم کے بہانے یار لوگ ''طلسم ہوشربا'' فلمانے پر اتر آئے ہیں۔ جسے آٹھ سال سے اسی سال تک کے بچے دیکھتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔''12

الیا اہرن برگ روسی ناول نگار اور صحافی تھا وہ اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے اپنے زمانے میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا، اسی طرح ولادیمیر مایوکوفسکی مستقبلیاتی رجحان کا شاعر تھا۔اسے بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایسے لوگوں کے ملک میں ہی لوگوں نے داستانوی اور طلسم ہوشربائی ادب کو قبول کرلیا تو دوسرے ممالک کا کیا کہنا۔ ابن صفی یہاں بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ ادب کی زندگی یا موت کا پیمانہ آدمی ہے۔اس کا ذوق ہے۔اس کی صلاحیتیں ہیں۔

حوالہ جات

1 اوراق پارینہ (جاسوسی دنیا کے پیش لفظ، اداریے اور پیش رس)، مرتب شاہجہاں پوری، سنہ اشاعت 2023، پیش لفظ دلیر مجرم، ص56
2 ایضا، پیش رس تباہی کا خواب، ص98-297
3 ایضا، پیش لفظ دلیر مجرم ص56
4 ایضا، پیش لفظ دلیر مجرم، ص56
5 (ص) ایضا، پیش لفظ دلیر مجرم، ص57-56
6 ایضا، پیش لفظ موت کی آندھی، ص68
7 ایضا، پیش رس سیکڑوں ہم شکل، ص188
8 ایضا، پیش رس سیکڑوں ہم شکل، ص188
9 ایضا، پیش رس سیکڑوں ہم شکل، ص89-188
10 ایضا، پیش رس بیچارہ/بیچاری، ص229
11 ایضا، پیش رس بیچارہ/بیچاری، ص30-229
12 ایضا، پیش رس بیچارہ/بیچاری، ص229

Mohammad Taiyab ali (Taiyab Ali)
SKN English School
Paschim paly , Kanki,
Uttar Dinajpur- 733209 (West Bengal)
Mob.: 6294338044
Email: ali1taiyabgmail.com

فوزیہ حبیب

شہرِ وانمباڑی اور اردو لوک ادب

لوک ادب کسی بھی قوم کا عظیم سرمایہ ہوتا ہے کیونکہ لوک ادب کے دامن میں اس قوم کے گزشتہ ادوار، روایات، تہذیبی ومعاشرتی اقدار اور لسانی وادبی سلسلے آباد ہوتے ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس رقمطراز ہیں:

"لوک ادب اور لوک گیتوں کی چند امتیازی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے مثلاً یہ کہ ان کا مصنف گمنام ہوتا ہے۔ یہ گیت زیادہ تر اجتماعی اور کم تر انفرادی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکثر یہ گیت محنت کش عوام کی اجتماعی تخلیقی محنت کے عمل میں خلق ہوئے اور گائے جاتے ہیں۔" (اردو میں لوک ادب: مرتب پروفیسر قمر رئیس، ص 8)

پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں:

"وہ ادب جس کو عوام نے جنم دیا ہو لوک ادب ہے" (اردو میں عوامی ادب: ایک روایت: پروفیسر محمد حسن، ص 25)

شہرِ وانمباڑی ریاست تمل ناڈو کے ضلع ویلور کا ایک چھوٹا سا علمی وادبی مرکز ہے۔ دنیا کے نقشے پر وانمباڑی کا نام چمڑے کے ایک بڑے تجارتی مرکز کی حیثیت سے موجود ہے۔ ہندوستان کے متعدد علاقوں کی طرح شہرِ وانمباڑی میں بھی اردو لوک ادب کی روایت صدیوں سے چلی آرہی ہے اس میں لوک کہانیاں، قصے، کہاوتیں، پہیلیاں اور گیت وغیرہ شامل ہیں۔ لوک ادب میں سب سے زیادہ مقبولیت گیتوں کو ہوئی کیونکہ گیت ہر خواص وعوام کی زبان پر بہ آسانی چڑھ جاتا ہے شہرِ وانمباڑی میں بھی کئی ایسے لوک گیتوں کا ذخیرہ موجود ہے جو ہر خاص موقع، تقریب اور تہوار کے مطابق گایا جاتا ہے لوک گیتوں سے خواتین کا گہرا تعلق ہے مزے کی بات یہ ہے کہ یہ گیت کسی سُر اور تال کی محتاج نہیں ہوتے۔

لوک گیت کی روایت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اس میں عام طور پر وہ باریک اور چھوٹے چھوٹے مگر اہم حقائق بیان ہوتے ہیں جہاں تک ایک مستند مصنف کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ جو شادی بیاہ، بچوں کی پیدائش اور دوسرے مواقع کی مناسبت سے جو گیت گاتی ہیں ان میں واقعات کے نہایت ہی باریک پہلوؤں کو سمو لیتی ہیں جن کا نمونہ کسی افسانے اور ناول میں نہیں ملتا۔

شکرانہ جسے عرف عام میں وانمباڑی میں ہلدی کی رسم بھی کہا جاتا ہے اس میں دولہا کی بہنیں اور رشتہ دار دلہن کو رسم کرتے وقت چوک کے گیت پورے جوش وخروش سے گاتیں خواتین رنگین چاولوں سے دیدہ زیب نقش ونگار بناتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار گیتوں کے ذریعے کرتی ہیں۔ بعض گھرانوں میں ہلدی کی رسم کے ساتھ ہی تیل کی رسم بھی ادا کی جاتی ہے اور اس میں اس زمانے کے رواج کے مطابق سات سہاگنیں دلہن کے سر پر باری باری تیل لگاتیں اور بڑی بوڑھیاں دلہن کے سر سے روپیہ وغیرہ وار کر بلائیں لیتیں اور فضا لوک گیتوں کی جھنکار سے گونج اٹھتی تھی۔ چند گیت ملاحظہ ہوں۔

عارس میری بی بی نہور بیٹھی چاند
نقدے کے نو مہریاں سہرے تلے مانگ
ہے ساتوں بہنا پالکی پر پان کھانا
بھائی تیری رانی کو سوا پل میں لانا
دھنیا میں کوتنگی دھنیا جیسے چھلے
وہ کیسے بی بلے ساساں نندان تلے

شادی بیاہ میں خواتین سمدھنوں کو طنز کا نشانہ بھی بناتی ہیں

جوائیاں کی ساس پھرتی گلی گلی
جیویں کھیلے گلی اڑگئی ساس کی تلی
جوائیاں کی ساس کھول بیٹھی پٹھارا
جیویں منگتے بیوی زرد پھرا دوشالہ

اور اس موقع پر وہ دلہن کو بھی نہیں بخشتیں میٹھے میٹھے طنز کی بوچھار سے دلہن کو بھگویا جاتا۔

عارس میری بی بی بوند و بوندو روتی
نوشو گھر کا کھانا ڈٹے ڈٹے کھاتی
ہماری بھاوج کریلے پکائی
ہے نندان گئے تو محلوں میں چھپائی

اور کچھ دیر بعد تعریفوں کا راگ شروع ہوجاتا۔

ہماری بھاوج ڈولارے میں ڈولتی
ہے بھانا گئے تو اٹھ کر تعظیم کرتی

پھر شادی کے دن منڈوے کے گیت گائے جاتے اور یہ گیت دولہا اور دلہن دونوں طرف سے پیش ہوتے تھے دولہا اور دلہن کی بہنیں اور رشتہ دار سرخ آنچل تلے منڈوے کے گیت گاتے ہوئے خوشیوں بھرے ماحول میں چار چاند لگادیتیں اور فضا معطر ہوجاتی۔

کیا بیل چڑھی ہے قدرت کی   منڈوا ہے سہانا شادی کا
شفاف ہے چادر پھولوں کی   منڈوا ہے سہانا تاروں کا

ایک اور گیت ملاحظہ ہو

چلے آؤ منڈوے کے اندر چلو   آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ
شرم سے یہ نظریں جھکاتے چلو   آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ
خوشی کی نظر دل میں لیتے چلو   آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ
مبارک قدم کو بڑھاتے چلو   آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ

چوک کے گیت اور منڈوے کے گیت کے علاوہ رخصتی کے گیت بھی بعض گھرانوں میں رائج تھے لیکن شہرِ وانمباڑی میں اس کا رواج بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

لوک ادب میں لوری کے گیت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے بچے کو جھولا جھلاتے وقت ماں بڑے ہی خوبصورت اور ممتا سے لبریز آواز میں لوری کے گیت گاتی اور بچہ لوری سنتے سنتے چند لمحوں میں نیند کی وادیوں میں اتر جاتا ماں کی لوری بچوں کے لیے ٹانک کی سی اہمیت رکھتی ہے

جھو بالے ماجھو بالے/ میرے بچے کو اللہ پالے
آری بھو چل کو/ انڈہ دے ری تل کو
جھو رے تانے/ موتی کے دانے
منے کو سلانے/ امی نے جھلانے

بچہ جب چھ سات ماہ کا ہوتا تو ماں بچے کو مختلف انداز سے بہلاتے ہوئے کھلاتی اور بہت پیارا سا گیت اس کے لبوں سے نکلتا اور گیت سن کر بچہ کلکاریاں مارنے لگتا چند گیت ملاحظہ ہو۔

چڑی چڑی یاں بیٹھ/ آری چڑی یاں بیٹھ
کھانا کھا پانی پی/ باغ کو جا بھاگ جا
تو بھی کھا منے کو بھی دے/ پھر کر کو اڑ جا
تالیاں ماتالیاں/ تالیاں بجیں گے
پوریاں پکاں گے/ ہے تے کھاں گے

سب کو بھی دیں گے
ہری مرچی تو کیا بولی/ بچے کا منھ جلا ڈالی
بچہ منگتا مٹھا کھانا/ ہمے منگتے پلاؤ کھانا

بچے جب شرارتیں کرتے اور ماں کو تنگ کرنے لگتے تو ماں اسے مختلف انداز سے بہلاتی اور بچے کی ننھی منی انگلیاں پکڑ کر اسے گدگداتے ہوئے یہ گیت گاتی۔

چن چن پاپا ماما جگنی/ بیٹا سبّل کلمہ کی انگلی
بڈھا بھاڈوس... دال گھوٹوم... دال گھوٹوما

وقت گزرنے کے ساتھ بچے بڑے ہوکر اپنے ساتھیوں اور ہمجولیوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہوجاتے ہیں اور یہاں پر گیتوں کے بول کچھ اس طرح ہوتے ہیں کھیل کے گیت بھی لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں میں زیادہ مشہور ہیں۔

انکھی مچانی، دال گھوٹانی/ ایک انڈہ کھالے کو دو انڈہ بچت
اپڑی کی تپڑی کی پکّے پکّے پان/ اُڑ گے چڑیاں پکڑ اس کے کان

آم چوری بادام چوری/ کلکتہ میں جاؤنگی
سات کریلا کھاؤنگی/ ایک کریلا چھوٹا
ماموں جی کا لوٹا/ لوٹا میں پانی
تیری امّی رانی/ تیرا ابا وارلجہ
سنے (سونے) کا دروازہ/ اللہ اللہ بولونگی

بچیاں دو گروپ میں بٹ جاتیں اور دونوں طرف آمنے سامنے ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کھڑی ہوجاتیں اور سریلے انداز میں گیتوں کی مالا بکھیرتیں۔

پھول منگنے آتے ہیں/ پھول منگنے آتے ہیں
پھول کے باغ میں/ کونسا پھول ہونا... کونسا پھول ہونا

ایک بچی اس کی پسندیدہ دوست کی طرف اشارہ کرتی اور اس کا نام لے کر کہتی جیسے

عائشہ پھول ہونا... عائشہ پھول ہونا

اور اس طرح وہ اپنی سہیلی کو اپنی ٹولی میں شامل کر لیتی۔
اور چند کھیلوں کے گیت ملاحظہ ہو

ایک سہیلی دھوپ میں بیٹھ کو روتی تھی ۔۔۔ روتی تھی
اٹھو سہیلی اٹھو۔ آپ کے انکھیاں پونچھو
چاروں طرف دیکھو... آپ کی سہیلی کون ؟

بھنڈی بازار میں ٹماٹو... ٹماٹو
گھی گوشت کھاتا تو... کھاتا تو
سوڈا لیمن پیتا تو... پیتا تو
اب کس کی باری ہے ؟

کبھی ان سہیلیوں میں لڑائی ہوجاتی تو ایک دوسرے کو بالواسطہ طنز و مزاح کا نشانہ بنایا جاتا

کا کا کٹی تیرا منھ میں مٹّی/ میرا منھ میں شکر
تیرا گھر ٹوٹیا/ میرا گھر اچھا

شبو شبانہ/ ڈِنگ ڈِنگ بجانا (کسی کا نام شبانہ ہو تو اس طرح چڑایا جاتا ہے)
کانی کانی یہ کیا کری/ کائیکو مجھ سے کچی چھوڑی
(کسی کی آنکھ کانی ہو اور سہیلیوں میں بات چیت بند ہو تو چڑانے کا انداز بدل جاتا ہے)

چند گیت خواتین کے گھریلو کام کاج کے سلسلے میں بھی مشہور ہیں۔

اچار... اچار... نیم کا اچار
بھابھی ذرا چکھ کو دیکھو کِتا (کتنا) مزیدار

ڈبے ڈبے بسکو ٹاں/ کیا جی پکائی میمونہ
کھٹے کھٹے بیگناں/ رِکن رِکن کی بھاجی

لوک گیت میں فقیروں کا بھی بہت بڑا کردار رہا ہے جو دف بجا کر حمدیہ اور نعتیہ کلام پڑھتے تھے جنھیں شہرِ وانمباڑی میں دفعی فقیر یا سائیں فقیر کہا جاتا ہے۔

دکنی اردو کے تحریری ادب کی طرح زبانی ادب میں بھی قصے کہانیوں کا ذخیرہ موجود ہے جسے زبانی لوک ادب کہا جاتا ہے۔

بوڑھی عورتیں اپنے پوتے، پوتیوں، نواسے اور نواسیوں کو کہانی سناتیں، بچے بڑے انہماک سے سنتے پھر وہ جب بڑے ہوجاتے جوانی کی حدوں کو پار کر کے دادا دادی، نانا نانی بن جاتے تو وہ بھی گھر کے بچوں کو اکٹھا کر کے وہی کہانیاں دوہراتے جو انھوں نے اپنے بچپن میں سنی تھیں۔ اس طرح ان کا وقت بھی گزر جاتا تھا قصے کہانیوں میں بچے نصیحت کی باتیں بھی سیکھ لیتے تھے۔

شہرِ وانمباڑی میں بھی دوسرے علاقوں کی طرح نانیاں اور دادیاں بچوں کو قصے اور کہانی سناتی تھیں لوک کہانی سنانے کا الگ ہی انداز ہوتا ہے جب بھی بزرگ بچوں کو کہانی سنانا شروع کرتے تو "ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی گاؤں میں ایک بادشاہ رہتا تھا" کہنے کے بجائے "ایک گاؤں میں ایک بادشاہ کتے" سے کہانی کی شروعات ہوتی تھی اور کہانی کے آخر میں ان بزرگوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کہانی کا اختتام خوشگوار اور بچوں کے حسبِ خواہش ہو مثلاً:

"آخیر میں شہزادہ شہزادی کی شادی ہوجاتی اور سب بھی خوشی خوشی رہتے کتے"

دوسرے علاقوں کی طرح وانمباڑی سے بھی بہت ساری کہانیاں منسوب ہیں۔ ان میں سات شہزادیوں کی کہانی، پری کی کہانی، چڑیا اور کوّے کی کہانی وغیرہ مشہور ہیں۔

چڑیا اور کوے کی کہانی کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے۔
کہانی کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے:

"ایک گاؤں میں ایک کوّا اور ایک چڑی رہتے سو کتے۔ کوا نمک کا گھر بنایا کتے چڑی سونے کا گھر بنائی سو۔ ایک دن زور سے بارش ہوئی تو کوّا کا گھر گھل گا (گیا) کتے وہ بھاگ کو چڑی کا گھر جاتا کتے اور دروازہ مار کو چڑی کو بلاتا
"چڑی بہن! چڑی بہن! دروازہ کھولو...

اس طرح یہ کہانی آگے بڑھتی ہے اور چڑیا کوا کو اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے۔ کوا دھوکے سے اس کے گھر کا سارا اناج کھا لیتا ہے اور وہاں غلاظت چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ چڑیا کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ اس کا بدلہ لینے کے لیے ایک دعوت کا منصوبہ بناتی ہے اور بہانے سے کوّا کو گرم پانی سے نہلا دیتی ہے۔ یہ کہانی مزیدار ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے۔ بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ احسان فراموش لوگوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ بچے اس کہانی کو بڑے ذوق وشوق اور دلچسپی کے ساتھ سنتے تھے۔

کہانیوں کی طرح پہیلیاں بھی اُس زمانے میں مقبول عام تھیں چند پہیلیاں ملاحظہ ہو

ایک طشتری بارہ چمچہ۔ گھڑی
مسئلہ مسلتا ہاتھ میں رکھے تو پھسلتا۔ نُنگو (Ice Apple)
سفید ساڑی میں پیٹ بھر کو بچے۔ لہسن
ہمارے ابا ساڑی لائے موڑنے موڑنے مڑتا نئیں۔ آسمان
ہمارے ابا پیسے لائے گِننے گننے سرتا نئیں۔ تارے

اردو لوک ادب میں ضرب الامثال اور کہاوتوں کا ایک جہاں آباد ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کی جڑوں میں لوک ادب موجود رہا ہے کیونکہ عوام کے بغیر نہ زبان پوری طرح وجود میں آسکتی ہے نہ وہ دور تک پھیل سکتی ہے اور نہ دیر تک قائم رہ سکتی ہے۔ شہرِ وانمباڑی کی چند کہاوتیں ملاحظہ ہو

ایرے کی بیوی کو زیرے کا بگھار
خلیل خان فاختہ اڑائے
مرغی کو پوچھ کو مسالہ پیستے
بندر کے ہاتھ میں پھول کا ہار
گِرے تو گرے مچھی کو مٹی نہ لگے
سو بکنا ایک لکھنا

اس طرح شہرِ وانمباڑی کے افق پر لوک ادب پورے آب وتاب سے جگمگاتا تھا لیکن یہ روایت آج سے تقریباً پندرہ بیس سال پہلے کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر ہوگئی ہے۔ شاید ضرب الامثال اور کہاوتیں چند ایک بزرگ خواتین آج بھی بولتی ہوں لیکن گیتوں کا رواج تقریباً ختم ہوگیا ہے۔

■

Fouzia Habeeb
Assistant Prof. Dept of Urdu
Islamiah Women's College
Vaniyambadi - (Tamil Nadu)
Mob.: 7904322597

رانی حفیظ

سنسکرت اور فارسی کے لسانی رشتے

دنیا کی تمام زبانیں اپنے عہد، زمانے اور خطے کی ضرورتوں کے سبب ہی وجود میں آئی ہیں۔ زبان صرف ترسیل و ابلاغ کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ پوری ثقافت اور پوری تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور انسان کو اپنے ماضی اور مستقبل سے جوڑنے کا کام کرتی ہے انگریز جب ہمارے ملک ہندوستان میں داخل ہوئے تو انھوں نے سیاسی بنیاد پر یہاں کی علمی کتب اور آثار قدیمہ کی تلاش وتحقیق شروع کی اس وقت جو تحریریں سامنے آئیں ان سے اس بات کا گمان ہوتا ہے کہ برصغیر میں تہذیب وتمدن کی باضابطہ اور باقاعدہ بنیاد آریائی قوم نے رکھی تھی اس وقت پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا جو لوگ علمی مشاغل میں حصہ لیتے تھے وہ سرکاری ملازمت حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے فارسی زبان پر دسترس حاصل کی کیونکہ اس وقت ہندوستان کی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں میں تمام سرکاری امور فارسی زبان میں ہی انجام دیے جاتے تھے۔

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا رواج مدت قدیم سے موجود رہا ہے تاریخی اعتبار سے ہندوستان میں 800 سال تک فارسی زبان کو ہی سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی تہذیبی اور ثقافتی حیثیت بھی طول وطویل زمانے تک برقرار رہی اس حقیقت سے تو کسی صاحب نظر کو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ زبان وادب کا ہمارے ملک کی تہذیب اور مشترکہ کلچر کی تعمیر میں بہت اہم اور بنیادی کردار رہا ہے اس زبان کی وجہ سے ہمارے ملک میں اعلیٰ، علمی وادبی آثار وجود میں آئے اور بہترین افکار وخیالات کی تخلیق ہوئی یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں فارسی کی مقبولیت اور تہذیبی سربلندی کے رشتے عوام اور عوامی زندگی سے ہمیشہ جڑے رہے ہیں اور آج بھی اس کی صدائے بازگشت کو ہندوستان کے در وبام سے محسوس کیا جاسکتا ہے اس زبان کا شمار دنیا کی زندہ و پائندہ زبانوں میں ہوتا ہے ہمارے ملک ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر فارسی زبان وادب کے گہرے اور دیرپا اثرات کی داستان بہت دلچسپ بھی ہے اور قدیم بھی۔ اس ملک کی مختلف بلکہ یہاں کی زیادہ تر زبانوں پر ہمیں فارسی زبان وادب کے گہرے اور راسخ نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ ایرانی تہذیب وتمدن کے تحفظ وبقا کے ضمن میں ہندوستانی دانشوروں اور یہاں کے مفکرین نے جو قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں ان کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی دانشوران ادب کی فارسی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے جناب 'آقای محمد علی' (ندوشن) لکھتے ہیں:

''زیر چتر تنگ فرہنگ ایران کہ زبان و ادبیات فارسی بہ صورت عنصر مرکزی آن قرار میداشت، کشور ہند قرنہا وسالہا مانند آغوش مادر گہوارہ تمدن ایرانی بودہ است۔''

(فارسی زبان و ادب، ڈاکٹر سمیع الدین احمد، لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی میں طبع ہوئی، ص 6)

ترجمہ: ایرانی ثقافت میں جہاں فارسی زبان وادب کو مرکزیت حاصل تھی، ہندوستان میں صدیوں اور برسوں سے ایرانی تہذیب کے گہوارے میں دست وبازو بنا تھا۔

برصغیر میں فارسی زبان مختلف حیثیتوں سے ہماری علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی کا حصہ بن کر اس کے حسن اور خوبصورتی میں مسلسل اضافہ کرتی رہی ہے ہندوستان کے متعدد مدارس اور اسکولوں کالجوں میں آج بھی فارسی زبان کی تعلیم وتدریس ہوتی ہے دوسری زبانوں کی طرح یہ زبان بھی سلسلہ ارتقا کے تمام مراحل سے گزرتی ہوئی آج ایک بہت نکھری ہوئی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور تاریخی، سیاسی، جغرافیائی اور علمی اثرات قبول کر کے دنیا کی متمول، شیریں ترین زبانوں کی صف میں شمار ہوتی ہے۔ اس زبان میں ہمارے ملک کی تاریخ وادب کا ایک گرانقدر اور بیش قیمت سرمایہ موجود ہے اس زبان نے ہمارے وطن کی تہذیبی وحدت کو استحکام بخشنے اور اس کو اجاگر کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ فارسی زبان وادب کے مایہ ناز محقق اور ناقد 'پروفیسر نذیر احمد' فارسی زبان کی اہمیت وافادیت کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’فارسی نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اگر چہ اس کے دور تسلط کو ختم ہوئے ایک صدی سے زیادہ ہوا لیکن یہاں کی تہذیب و معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر اس کے اثرات کے نقوش تازہ ہیں۔‘‘

(فارسی زبان وادب، ڈاکٹر سمیع الدین احمد لیبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی میں طبع ہوئی، ص6)

ہمارے ملک میں فارسی زبان وادب کا سلسلہ کئی سو سالوں سے جاری وساری ہے اور یہ زبان ہندوستان میں سرکاری، درباری اور عدالتی زبان کے طور پر رائج رہی ہے یہاں تک کہ یہ زبان مغل سلطنت میں اپنے پورے عروج پر پہنچی تھی، نیز پورا خطہ اس کی تہذیب وتمدن کے زیر اثر رہا ہے ہندوستان کی اکثر دانش گاہوں، کالجوں، مکتبوں اور مدرسوں میں یہ زبان آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے ہماری تہذیب وثقافت سے اس زبان کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ یہ شیریں زبان ہماری تہذیب کے رگ و ریشے میں پیوست ہے علم وفضل، شعر وادب اور دوسری علمی ادبی تخلیقات کا وسیلہ ہونے کے علاوہ فارسی زبان کے اثرات اور نقوش بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کی سیاسی و ملکی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی تاریخ کے اوراق پر ہمہ گیر اور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں غزنوی عہد سے لے کر تیموری عہد کے زوال تک تاریخ عالم اور تاریخ ہند کا کم و بیش سارا ادبی اور علمی سرمایہ اسی زبان میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہمارے ملک میں فارسی زبان و ادب کا سلسلہ کئی سو سالوں سے جاری وساری ہے اور یہ زبان ہندوستان میں سرکاری، درباری اور عدالتی زبان کے طور پر رائج رہی ہے یہاں تک کہ یہ زبان مغل سلطنت میں اپنے پورے عروج پر پہنچی تھی، نیز پورا خطہ اس کی تہذیب و تمدن کے زیر اثر رہا ہے ہندوستان کی اکثر دانش گاہوں، کالجوں، مکتبوں اور مدرسوں میں یہ زبان آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے ہماری تہذیب و ثقافت سے اس زبان کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔

سنسکرت زبان برصغیر پاک وہند کی سب سے اہم اور قدیم زبانوں میں سے ایک ہے یہ ایک ہندآریائی زبان ہے جو ہندیورپی زبان کے خاندان کی ایک شاخ ہے اس نام کا مطلب بہتر اور مقدس ہوتا ہے لہٰذا سنسکرت کو ایک الگ زبان کے طور پر نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن ایک بہتر یا مکمل مقدس تقریر کے طور پر ضرور لیا جاتا ہے اس زبان کی دو اہم شاخیں ہیں ’کلاسیکی سنسکرت‘ اور ’ویدک سنسکرت‘ کلاسیکی سنسکرت ادب میں استعمال کی جاتی ہے تاریخ دانوں کے مطابق سنسکرت اولین ہندیورپی زبان کی اولاد میں شامل ہے جو ابتدائی طور پر یورپ کے میدان میں بولی جاتی ہے سب سے پرانی ایرانی زبان، اوستا بھی اسی زبان کی ایک شاخ کہی جاسکتی ہے اور وہ سنسکرت سے قریبی تعلق رکھتی ہے اس کو قدیم ترین موجودہ زبانوں کی فہرست میں نمایاں مقام ہونے کا اعزاز حاصل ہے قدیم ہندوستان میں علم اشرافیہ کی علامت اور تعلیمی حصول کا ذریعہ سنسکرت زبان ہی تھی اور یہ زبان آج بھی بنیادی طور پر پڑھے لکھے اور اعلیٰ طبقے کی زبان تصور کی جاتی ہے یہ ہندوستان کی 22 سرکاری زبانوں میں سے ایک زبان ہے جس کے تقدس اور عظمت کو ہر دور میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے مشہور مورخ گوری ناتھ شاستری نے اپنی مشہور کتاب ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر میں فارسی زبان کی ابتدا کے بارے کچھ اہم باتیں بیان کی ہیں:

سنسکرت زبان کو عام طور پر ویدک اور کلاسیکی میں تقسیم کیا جاتا ہے ویدک زبان میں آریائی ہندوستانیوں کا پورا مقدس ادب لکھا گیا تھا اس ویدک زبان کے اندر کئی مراحل کو احتیاط سے الگ کیا جاسکتا ہے اور اس کے ایک سے دوسرے میں ترجمہ کے دوران یہ بتدریج جدید تک پہنچ گیا یہ بالآخر کلاسیکی سنسکرت میں ضم ہوگیا۔

(a concise history of classical sanskrit literature, second edition, galurinath sastri 1960, P 15)

سنسکرت زبان اور ادب کی ترقی کا علم اس کی تاریخ سے ملتا ہے تاریخ ہزاروں کتابوں کی مقدار میں ان کی فضیلت اور اہمیت کے نقطہ نظر سے منتخب کتابوں کا مختصر تعارف پیش کرتی ہے سنسکرت زبان کی سب سے قدیم کتاب ’رگ وید‘ ہے۔ چار ویدوں کے بعد جو ادب تخلیق ہوا اس میں زیادہ تر ادب مذہبی نوعیت کا ہے سنسکرت ادب کا آغاز ویدوں کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے اس ادب کا زیادہ تر استعمال ہندو سناتن دھرم میں ہوتا ہے۔ سنسکرت کی دو مشہور رزمیہ نظمیں ’مہابھارت‘ اور ’رامائن‘ ہیں اسی طرح سے دیکھا جائے تو یہاں بھی گوری ناتھ شاستری نے اپنی کتاب ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر میں سنسکرت زبان کی اہمیت کو بتانے کی کوشش کی ہے:

’’ہندوستانی روایت سنسکرت کو دیوتاؤں کے تعارف کی زبان کے طور پر جانتی ہے جو کہ چار ہزار سال سے زائد عرصے سے ہندوستان کی غالب زبان رہی ہے۔ دنیا کے ادب میں سنسکرت کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔‘‘

(ایضاً، ص15)

سنسکرت زبان کو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں شمار کیا جاتاھے اور اس میں مشابہ الفاظ آریائی زبانوں میں کثرت کے ساتھ موجود ھیں اور اس زبان سے ملتے جلتے بھت سے الفاظ دوسری آریائی زبانوں میں بھی دیکھنے کو ملتے ھیں اس زبان کی اھمیت وعظمت کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا رھاھے اور یہ کھنا ھرگز بھی غلط نھیں ھوگا کہ ھندوستان کے ثقافتی ورثے کی جڑیں سنسکرت زبان ھی میں پیوست ھیں اور بغیر اس کے ھم اپنے تھذیبی ورثے کی درست قدرو قیمت کا تعین نھیں کر سکتے ھیں۔

سنسکرت زبان کو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس میں مشابہ الفاظ آریائی زبانوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں اور اس زبان سے ملتے جلتے بہت سے الفاظ دوسری آریائی زبانوں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اس زبان کی اہمیت وعظمت کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور یہ کہنا ہرگز بھی غلط نہیں ہوگا کہ ہندوستان کے ثقافتی ورثے کی جڑیں سنسکرت زبان ہی میں پیوست ہیں اور بغیر اس کے ہم اپنے تہذیبی ورثے کی درست قدر و قیمت کا تعین نہیں کر سکتے ہیں۔

سنسکرت فارسی دراصل آریوں کی زبان ہے سنسکرت اور اوستا آریوں کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے اور آریائی ثقافت اور مذہب انھیں دو زبانوں میں لکھے

جاتے رہے ہیں اس لیے آریوں میں سنسکرت اور اوستا کو بہت ہی معزز، بلند اور مقدس مقام حاصل ہے فارسی زبان کے اس گہرے علم کے علاوہ سنسکرت کو نہ جاننا مشکل تھا جو کہ قدیم فارسی کی بہن ہے سنسکرت زبان ایشیا کی زبانوں میں سب سے زیادہ با اثر اور مروجہ فارسی زبان کی جڑ بھی ہے ان دونوں زبانوں کا آپس میں بڑا گہرا اور ہمہ گیر تعلق رہا ہے جہاں تک ہندوستان میں زبانوں کے فروغ و رواج کا سوال ہے تو آج ہم جس ہندی یا ہندوستانی زبان کی بات کرتے ہیں اس کی ابتدا جس کھڑی بولی سے ہوئی ہے اس میں سنسکرت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا بھی بڑا تعاون رہا ہے عام بول چال میں فارسی زبان کی لفظیات کا استعمال بڑی روانی کے ساتھ کیا جاتا ہے اگر ہمیں ان میں سے کسی زبان میں وہ لفظ نہیں ملتا جس کی ہم تلاش کر رہے ہیں تو اس سلسلے میں سنسکرت زبان ہماری مدد کرے گی۔ ماضی میں سنسکرت زبان میں لکھی گئی بے شمار کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا مذہبی صحیفوں کے ترجمے بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوئے ہیں جب دنیا کے مختلف معاشروں اور دنیا کی مختلف زبانوں نے ایک دوسرے کے قریب آنا شروع کیا تب ان زبانوں کے اثرات ایک دوسرے پر مرتب ہونے لگے اور یوں ایک زبان کا اثر دوسری زبان کے ذخیرہ الفاظ اور ساخت میں دیکھا جانے لگا سنسکرت اور فارسی ایک دوسرے سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی ہیں شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں کا تعلق آریائی زبان سے ہے دونوں زبانوں کی اصل ایک ہے۔

محققین کا کہنا ہے کہ موجودہ نسل کو سنسکرت اور فارسی کے قدیم لسانی رشتوں سے واقف کرانا بہت ضروری ہے نئی نسل ان دونوں زبانوں کے قدیم رشتوں کے تعلق سے بہت کم واقف ہے فارسی اور سنسکرت زبانوں کے ماہرین ان زبانوں کو قریب لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فارسی زبان کی سب سے اہم اور قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنی تمام تر جدت کے باوجود بھی پرانی زبان کی تمام خصوصیات کو محفوظ اور خود میں سموئے ہوئے رکھا ہے اس زبان کا ہندوستان کے ہر دور اور ہر زمانے سے گہرا تعلق رہا ہے اس لیے اس نے پرانی سنسکرت، قرون وسطی کی پراکرت اور نئی ہندوستانی زبانون کے الفاظ اور محاورات کو اپنایا ہے اور بہت سے ترجمے بھی سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں ہوئے ہیں جو ان دونوں زبانوں کی اہمیت وافادیت کو جاننے اور سمجھنے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر

> **ماضی میں سنسکرت زبان میں لکھی گئی بے شمار کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا مذہبی صحیفوں کے ترجمے بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوئے ہیں جب دنیا کے مختلف معاشروں اور دنیا کی مختلف زبانوں نے ایک دوسرے کے قریب آنا شروع کیا تب ان زبانوں کے اثرات ایک دوسرے پر مرتب ہونے لگے اور یوں ایک زبان کا اثر دوسری زبان کے ذخیرہ الفاظ اور ساخت میں دیکھا جانے لگا۔**

میں فارسی ترجمے کی روایت کا آغاز مغلیہ سلطنت کے عہد میں شروع ہوا سناتن دھرم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کا یہ سلسلہ طول وطویل زمانے تک قائم رہا اور آج بھی وقتاً فوقتاً اس کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں ترجمہ ایک فن ہے اس فن میں ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کو گرنتھوں میں اتنی دلچسپی تھی کہ انہوں نے سنسکرت کی بے شمار کتابیں فارسی میں ترجمہ کروائی جن میں سب سے زیادہ مشہور مہابھارت، رامائن اور اتھروید ہے اس کے علاوہ گیتا، سنہاسن بتیسی، اور یوگ وششٹھ کا بھی ترجمہ فارسی میں کیا گیا ہے جو اپنے زمانے میں خاصا مقبول تھا۔

''مسلمانوں کا ذوق جستجو اور مذاہب کے مطالعے کا شوق پوری تاریخ میں ہر عہد میں پایا جاتا ہے ہندو مذہب کے بارے میں جاننے اور ہندؤں کی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی کوشش ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں مسلسل پائی جاتی ہے مغلیہ عہد کے دور ہمایونی میں محمد گوالیاری نے سنسکرت کی مشہور تصنیف امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ بحرالحیات کے نام سے کیا اس کتاب میں برہمنوں کے مذہبی خیالات وعقائد پر مباحث ہیں اور یہ کتاب مخلوطے کی شکل میں برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔''

(فارسی اور سنسکرت کے باہمی مطالعہ کی ہندوستانی روایت، ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، ص 5)

ذیل میں کچھ ایسے الفاظ کی فہرست پیش کی جارہی ہے جو کہ سنسکرت زبان کے لفظ ہیں لیکن تھوڑے حیرت انگیز حد تک فارسی زبان کے الفاظ سے شباہت رکھتے ہیں یا پھر کہہ سکتے ہیں کہ بہت ہی تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ فارسی زبان میں بھی اسی طرح اور اسی معانی میں رائج ہیں:

فارسی	سنسکرت
شغال	سگالہ
شتر	اشٹر
اسپ	اسوا
گاو	گئو
پسر	پترا
برادر	بھراتر
مادر	ماتر
پدر	پتر
خشک	تشک
سخت	شکت

کچھ حوالے پیش کیے جارہے ہیں جو اس بات کے شاہد ہیں کہ دونوں زبانوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے:

فارسی زبان میں 'پنج' کا مطلب نمبر پانچ ہے سنسکرت زبان میں ایک ہی لفظ 'پنچ' ہے فارسی اور سنسکرت میں دوسرے الفاظ

(مطالعہ تطبیقی واژگان مشترک زبان سانسکرت و فارسی، فرزانہ اعظم لطفی، ص 280)

فارسی	سنسکرت
یک	ایک
دو	دوی
سہ	ترياہ
چہار	چتر
پنج	پانچکا
شش	سس
ہفت	سپتا
ہشت	استہ
نہ	نوم
دہ	دزا

مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ فارسی اور سنسکرت ایک دوسرے سے بہت گہری مشابہت رکھتی ہیں بلکہ اگر قدیم فارسی اور قدیم سنسکرت کا آپس میں موازنہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ دونوں کی بنیاد یا اصل ایک ہی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دونوں زبانیں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں اور ان کے صرف الفاظ ہی نہیں ملتے ہیں بلکہ مزاج اور انداز بھی تقریباً ایک ہی جیسا ہے۔

■

Rani Hafeez
Research Scholar Arabic & Persian Dept.
University Of Allahabad
Allahabad - 211002
Cell.: 9628947998
ranihafeeaz123@gmail.com

آفرین رضا

ادبِ اطفال

تخلیقی تقاضے اور بچوں کی نفسیات

اردو میں بھی ادب اطفال کا باقاعدہ آغاز عہدِ سرسید میں ہوا۔ اس سلسلے میں اچھی بات یہ ہوئی کہ بچوں/بچیوں کے ادب کی افادیت کا اندازہ ہوا تو اس وقت کے تمام اہل دانش، ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ ادبیات ولسانیات، اور شعراوادبا کے علاوہ مصلحین زبان وادب کے ساتھ ساتھ مصلحین قوم وملت نے بھی اس کے فروغ میں طبیعت سے دلچسپی لی۔ اس طرح انیسویں صدی میں اردو میں ادبِ اطفال نے ایک واضح شکل وصورت اختیار کرلی اور مختصر عرصے ہی میں وقت اور حالات کے تقاضے کے مطابق بچوں کو ذہنی غذا فراہم کرنے لگا۔ ان کی ذہن سازی میں روشن خیالی پورے آب وتاب کے ساتھ شامل ہوگئی۔ 1857 سے پہلے کے ہندوستان اور اس کے معاشرے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کس کس طرح کی بدعقیدگی اور توہمات کا شکار تھا اوراسے ختم کرنے کے لیے کس نوعیت کے تدبر سے بھرپور ادب اور ادب اطفال کی ضرورت تھی۔ اس صورت کو بدلنے اور قوم وملت کے بچوں کو صحت مند علمی غذا فراہم کرنے کے لیے ڈپٹی نذیراحمد، الطاف حسین حالی، مولوی ذکاءاللہ، محمد حسین آزاد اور مولوی اسماعیل میرٹھی وغیرہ نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے بچوں کے لیے نہایت مفید اور دلچسپ ادب تخلیق کرنے کے ساتھ، عمدہ قسم کی نصابی کتابیں بھی تیار کیں۔ اسماعیل میرٹھی کی نصابی کتابیں ہوں کہ محمد حسین آزاد کی نصابی کتابیں، ان سبھی میں روشن خیالی، علمی استدلال اور زبان وبیان کی لیاقت پیدا کرنے والی ایسی خوبیوں کو شامل کیا گیا جنھوں نے بچوں کے ذہنوں کو روشن کردیا۔ ایک طرف تو یہ سب کچھ ہوا اور دوسری طرف مولانا محمد حسین آزاد نے 'نصیحت کا کرن پھول' (1864)، ڈپٹی نذیراحمد نے 'مراۃ العروس' (1869) مولانا الطاف حسین حالی نے 'مجالس النساء' (1874)، مولوی کریم الدّین نے 'تعلیم النساء' (1874) جیسی اہم اور دلچسپ کتابیں لکھ کر اردو معاشرے کو جمود سے نہ صرف آزادی دلائی بلکہ تازگی وحرارت بھی بخشی۔ یہ کتابیں بچوں اور بچیوں کی اخلاقی، ذہنی، نفسیاتی اور معاشرتی تربیت کے اس نظام کو پیش کرتی ہیں جس پر مشرقی تہذیب کا مکمل اثر ہے ساتھ ہی یہ کتابیں ان مسائل کو بیان کرتی ہیں جو اس وقت کی زندگی کا بہت ہی اہم اور سنجیدہ موضوعات تھے۔ گویا یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ اس وقت کے دانشوروں نے اپنے چشم تصور سے مستقبل کے ہندوستان کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا سرسید کی فکری قیادت میں ان کے مذکورہ معاصرین نے تعلیم کو اصلاح حیات کا ذریعہ بنایا۔ سرسید اوران کے رفقا نے ادبِ عالیہ کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کو بھی زندگی کی تازہ ہوا کے جھونکے کا خوشگوار لمس بخشا۔ اس طرح سرسید تحریک سے ایک منجمد معاشرے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ نتیجتاً نظم ونثر پر مشتمل متعدد نصابی اور غیر نصابی کتابیں بچوں کے لیے لکھی گئیں۔ تراجم کے ذریعے بھی بچوں کے ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابتدائی دنوں میں بچوں کے ادب کی تخلیق میں ان کی عمر اوران کے ذہنی تقاضوں کے مطابق زبان اورنفسیات کا لحاظ کم ہی رکھا گیا۔ جب کہ ماہرین لسانیات ونفسیات اس امر پر متفق ہیں کہ بچوں کی لسانی اور نفسیاتی دلچسپیاں بالغوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ بچپن سے بلوغت کے دوران ان کی جذباتی، ذہنی، معاشرتی، تہذیبی اور جسمانی نشوونما بالغوں کے مقابلے نہ صرف یہ کہ تیز رفتار ہوتی ہے بلکہ ان میں کسی بات کو رد کرنے کے مقابلے قبول کرنے کی صفت بھی بہت توانا ہوتی ہے۔ لہذا بچوں کا ادب لکھتے وقت، نفسیات ولسانیات کے ان اصول و نظریات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی جو بچوں کی نفسیات اور زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔

اکثر لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بچوں/بچیوں کے لیے لکھنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک اچھا خاصا مشکل فن ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ بچوں کا ذہن سادگی، رویہ نزاکت اوراس کی فطرت معصومیت سے تعبیر کی جاتی ہے۔ وہ کسی قسم کے مکر، بغض، تعصب اور احساسِ گناہ سے نابلد ہوتے ہیں۔ ان کی نفسیات بھی غیر پیچیدہ ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بالغوں کے مقابلے بچوں کے ذہن ودل میں تحیر وتجسس زیادہ ہوتے ہیں۔ لہذا بچے کی صفتوں اور خصلتوں کو دیکھتے ہوئے ادب تخلیق کرنا مناسب ہوتا ہے حال آں کہ یہ انتہائی نازک اور دشوار کن مرحلہ ہے۔ اس کی دشواری کی ایک وجہ غالبًا یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ادب اطفال نہ صرف بچوں کو انبساط پہنچانے کے لیے خلق کیا جاتا ہے بلکہ اس سے بچوں کی تربیت نیز

شخصیت سازی کا فریضہ بھی انجام دیا جاتا ہے۔ گویا نظموں غزلوں اور قصے کہانیوں کے ذریعے انھیں خیر و شر میں تفریق، صحیح و غلط میں تمیز، محبت و اخلاق کی شناخت، سچ جھوٹ کا امتیاز کرانا ہوتا ہے لیکن بہت احتیاط سے، کیونکہ بچے اضطراری فطرت اور سیمابی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کی طبیعت چنچل ہوتی ہے، لہٰذا ان کے بھٹکنے کا بھی خدشہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک بالغ اور باشعور فرد کے بالمقابل ایک نابالغ اور نیم پختہ ذہن کے لیے دلچسپ، پر کشش، بامقصد، بامعنی، سادہ اور فصیح ادب تخلیق کرنا لازم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کو سماج میں مہذب شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے لیے مناسب شخصیت سازی اور صحیح سمت میں نشوونما کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی بنیاد بچپن میں ہی رکھ دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ مقاصد کی تکمیل کی غرض سے ماہرین تعلیمی نفسیات نے بچوں کی دلچسپی کی جامع اور مسلسل تشخیص کرتے رہنے پر زور دیا ہے۔ کیونکہ بچوں کا ذہن کورا کاغذ ہوتا ہے۔ نوعمری میں اس پر جو تحریر ہو جائے وہی نقش ہو جاتا ہے، بڑی مشکل سے مٹتا ہے۔ معاشرے میں انسانی سرگرمیوں، خواہشوں، امنگوں اور فرائض کا ایک بڑا حصہ بچوں کی ضروریات اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے متعلق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب ان ذہنی اور روحانی ضروریات کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ لہٰذا بچوں کا ادب ان کی دیگر بنیادی ضرورتوں کی طرح ان کی ذہنی اور جسمانی عمر اور ان کے مزاج کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ ادب ان کے لیے صحت مند تفریحی ذریعہ بھی ہو سکتا ہے اور روشن مستقبل کا ضامن بھی۔ بچوں کے ادب کی مخصوص ضروریات اور اس کے تقاضوں کا علم ہمیں نفسیات کے ذریعے ہوتا ہے۔ جہاں عمومی نفسیات بالغ انسانوں کا مطالعہ کرتی ہے وہیں بچوں کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کے لیے نفسیات اطفال (Child Psychology) اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ بچپن سے بلوغت کا دور اکتسابی دور ہوتا ہے لہٰذا تعلیمی نفسیات (Educational Psychology) بھی بچوں کے موضوعات و معاملات اور مسائل کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ بچوں کے ادب کے تعلق سے مذکورہ نوعیت کی نفسیات کے اصول و نظریات کا لحاظ ضروری ہے۔ ساتھ ہی یہ امر بھی لازم ہے کہ بچوں کا ادب خلق کرتے وقت تخلیقات کے مقاصد کو بھی یاد رکھنا مفید ہوتا ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ بچوں کے ادب کی ادبی، لسانی اور نفسیاتی ضروریات کو ذہن میں رکھنا چاہیے ساتھ ہی یہ تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے کہ بچوں کا ادب، ان کی دلچسپیوں اور اقدار و ضروریات کا مظہر ہو تبھی ان کی شخصیت کا ہمہ جہت فروغ اور مناسب تعمیر کا امکان روشن ہوگا۔

ہندوستان اور عالمی سطح پر تعلیمی نظام کی بنیاد، سماجیات، اقدار، نفسیات، فلسفہ اور لسانیات پر رکھی گئی ہے۔ سائنسی مضامین اور منطقی طرز فکر اس پر مستزاد ہیں۔ بچوں کی مخصوص ضروریات اور ان کی گوناگوں دلچسپیوں کو نفسیات کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ ہم جن اقدار کو بچوں میں منتقل کرنا چاہتے ہیں، ان کی کردار سازی اور ذہن سازی جس نہج پر کرنا چاہتے ہیں اس کی تشکیل و تکمیل، سماجیات، لسانیات، فلسفہ اور نفسیات کی آمیزش ہی سے ممکن ہے اور اسی آمیزش سے بچوں کی شخصیت سازی سائنسی طور و طریق سے ممکن ہو پاتی ہے۔ علم نفسیات نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب بچوں کی نفسیات سے متعلق جدید طریقہ اختیار کیا تو اس کو نشوونما کی نفسیات یعنی Developmental Psychology سے منسوب کیا گیا۔ نشوونما کی یہ نفسیات اس امر کو واضح کرتی کہ عہدِ طفلی کے مختلف مراحل سے متعلق کسی بچے کے رویے کے صرف مختلف علاقوں یا شعبوں کا مطالعہ کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے کردار کی خصوصیات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے اسباب کا مطالعہ اس کی فہم میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ نفسیات کی اس نئی شاخ کی جدید تحقیقات نے ہمیں بچوں کی مخصوص ضروریات اور تقاضوں سے متعلق حساس بنایا اور بیدار کیا ورنہ اس سے قبل انھیں ایک Individual Human Entity یا ایک آزاد فرد نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جب بچوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا اس کے بعد ہی سماج میں ان کے حقوق سے متعلق بیداری آئی۔ جدید نفسیات کی تحقیقات ہی کی دین ہے کہ بچوں کو سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا۔ اس نئے نفسیاتی محاکے سے بچوں کے خلاف جرائم اور بچوں میں جرائم کی نفسیات کے اسباب بھی تلاش کیے گئے۔ نتیجتاً بچوں کی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تعلیم و تربیت کے منصوبے وضع کیے گئے اور Child Centred Education یعنی 'طفل مرکوز تعلیم' تعلیمی نظام قائم کیا گیا۔ بچوں کے نصابات اور ان کی درسی کتب نیز ان کے اسباق بھی جدید نفسیاتی اصولوں پر تیار کیے گئے۔ Extra-Curricular Activities کو بھی آموزش یا تعلیم و تربیت کی اہم سرگرمی تسلیم کیا گیا۔ شعوری اور لاشعوری طور پر بچوں کی درسی اور معاون درسی کتابوں میں شامل مواد کی طرز پر یا ان سے تحریک پا کر ان ہی خطوط پر بچوں کے ادیبوں نے بڑی حد تک ادب تخلیق کرنا شروع کیا۔ اردو کے ضمن میں یہ کہنا بیجا نہیں ہوگا کہ اردو میں بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت اسکولوں میں مدرس و معلم کی ہے جو بچوں کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی تو رکھتی ہے لیکن آموزش و تربیت کے جدید تقاضوں کے مطابق بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے یا نصابی کتب تشکیل دینے میں بڑی حد تک بیدار نظر نہیں آتی۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ اردو کے مقابلے میں ملک و بیرون ملک کی دیگر زبانوں میں موجود بچوں کا ادب فطرت اور سائنس سے زیادہ قریب نظر آتا ہے، غالباً اسی بنیاد پر ان ترقی یافتہ زبانوں میں موجود ادب اطفال کی ثروت مندی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کے ادب کے رسائل حتی کہ سرکاری اداروں کی کتابوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ، افادیت و معنویت اور دیدہ زیبی کا لحاظ رکھتے ہوئے شائع کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک یا معاشرے میں نفسیاتی اصولوں کا لحاظ کیے بغیر بچوں کا ادب تخلیق کرنے کا تصور بھی محال ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بچوں کی بڑھتی عمر کے لحاظ سے ان کی دلچسپی کی نوعیتیں بدلتی جاتی ہیں۔ بچوں کی دلچسپی کے مسائل کو ماہرین نفسیات ان کی عمر کے ارتقائی مراحل کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ بچوں کے اشتیاق، ان کی رغبت، ذہنی سطح اور ان کے مزاج کا مدار ان کی عمر کے ان ہی ارتقائی مراحل پر منحصر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے سنجیدہ ادیبوں کے پیش نظر بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے ضمن میں جو چیلنجز درپیش ہوتے ہیں ان میں اس ادب کا قاری، سامع یا ناظر کی دلچسپی پہلی شرط ہے۔ بچوں کے ادب پر غور و فکر کرنے والے اکثر اس پہلو پر بہت زور دیتے ہیں لیکن عام طور پر اس کا نہایت سطحی مفہوم لیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً مواد کو بہت آسان بنا دینا، لطیفے یا چٹکلے اور ہلکی پھلکی باتیں کرنا یا اسے بھوت پریت کی ہیجان انگیز تصویروں، آوازوں یا مناظر کو استعمال کرکے مصنوعی طریقے سے دلچسپ بنا دینا وغیرہ۔ بچوں کی دلچسپی ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جو محرکات (Motivation) کا باعث بنتا ہے۔ علم نفسیات کے مطابق داخلی تحریک دلچسپی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اور اس کے بغیر کسی بچے میں مطلوبہ تبدیلی آ ہی نہیں سکتی۔ کسی بچے کے رویے، کردار اور اس کی شخصیت میں مطلوبہ تبدیلی داخلی تحریک اور دلچسپی

ہی کی مرہونِ منت ہے۔نفسیات کی رو سے دلچسپی کا انحصار، ارادی توجہ (Voluntary Attention)، ادراک اوراحساس (Feeling) پر ہے۔اس اعتبار سے دلچسپی کی یہی تین شرطیں اور تین قسمیں ہیں۔

بہرحال! بچوں کے ادب کوثقیل زبان میں خشک نصیحتوں یاپندونصائح کاہدایت نامہ نہیں ہونا چاہیے،لیکن یہ طریقہ بھی مفید نہیں ہے کہ ثقافت واخلاقیات کے نام پر ان کوپیپل کے بےثمر درخت کی چھاؤں میں بٹھادیا جائے۔ بچوں کی دلچسپیاں متنوع ہوتی ہیں،اس لیے ضروری نہیں کہ تفریحی طور پر پڑھنے کے لیے بچوں کو جو کچھ فراہم کیا جائے، وہ محض افسانوی یا تخئیلی ادب تک محدود ہو۔ سچے تاریخی واقعات اور سائنسی ایجادات پر مشتمل اسباق، عصری موضوعات، ثقافتی وتہذیبی اور اخلاقی قصے،سماجی علوم کے مضامین،فطرت وحقیقت پرمبنی شاعری،منطق و ذہانت والی کہانیاں بھی اس زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔بچے ان کتابوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں،جن میں انسانی تجربات اور ارتقا کا عکس ہو۔ان کتابوں میں جو داخلی کشش ہوتی ہے، وہی بچوں کی توجہ مبذول کرنے کا سبب بنتی ہے۔

یہ عرض کیا گیا کہ بچوں کی دلچسپی کے مسئلے کو ماہر نفسیات ان کی عمر کے مدارج کے اعتبار سے دیکھتے ہیں کیونکہ بچوں کی ذہنی سطح اوران کے مذاق ومزاج کا انحصار ان ہی مدارج پر ہوتا ہے۔ان مدارج کا تعلق انسانی نشوونما کی نفسیات (Developmental Psychology) سے ہے۔بچوں کے ادب کاہدف (Target Group) سات سے چودہ برس کی عمر کے بچے ہیں۔اس ادب کے ضمن میں بچوں کی جسمانی نشوونما کے بجائے ذہنی نشوونما (Mental Growth)،معاشرتی نشوونما (Social Growth) اور جذباتی نشوونما (Emotional Growth) کے مختلف مدارج کا لحاظ رکھا جاتا ہے جس سے عمر کے مختلف ادوار میں بچوں کی دلچسپیاں، رجحانات اورصلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بچوں کے ادب کی مناسبت سے اس Target Group کوتعلیمی نفسیات کے ماہر تین درجات میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا درجہ سات آٹھ برس کی عمر کے بچوں کا ہے جوفطری طور پر بے انتہا متجسس ہوتے ہیں۔ دوسرا درجہ نو سے گیارہ برس کی عمر کے بچوں کا ہے جو نہایت فعال ہوتے ہیں۔تیسری منزل بارہ سے چودہ برس کے نیم بالغوں کی ہوتی ہے۔ اس منزل پرآ کران کے خیالات اور جذبات میں بڑی حد تک ٹھہراؤ نظر آنے لگتا ہے۔

سرِدست یہ عرض کرنامناسب ہوگا کہ نفسیات' بچوں کے جذبات واحساسات سے بھی بحث کرتی ہے جو بچوں کے کردار کی تشکیل اوران کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔بچوں میں محبت،خوف اور غصے کے جذبات بڑوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ بے راہ روی کی وجہ سے بچوں میں انانیت،نفرت،غصہ اور دیگر جذباتی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جو،ان کی شخصیت کے ہمہ جہت فروغ یعنی ان کی شخصیت سازی کومنفی انداز میں متاثر کر

بچوں کے ادب کی مناسبت سے اس Target Group کوتعلیمی نفسیات کے ماہر تین درجات میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلادرجہ سات آٹھ برس کی عمر کے بچوں کاہے جو فطری طور پربے انتہامتجسس ہوتے ہیں۔ دوسرا درجہ نو سے گیارہ برس کی عمرکے بچوں کاہے جو نہایت فعال ہوتے ہیں۔تیسری منزل بارہ سے چودہ برس کے نیم بالغوں کی ہوتی ہے۔ اس منزل پر آکر ان کے خیالات اور جذبات میں بڑی حد تک ٹھہراؤ نظر آنے لگتا ہے۔

سکتی ہیں لیکن مناسب تربیت اور مثبت ومفید ادب بلکہ نصاب سے ان اوصاف پرقابو پا کرانھیں تعمیری رخ پر ڈالا جا سکتا ہے۔ جذباتی ناآسودگی سے بچوں کی شخصیت توازن سے محروم ہوجاتی ہے۔ بچوں میں صفتِ اخذ و قبول،تعمیر پسندی،اپنے ہم جنسوں سے مطابقت،خودپسندی، رقابت ودوستی،نقل،تقلید،فرماں برداری،ان کی گونا گوں دلچسپیاں اور ان کا تخیل وتصور وغیرہ جیسے امور نفسیاتی مطالعات کا حصہ ہیں۔یہ مطالعے ہمیں بچوں کی ان مخصوص ضرورتوں، تقاضوں، صلاحیتوں اور مسئلوں سے متعارف کراتے ہیں جن کا براہ راست تعلق بچوں کے ادب کی تخلیق سے ہے۔ بچوں/ بچیوں کی پرورش اور تربیت کا معاملہ بہت نازک اورسنجیدہ ہوتا ہے۔لہذا ان کی آموزش اور تہذیب کاری کے مقصد سے تخلیق کیا جانے والا ادب بھی احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ان کے لیے ادب کی تخلیق،نرمی اور شفقت سے برتے جانے والے مفید و کارآمد موضوعات، مانوس الفاظ والی آسان زبان اور پرکشش اسلوب کے ذریعے کی جانی چاہیے۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ان کا ادب ان کی عمر، پسند اورنفسیات کے مطابق تخلیق کیا گیا ہے یانہیں؟ اس نقطۂ نظر سے بچوں کے ادب پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اکثر و بیشتر اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادبِ اطفال کے بیشتر ذخیرے میں ان کی عمر طبعی، ذہنی عمر، پسند، دلچسپی، افادیت اور نفسیات کے مطابق موضوعات یا زبان کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ ماہرین تعلیمی نفسیات کا یہ بھی کہنا ہے کہ بچوں کے ادیب یانصاب سازکوفن پارہ تخلیق کرتے یا نصابی کتب تیار کرتے وقت چند اہم امور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔سب سے پہلے اس پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ وہ ادب کن کے لیے تخلیق کر رہا ہے وہ کس عمر کے ہیں؟ ان کی ذہنی صلاحیت کیا ہے؟ ان کی سماجی صورت حال کیسی ہے؟ پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس ادب سے بچوں کی اخلاقی تربیت، ذہنی نشوونما،اخلاص ومحبت،انسانی ہمدردی، ایثار وقربانی اورانسانیت وقومیت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں کہ نہیں؟ نیز یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ کیا وہ ادب بچوں کی زندگی میں درپیش مسائل ومشکلات کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرے گا کہ نہیں؟ علاوہ ازیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ادب،ادبیت کے علاوہ تہذیبی اورسائنسی مزاج اورتاریخی وسماجی حقیقت پر مبنی ہے کہ نہیں؟ کیوں کہ یہی بچے مستقبل میں سماج وقوم کا معمار اورافزائش نسل کا ذریعہ بنتے ہیں۔اس لیے بچوں کی نفسیات،ان کے مسائل اوران کے حقوق کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش کی جانی چاہیے تاکہ ان کے دل ودماغ میں حسد،نفرت،غصہ،جھوٹ،چوری،ظلم،ضد،سرکشی،بغاوت، بے راہ روی، تعصب، خوف اورتشدد میں سے کوئی بھی تخریبی جذبہ پیدا ہونے کے بجائے مثبت،مفید،مہذب اورتعمیری اور انسانیت پرمبنی جذبات پیدا ہوں کیوں کہ تعلیم وتربیت کا حتمی مقصد یا Ultimate Goal طالب علم یا آموزگار کو ایک دانشمند،ایماندار،قوم پرست، غیرت مند،خوش اخلاق، مستقبل پسند اورمہذب شہری بنانا ہے۔

■

Afreen Raza
Research Scholar
Centre for Advanced Study
Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (UP)
afreenraza205@gmail.com

عاصی سعید کی مزاح نگاری

راشد جمال فاروقی

میراوطن عمری کلاں، ضلع مراد آباد (یوپی) ایک قدیم تاریخی بستی ہے۔ آزاد عمروی، خاموش عمروی، صہیب فاروقی، کنور بے چین، ظفر مراد آبادی، مولانا فخر الحسن اور پروفیسر خورشید الاسلام بھی اسی خاک سے اٹھے اور چھا گئے۔ دو ہستیاں اور ہیں جن پر اس بستی کو فخر ہے۔ سابق پرنسپل، پبلک انٹر کالج، نعمان احمد فاروقی اور پبلک انٹر کالج کے بنیاد گزار جناب سعید احمد عرف منے میاں جو بعد میں عاصی سعید کے قلمی نام سے جانے گئے۔ آخرالذکر دونوں ہستیوں نے عمری کو علم جیسی بیش بہا دولت سے مالا مال کیا اور اپنے فطری وجدان کو یکسر فراموش کر دیا۔ نعمان احمد صاحب میں اعلیٰ پایے کی نثر لکھنے کا جوہر تھا جو کالج کے انتظامی امور کی نذر ہوا۔ عاصی سعید کو عمر کے آخری پڑاؤ پر پہنچ کر اپنے بے پناہ تخلیقی رجحان کا علم ہوا۔ جس کی تفصیل آگے آیا چاہتی ہے۔

عمری کے رئیس اعظم اور حکیم اجمل خاں کے شاگرد عزیز حکیم نذیر کی دو اولادیں تھیں۔ بیٹی جمال آرا جن کا عقد احمد جمیل فاروقی سے ہوا جو دہلی کی معروف درسگاہ اینگلو عربک اسکول میں استاد تھے۔ ان کے فرزند اسعد جمیل فاروقی IPS افسر ہوئے۔ سعید احمد عرف منے میاں حکیم صاحب کے فرزند تھے۔ ان کی پیدائش 1920 میں ہوئی 1944 میں ایم اے کے بعد LLB کرلیا تو انھیں بہت بڑی ملازمتوں کے دعوت نامے آنے لگے۔ لیکن ملازموں کی فوج چھوڑ کر انھیں کون ملازمت کی اجازت دیتا۔ لہٰذا انھیں زمین داری سنبھالنی پڑی۔ اعلیٰ تعلیم اور بہترین تربیت کا اثر تھا کہ انھوں نے کھیتی میں ٹکنالوجی کا اس وقت استعمال شروع کیا جب یہ تصور ہی عنقا تھا۔ جرمن ٹریکٹر Massey Ferguson، تھریشر، آرا مشین، چکی، تیل نکالنے کی مشین، کریشر وغیرہ کامیابی سے چلا کر عمری والوں کو اختراع پسندی کا درس دیا۔

اپنے زمانے کے بہت پڑھے لکھے دانشور ہونے کی وجہ سے منے میاں کے یہاں تعقل پسندی کے اجزا شروع سے ہی موجود تھے۔ بس فرصت کی کمی تھی۔ لہٰذا عمر کے آخری دنوں میں انھیں انکشاف ہوا کہ اندرون میں ادب جیسا کچھ کلبلا رہا ہے۔ مزاحیہ مضامین تحریر کیے جن میں طنز کا پہلو خفیف اور مزاح کا تڑکا تیز تر تھا۔ آل احمد سرور، خورشید الاسلام رالف رسل سے تعلقات تھے۔ خورشید الاسلام اور رالف رسل لندن سے ان کے یہاں آکر مہمان بھی ہوئے ہیں۔ ایسے علمی پس منظر کا تقاضا تھا کہ انھوں نے مضامین رسائل کو ارسال کرنا شروع کر دیے۔ لیکن نیا نام ہونے کی وجہ سے مدیران کرام نے انھیں توجہ سے نہیں نوازا۔

مجھ سے اکثر جھنجھلا کر پوچھتے تھے ''یہ مدیر لوگ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ فلاں مضمون میں یہ خرابی ہے'' میں انھیں سمجھاتا کہ ہر رسالے کا مزاج اور معیار دوسروں سے جدا ہوتا ہے۔ آپ کی تحریر کس رسالے کو بھیجی جائے یہ مسئلہ ہے۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ ''ادیب کے بڑھاپے کے ساتھ اس کا ادب جوان ہوتا ہے'' عمری جیسی دیہاتی بستی میں وہ قدردانی کو ترستے ہی رہ گئے۔ ہر تخلیق کار کو قاری یا سامع کی تلاش تو رہتی ہی ہے۔ میرا ایک شعر

نئی غزل اک بیاض میں پھڑ پھڑا رہی ہے
سماعتوں کے فراق میں کلبلا رہی ہے

کئی بار مضحکہ خیز صورت حال بھی پیدا ہوجاتی تھی۔ عاصی سعید اب ان کا قلمی نام تھا لیکن کوئی بھی ان کی شخصیت کے ان نئے اوتار کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر ایک دن سنا گیا کہ وزیر آغا نے اوراق کے لیے عاصی سعید سے ان کے مضامین منگائے ہیں۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور انھیں بے توجہی کی شکایت کا موقع بھی نہیں ملا۔ انھوں نے مضامین کے انبار لگا دیے رسائل ان سے مضامین طلب کرتے۔ تعریف و توصیف کا سلسلہ چل نکلا۔ آل احمد سرور۔ اسلوب انصاری، فکر تونسوی، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، نریندر لوتھر، دلیپ بادل، احمد جمال پاشا، دلیپ سنگھ اور سعادت علی صدیقی وغیرہ کے حوصلہ افزا خطوط سے تحریک پا کر عاصی ان تحریروں کو کتابی شکل دینا چاہتے تھے، لیکن کاتبوں کی ناز برداریوں کے لیے تیار نہیں تھے۔ خود خوش خط لکھتے تھے لہٰذا اپنے ہاتھوں کتابت کر کے مضامین کے تین مجموعے چھپوائے (1) چٹخارے (2) آگ اور پھول (3) ہنسیے۔

یہ کتابیں مزاح اور طنز کے ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ لیکن گلیمر کے اس دور میں ظاہری حسن سے محروم ہیں۔ آئیے چند اکابر کی آرا پر نظر ڈالیں:

''آپ کے مزاح میں ہمدردی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے... مزاح نگاری میں آپ پطرس کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' (وزیر آغا) ''عاصی تمثیل، فنتسی اور مزاحیہ صورت حال سے بہت اچھی ظرافت پیدا کرسکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا آرٹ بیانیہ کا ہے۔'' (احمد جمال پاشا)

خاکہ نگاری میں عاصی بے مثال ہیں۔ گئے وقتوں کے قصباتی بوڑھوں میں ایسے کردار بھی ہوتے تھے جنھیں بچے چھیڑتے اور گالیاں کھا کر بے مزہ نہیں ہوتے تھے۔ ایسے بوڑھے بھی مصنوعی ناراضگی ہی ظاہر کرتے تھے۔ بہ باطن تو وہ خود اس چھیڑ خانی کے منتظر رہتے تھے۔ استاد سیلو ایسا ہی دلچسپ کردار ہے۔ زبان و بیان کی چاشنی، چٹ پٹے مزاح اور عبرتناک سچویشن نے اس خاکے کو یادگار بنا دیا ہے۔

''لمبے ہچکڑی سے بڑھے، گھٹی ہوئی داڑھی، موٹی مونچھیں، چلتے تو کمر جھکنے کے بجائے سینہ آگے کو نکل

آتا، ہاتھ پیچھے کو کھنچ جاتے۔ یعنی خم سیدھے کے بجائے الٹا پڑ گیا تھا... کھاٹ پر پڑے رہتے تھے۔ آنکھوں کا دم کھوپڑی میں آ گیا تھا۔ آنے والوں کے قدموں کی چاپ سن کر ہی کہہ دیتے تھے کہ فلاں آ رہا ہے۔''

''ایسی ہستیاں چشم فلک نے کم ہی دیکھی ہوں گی۔ علوم ارضی وسماوی میں کون ایسا تھا جو استاد کو نہ آتا ہو۔ علم و تجربے میں بے مثال تھے۔ الٰہیات اور نجوم میں دخل تھا۔ اولیائے کرام، پیروں، شہیدوں اور غازیوں کو استاد نے زندگی میں تو نہیں ان کے مرنے کے بعد کئی بار دیکھا تھا۔ جنات اور ہمزاد بھی اپنے تابع کر رکھے تھے۔''

یہ پورا مضمون غروب ہوتے ہوئے تمدن کے تحت گاؤں اور قصبوں کو نگلتے ہوئے شہری ماحول کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ مرغ شریف بھی منفرد مضمون ہے۔ جو گہرے مشاہدے کا غماز ہے۔ ایک معمولی مرغے کے ضمن میں کیا کیا پھلجھڑیاں پھوٹتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

''صورت میں عزرائیل، سیرت میں عزازیل، حوصلے میں اسرافیل... آپ دو دو گول اور تیز چمکیلی آنکھوں کے مالک ہیں۔ جن کے قطر بہت چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن جن کے دائروں میں جہاں بینی اور جہاں فہمی کی بڑی وسعتیں پنہاں تھیں۔ آنکھوں کی سرخی سے معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی شراب خانے سے تشریف لا رہے ہیں۔ یا قتل کیے چلے آ رہے ہیں۔ سرخ کیسر کے کنگورے بہت سی برساتیں کھانے بلکہ نگل جانے کی وجہ سے سیاہ پڑ گئے ہیں۔ رنگ کے سلسلے میں کوئی ایک حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ پنچ رنگ کہا جائے تو آپ کے رنگ اس سے بھی سوا ہیں۔ غرض آپ رنگوں کے عجب معجون ہیں۔ گھر کے بزرگ آپ کی عمر دو سال بتاتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔'' اذانیں دینے سے شبہ ہوتا ہے کہ مسلمان ہیں۔ صبح کو اکثر سردیوں میں ضروری حوائج سے فارغ ہوکر سورج کے سامنے خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ مجوسی ہیں۔ کبھی زمین پر منقار کو شمالاً، جنوباً اور غروباً اس طرح گھسیٹا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ صلیب بنا رہے ہیں۔ الغرض آپ کی مرغیت (بروزن شخصیت) ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ آپ بیک وقت شاعر، صوفی، فلسفی، پیغمبر، پہلوان وغیرہ وغیرہ سب کچھ ہیں آپ کا کردار جلالی اور جمالی دونوں اوصاف کا حامل ہے۔''

ایک مضمون 'بڑے بابو' بھی شگفتگی سے لبریز ہے۔ چند اقتباسات درج ہیں:

''بڑے بابو جی کو فنافی الفائل ہوکر اپنی شخصیت اور انسانیت دونوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے... انھوں نے فائلوں ہی فائلوں میں اپنی دنیا بگاڑ لی اور غالباً دین بھی۔ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ گناہ کرنے کی عمر آئی تھی کہ نوکری مل گئی نیکیاں کرنے کی نوکری میں فرصت نہیں ملتی۔ انھیں نہ جنت ملے گی نہ دوزخ... دنیا میں یہ سخت ٹریننگ انھیں عقبیٰ سیکریٹریٹ کے لیے دی جا رہی ہے وہی ان کا مقام ہوگا اور دوزخیوں وجنتیوں کے فائل ہمیشہ پیٹتے رہنا ان کا کام ہوگا۔''

> **عاصی سعیدکی تحریریں آپ کو گدگدائیں گی۔ آپ کے لبوں کو تبسم عنقا سے نوازیں گی کہ عاصی سعید جینوئن مزاح نگار ہیں دنیا جہاں کی تلخیاں پی کر مسکراہٹیں بانٹنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔**

''ایک اور دردسر'' میں ازدواجی زندگی کے روپ میں مستقل رہنے والے دردسر کا بیان دیکھیں:

''ملا نفیسی نے اپنی کتاب 'امراض جسم' میں پہلے سر کے امراض کو لیا ہے۔ سر میں بھی پہلے دردسر کو۔ اس کی بیس بائیس اقسام لکھی ہیں... لیکن بندہ خدا نے وہ دردسر نہیں لکھا جو دنیا میں بہت سے معقول شوہروں کو اپنی نامعقول بیویوں سے ہوتا ہے۔

عاصی سعید بڑے زمین دار تھے۔ کھیتی کے ماڈرن طریقوں کو برتنے والے اس کاشت کار نے اپنے ذاتی تجربات کی تلخیاں طنز ومزاح کی چاشنی میں ڈبو کر 'پیشوں میں پیشہ کھیتی' اور 'کھیتی بھی میری کھیتی' جیسے زمین سے جڑے مضامین سے اردو طنز ومزاح کو مالا مال کیا ہے۔

عاصی سعید نے اسی زبان کو ادب میں بھی برتا جسے وہ بولتے اور سنتے آئے ہیں۔ ان کے کردار بھی مقامی ہیں اور واقعات بھی روزمرہ سے لیے گئے ہیں۔ کہیں کچھ بناوٹی نہیں کچھ مستعار نہیں۔ ان کے تجربات کی کائنات کا اور چھور نہیں۔ ان کی علمیت مسلّم ہے۔ دردمندی کے عنصر نے عاصی سعید کے یہاں تاثیر اور انبساط کا بہترین امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ وہ رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر (P.M.R.) بھی تھے۔ لہٰذا اس میدان کے جن تجربوں سے گزرے ان کا نمائندہ مضمون 'ڈاکٹر پلس ادیب' ہے۔ اس بے مثال مضمون سے قبل میرے ساتھ گزرا ہوا ایک واقعہ ضرور دلچسپی کا باعث ہوگا۔ میرا بیٹا شاید ایک سال کا رہا ہوگا۔ اس کے کان میں شدید درد اٹھا۔ تڑپ کر رو رہا تھا۔ میں اسے ہومیوپیتھک دوا دلانے کے لیے ان کے پاس لے گیا۔ ان کی خوشی قابل دید تھی۔ فوراً ایک مضمون سنانا شروع کر دیا۔ بچہ بے کل تھا۔ اسے چپ کراتے جاتے۔ وہ جتنی زور سے روتا اس سے زیادہ زور سے اپنا مضمون سناتے چلے گئے۔ میں کیا خاک سن پاتا۔ لیکن انھیں تسلی تھی کہ کوئی سامع تو ملا۔ ہاں تو 'ڈاکٹر پلس ادیب' تو وہ خود بھی تھے۔ ان کے مشاہدات ملاحظہ ہوں:

''ادیب کے لیے ڈاکٹری بھی کرنا ہے ذرا مشکل ناممکن تو نہیں ہے۔ البتہ کوئی مضمون دماغ میں آجائے اور مریض بھی آجائے۔ دونوں بیک وقت تو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ باپ رے باپ ایک روز کا واقعہ ہے۔ یہی مضمون دماغ میں آ رہا تھا آمد ہی آمد ہو رہی تھی۔ آمد علیہ السلام فرشتے آ رہے تھے اور آورد علیہ السلام فرشتوں کو تکلیف دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی... بعض اوقات کوئی مریض سردرد کا حال بیان کرتا ہے ڈاکٹر پلس ادیب ہوں ہوں ہوں کیے جاتے ہیں۔ دھیان کہیں اور ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا دوا تجویز کرتے وقت سردرد کی بجائے گھٹنے درد کی دوا دے دیتے ہیں۔''

اسی قبیل کا مضمون 'زکام' بھی ہے۔ جسے اوراق کے لیے محفوظ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا:

''مضمون زکام مجھے اچھا لگا۔ آپ کے اسلوب میں کرارا پن اور خود روانی ہے۔ امید ہے آپ آئندہ بھی اوراق کے لیے اسی پایے کے مضامین بھیجتے رہیں گے۔''

عاصی سعید کو زندگی نے بہت مصروف رکھا۔ کاشت کاری، کالج کی منیجری مقامی سیاست کے بکھیڑے۔ معالجی وغیرہ نے انھیں اس وقت یہ یاد کرنے کی مہلت دی کہ ان میں بے پناہ تخلیقی لاوا ابل رہا تھا جب ان کے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ لیکن اس کی تلافی انھوں نے یوں کی کہ بے دریغ لکھا۔ خوب لکھا۔ خوب پذیرائی حاصل کی۔ پبلشر اور کاتبوں کو نظر انداز کر کے جیسے تیسے تین کتابیں ہمیں تحفتاً دے گئے۔ جو حظ و انبساط اور خوش ذوقی کا سامان بہم پہنچاتی رہیں گی۔

عاصی سعید کی تحریریں آپ کو گدگدائیں گی۔ آپ کے لبوں کو تبسم عنقا سے نوازیں گی کہ عاصی سعید جینوئن مزاح نگار ہیں دنیا جہاں کی تلخیاں پی کر مسکراہٹیں بانٹنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

■

Rashid Jamal Farooqui
C-6, Thokar No.: 8
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi- 110025
Cell.:9456753096

رشی کمار شرما

آسی رام نگری کی شعری کائنات

شہر بنارس کا شمار دنیا کے قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔ دریائے گنگا کے کنارے آباد یہ شہر زمانہ قدیم سے علم و ادب، تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں دنیا کے ہر گوشے سے لوگ سیر و سیاحت کے لیے آتے رہے ہیں۔ ہندستانی مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے میں اس شہر کا کافی نمایاں کردار رہا ہے شاید اسی لیے غالب نے اس مقدس شہر کو کعبہ ہندستان کہا ہے۔ کبیر، ریداس، جیسے صوفی سنتوں نے جہاں انسان دوستی کا پیغام دیا وہیں بھارتیندو ہریش چندر، جے شنکر پرساد، ہزاری پرساد دویدی، دیوکی نندن کھتری، شیخ علی حزیں، منشی پریم چند جیسے شعرا و ادبا نے پوری دنیا کو قومی اتحاد، حب الوطنی، امن و آشتی، خلوص و محبت کا پیغام دیا۔ اسی شہر سے چند فاصلے پر قصبہ رام نگر آباد ہے۔ اسی قصبے سے منسلک ادبی دنیا کا ایک بڑا نام آسی رام نگری کا ہے۔ بیسویں صدی میں جن شاعروں وادیبوں کو شہرت حاصل ہوئی ان میں آسی رام نگری کا نام قابل ذکر ہے۔ شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی وہ خاص امتیاز رکھتے تھے۔ 'ایک ٹکڑا آسمان' ان کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے اور 'حرف حرف خواب' ان کی شعری کلیات۔ افسانوں کے دو مجموعے 'دیوار پر لکھی ہوئی عبارت' اور 'دل کے پیام' کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کا شمار قادر الکلام شاعروں میں ہوتا ہے۔ اردو کی مختلف اصناف پر انھیں عبور حاصل تھا۔ انھوں نے نظم، غزل، قطعات، دوہے، نعت اور گیت میں بھی طبع آزمائی کی۔ نثر پارے میں افسانہ نگاری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی تخلیقات اردو اور ہندی کی مشترکہ روایت کو مستحکم اور خوبصورت بنانے میں بے حد کارگر ہیں۔ اگرچہ بیسویں صدی کے نمائندہ رسالوں میں ان کی تخلیقات پابندی سے شائع ہوتی رہیں مگر ان کا پہلا شعری مجموعہ 1984 میں 'جاڑے کے دھوپ' کے نام سے شائع ہوا۔ 'حرف حرف خواب' 1992 میں ان کے انتقال کے بعد منظر عام پر آیا۔

آسی رام نگری بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ وہ اپنا ایک مخصوص شاعرانہ لب ولہجہ رکھتے ہیں۔ جدید شاعر ناصر کاظمی کی طرح انھوں نے اپنی غزلوں کے لیے چھوٹی چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا۔ ان کی زبان میں صفائی اور پختگی ہے۔ ان کے کلام میں فنی حسن بھی ہے اور اظہار بیان میں ندرت بھی۔ ان کی غزلوں میں تغزل کا رنگ غالب ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ہندی اور اردو دونوں زبانوں پر مکمل قدرت حاصل تھی اور الفاظ کو برتنے کا انھیں خوب ہنر تھا۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے ان کی شعری کلیات 'حرف حرف خواب' کے دیباچے میں ان کے شعری کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے درست لکھا ہے کہ:

''آسی رام نگری کے کلام میں لب و لہجے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں انھوں نے اپنے زاویہ نگاہ کا جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس کی وجہ سے ندرت ادا پیدا ہوگئی ہے۔ زبان میں صفائی اور بیان میں پختگی ہے۔ ان کے یہاں فن کا حسن بھی ہے اور اظہار بیان پر قدرت بھی۔'' (حرف حرف خواب، ص26)

آسی رام نگری کی شاعری میں کلاسکیت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ مروجہ شعری روایت کی پاسداری ان کے یہاں خوب ملتی ہے۔ وہ نئے خیالات کو بھی کلاسیکی انداز میں پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ عصری آگہی سے انھوں نے اپنے ذہن و فکر کو ہم آہنگ کیا لیکن طرز اظہار کے لیے کلاسیکی انداز کو ہی فوقیت دی۔ دراصل ہر شاعر اپنے مذاق کے مطابق شہ پارہ تخلیق کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کا مخصوص طرز باقی رہ سکے۔ ان کی شاعری میں ذہنی و فکری توانائی تخیل کی گہرائی و گیرائی حد درجہ موجود ہے جو ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہیں اہل چمن حیراں یہ کیسی بہار آئی
ہیں پھول کھلے لیکن ہے رنگ نہ رعنائی

فرسودہ لالہ و گل ہے روش روش ہے اداس
چمن میں ایسے میں جشنِ بہار کیا ہوگا

کہہ دے گھٹاؤں سے کوئی یہ اور کہیں جا کر برسے
مے خانہ سنسان پڑا ہے سوکھے سب پیمانے ہیں

آسی رام نگری کا زمانہ ملک کی تحریکِ آزادی اور ترقی پسند تحریک کا دور تھا۔ اس وقت کے سیاسی رہنماؤں، مذہبی رہنماؤں، قلم کار یا طالب علم سبھی ہندوستانی تحریک آزادی سے وابستہ تھے۔ حب الوطنی کے جذبے سے ہر شخص سرشار تھا اور اپنے اپنے طور پر آزادی کی جدو جہد میں حصہ لے رہا تھا۔ ایسے عالم میں آسی رام نگری خود کو علیحدہ کیسے رکھ پاتے۔ انھوں نے بھی تحریک آزادی کی لڑائی لڑ رہے قلم کاروں کی طرح اپنی شاعری میں حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دیا۔ آزادی کی تئیں لوگوں کے احساسات بیدار کرنے کا کام کیا۔ آسی رام نگری ایک سنجیدہ مزاج انسان تھے۔ وہ ہنگامی حالات میں بھی صبر و تحمل سے کام لینا نہیں بھولتے۔ دراصل ان کا مذاق کلاسکی روایت میں رچا بسا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے معاصر ترقی پسند شاعروں کی طرح شاعری میں کسی طرح کی ہنگامی کیفیت پیدا نہیں ہونے دی۔ ان کے لہجے میں نہ گھن گرج اور نہ ہی کسی طرح کی چیخ و پکار کا احساس ہوتا ہے بلکہ انھوں نے ایک باشعور انسان کی طرح اور سنجیدہ شاعر کی حیثیت سے اپنے ماحول کا مشاہدہ کیا اور انہی احساسات کو کلاسکی پیرایے میں ڈھال کر شاعری کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ دراصل وہ اس رمز سے واقف تھے کہ اچھی شاعری کے لیے اچھا انسان کا ہونا ضروری ہے۔ حالی نے اپنے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں سادگی پر زور دیا ہے چونکہ سادگی سے جو بات بیان کی جاتی ہے وہ تادیر اثر

انداز ہوتی ہے۔ آسی رام نگری، حالی کے اس خیال سے نہ صرف متفق تھے بلکہ اپنی پوری شاعری میں انھوں نے سادگی سے کام لیا۔ آزادی کے جذبے کو جس شاعرانہ حسن کے ساتھ انھوں نے پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

کیا سوئے چمن آئے گی پھر بادِ بہاری
ہر مرغِ چمن آج یوں نغمہ سرا ہے
جس سے چھائی ہوئی حالات کی ظلمت چھٹ جائے
تم کہ خورشید ہو، خود سے وہ اجالا مانگو
ہو جس کے دل میں شوق جاں سپاری
اسے کیا خوف ہو، دار و رسن سے

آسی شہرت کے کبھی خواہاں نہیں رہے۔ انھوں نے شاعری تو صرف تسکینِ نفس کے لیے کی۔ لہذا وہ وقتی شاعرانہ مزاج سے علیحدہ ہو کر کلاسکی طرز کو ہی اپنائے رکھا بالخصوص میر کے مدّھم آہنگ سے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں احساس کی شدت نہیں پائی جاتی بلکہ ان میں سادگی، صفائی، خلوص کی حدت اور صداقت کی گرمی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

آسی مجھے حاجت نہیں اب سیر چمن کی
میرا دل پر داغ ہی گلزار نما ہے
روشن ہے آنسوؤں کے دیے سے تمام رات
قسمت میں اپنی شکر ہے تیرہ شبی نہیں
صد رشک انجمن ہے یہ ویراں سرائے دل
جب سے کسی نے درد کی دنیا بسا دیا

سانحۂ تقسیم کے بعد ملک میں خاصی تبدیلی رونما ہوئی۔ آزادی کی لڑائی جس جذبے اور تصور کے ساتھ لڑی گئی آزادی کے ساتھ وہ سارے خواب ٹوٹ گئے۔ لوگوں کے اندر غم اور مایوسی پیدا ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی تعصب کی بنا پر لوگوں کے درمیان نفرت کی دیواریں بھی کھڑی ہوئیں۔ ایسے عالم میں شاعر و ادیب سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ قلم کار اپنے وقت کا مؤرخ ہوتا ہے اسی لیے شعروادب کو زمانے کا آئینہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد شاعری کے مزاج میں تبدیلی آئی جس نہج پر ترقی پسند شاعری ہو رہی تھی اب اس کی شدت دیکھی جانے لگی کیونکہ آزادی کے بعد ملک اور زندگی کو نئے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا لہٰذا شاعری میں بھی ان کا در آنا ناگزیر تھا۔ آسی رام نگری نے ملک کے جس ماحول کو دیکھا تھا آزادی کے بعد وہ بالکل ناپید ہو گیا۔ آزادی کے بعد بدلتے ہوئے حالات و واقعات کا انھوں نے نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ اپنے مخصوص انداز میں اس کا اظہار بھی کیا۔

اجنبی ہوں میں اب وہاں کے لیے
زندگی جس دیار میں گزری
بگڑ گئی ہے کچھ ایسی ہوا زمانے کی
نہ کی سموم نے جو بات، وہ صبا نے کی
موج و طوفاں کو رو رہے ہیں لوگ
خود سفینہ ڈبو رہے ہیں لوگ
آنے کو بہار آئی چمن میں مگر اس طرح
ہر پھول خزاں دیدہ ہے، افسردہ کلی ہے

آسی رام نگری نرم اور شائستہ لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں عصری معنویت بھی ہے اور تازگی بھی۔ حالی نے ایک اچھے شعر کی خوبی بتائی ہے کہ سادگی کے ساتھ اس میں عصری معنویت ہو۔ آسی کے کلام میں یہ وصف حد درجہ موجود ہے۔ ان کی شاعرانہ خصوصیات کو نمایاں کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل اختر محبی نے جس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے آسی کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ موصوف کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''آسی رام نگری کے کلام کا نمایاں وصف سادگی اور صفائی ہے۔ یہ سادگی اور صفائی ان کی شاعری میں دو سطحوں پر کام کرتی ہے۔ اول تخلیقی تجربات کی سطح پر دوم زبان و بیان کی سطح پر۔ تخلیقی تجربات سادہ، صاف اور پاکیزہ ہوں تو بیان میں از خود سادگی، صفائی اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ آسی رام نگری کے کلام میں ابہام اور سریت کی دھند نہیں پائی جاتی۔ ان کے اشعار چیستاں یا معمہ نہیں ہوتے نہ ہی ترسیل وابلاغ کے المیے سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ سریع الفہم ہوتے ہیں۔ ہر نقش مصفا و مجلّیٰ ہوتا ہے۔ سادگی اور صفائی کلام کا عیب نہیں، فن کا حسن ہے۔ شاعر کی قادر الکلامی کی دلیل ہے لیکن سادگی اور صفائی کے ساتھ کلام میں ندرت، تازگی اور معنویت کا ہونا ضروری ہے۔ حضرتِ آسی کا کلام اس وصف سے عاری نہیں۔'' (ایک ٹکڑا آسمان کا، ص25)

آسی رام نگری کی غزلوں میں جدید رجحانات بھی کارفرما ہیں۔ دراصل ان کی شاعری انسانی فکر کے وسیع تناظر میں اپنا سفر کرتی ہے۔ لہٰذا زندگی اور سماج کے رشتے ان کی شاعری میں تمام تر تضادات کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کسی ایک پہلو میں نظر نہیں آتی بلکہ اس میں ہم آہنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک طرف زندگی کی اذیت دکھ اور محرومیاں ہیں دوسری طرف ٹوٹتے بکھرتے رشتے ایسی صورت میں انسان کی زندگی تنہائی کی اذیت اور غم سے سرشار ہے مگر اب اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ آسی رام نگری کے یہ اشعار عصری حیثیت سے پر ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

راستے کی سختی سے حوصلہ نہ جو ہاریں
منزلیں بلاتی ہیں خود انھیں اشاروں سے
خوابوں کو بنا لیتے ہیں جو لوگ حقیقت
خوابوں کی انھیں لوگوں کو تعبیر ملی ہے
بن جائیں کیوں نہ خود ہی نمودِ سحر کی ضو
آسی ضیا طلب نہ کریں تیرگی سے ہم

آسی رام نگری کے تجربات بے حد وسیع ہیں۔ لہذا اپنے تجربات و مشاہدات کے اظہار کے لیے متعدد اصناف کا سہارا لیا۔ نظم اور گیت کے علاوہ انھوں نے کامیاب قطعات بھی کہے ہیں۔ قطعات میں ان کے تجربات و مشاہدات ایک الگ زاویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان قطعات میں قاری اسی گداز سے ہم آہنگ ہوتا ہے جس کا احساس ان کی غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہاں فرق صرف پیش کش یا ترتیب و تنظیم میں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قطعات ملاحظہ فرمائیں۔

رفعتوں پر وہی پہنچتے ہیں
رکھتے ہیں اپنے حوصلے جو بلند
وہ بھی انسان ہیں جو دھرتی سے
چاند تاروں پہ ڈالتے ہیں کمند

ارتقا کی ہزار شمعیں جلیں
ہر طرف جگمگائے لاکھ چراغ
لیکن انساں بھٹک رہا ہے ابھی
پا سکا آج تک نہ اپنا سراغ

دُرِّ مقصود کے جو ہیں جویا
موج و گرداب سے نہیں ڈرتے
کیا بھریں گے وہ اپنے دامن کو
جو کھڑے دیکھتے ہیں ساحل سے

آسی رام نگری اردو کے ایک بہترین شاعر ہیں۔ نظام زندگی کے متعلق ان کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے اس پر کسی تحریک کی چھاپ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے ان کا اپنا اور اصل ہے۔ بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد ''ان کی شاعری قاری کے وجدان کو بھی متاثر کرتی ہے اور ذہن کو بھی۔''

■

Dr Rishi Kumar Sharma
Associate Professor
Centre for Indian Language, JNU
New Delhi- 110067
Mob.: 8250714748
Email.: rishi.sharma107@gmail.com

اکمل نعیم صدیقی

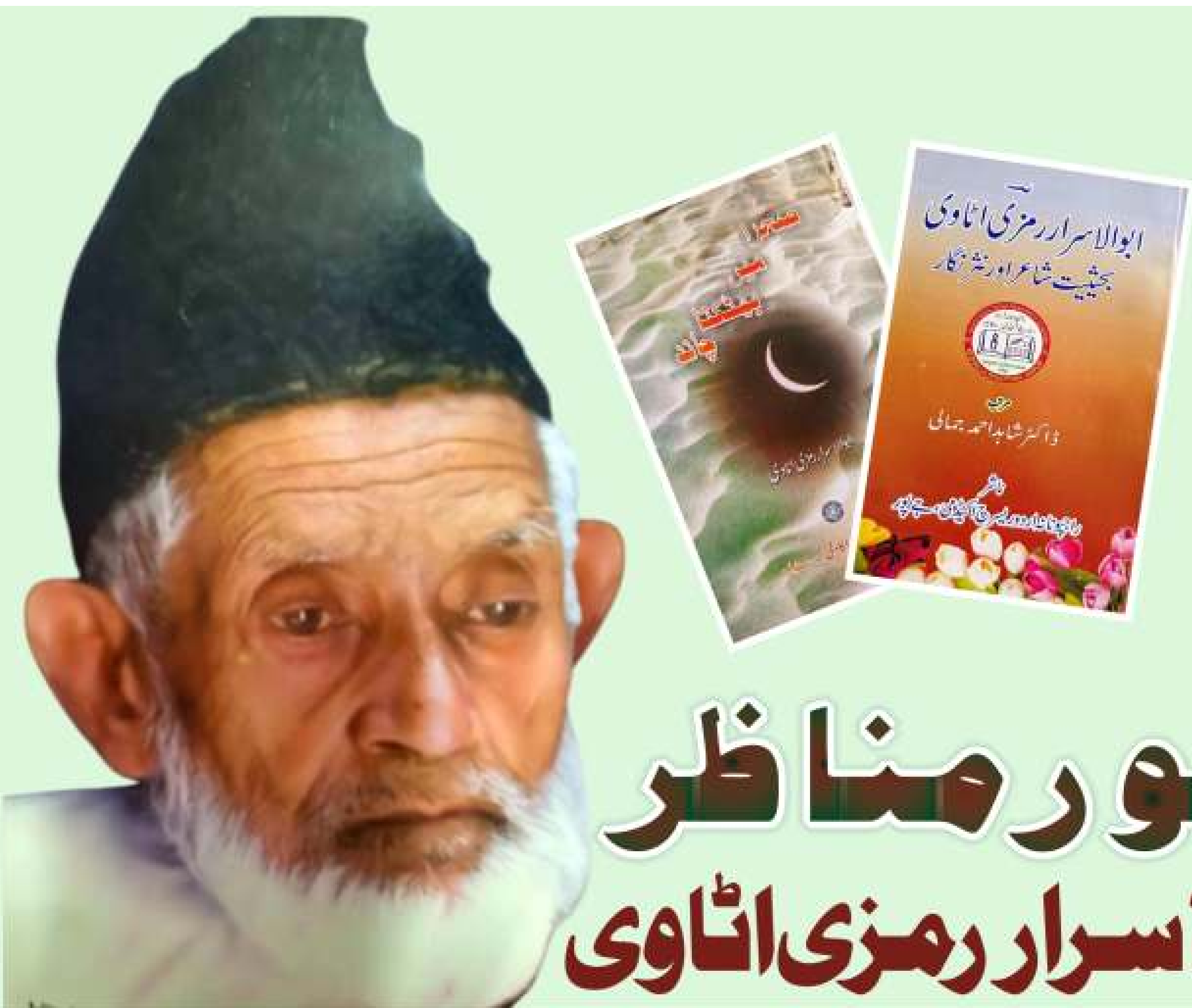

مصور مناظر
ابوالاسرار رمزی اٹاوی

رمزی اٹاوی کا شمار ان شاعروں میں کیا جاتا ہے جن کی نظر میں ادب صرف تفریح کا سامان نہیں ہے بلکہ یہ بامقصد ہوتا ہے۔ ہر ادبی تخلیق کے در پردہ ایک فکر کارفرما ہوتی ہے اور ادیب کے پیش نظر ایک مقصد اور مدعا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمزی نے غزل کو پس پشت ڈال کر اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کے لیے نظم کے دامن کو تھام لیا۔

علامہ سیماب اکبرآبادی کے فارغ الاصلاح تلامذہ میں شامل رمزی اٹاوی بھی اسی سلسلے کے شاعر ہیں، جو ادب کو محض انسان کی جمالیاتی جبلتوں کی تسکین کا سامان نہیں سمجھتے بلکہ ادب کو انسانیت کی خدمت کا آلہ کار گردانتے ہیں۔ رمزی اٹاوی کا نام ظہور احمد، کنیت ابوالاسرار اور تخلص رمزی ہے۔ دنیائے علم و ادب میں رمزی اٹاوی کے نام سے مشہور ہیں۔ رمزی صاحب 1 دسمبر 1912 کو اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی مولیٰ بخش رحمانی ہے۔ اٹاوہ کے اسلامیہ انٹر کالج سے 1929 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انجمن ہدایت اسلام میں انگریزی کے مدرس رہے۔ اسی زمانے میں شاعری کا شوق ہوا۔ 1932 میں جودھپور آئے اور محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ منشی کامل الٰہ آباد یونیورسٹی سے اور ایم اے انگریزی کی ڈگری علی گڑھ یونیورسٹی سے لی۔ ادیب کامل جامعہ اردو علی گڑھ سے اور ایڈوانس ہندی کا امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔ 1942 میں آپ کو جودھپور ریڈیو پر شعبۂ اردو کا انچارج بنایا گیا۔ 1977 میں راجستھان اردو اکادمی کے ممبر نامزد ہوئے۔ رمزی اٹاوی مشاعروں میں تحت اللفظ پڑھتے تھے اور پڑھے لکھے طبقے میں پسند بھی کیے جاتے تھے۔ رمزی صاحب کی نیچرل نظموں سے متاثر ہو کر حضرت بیدل بدایونی نے ان کو 'مصور مناظر' لکھنا شروع کر دیا تھا۔ رمزی صاحب کا کلام ہند و پاک کے مؤقر جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ تادم حیات ان کی کوشش یہی رہی کہ سب قوموں اور فرقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو سکے اور سب مل کر اس ملک و ملت کی فلاح و بہبودی کے لیے سعی کریں۔

رمزی اٹاوی کا شمار ان شاعروں میں کیا جاتا ہے جن کی نظر میں ادب صرف تفریح کا سامان نہیں ہے بلکہ یہ بامقصد ہوتا ہے۔ ہر ادبی تخلیق کے در پردہ ایک فکر کارفرما ہوتی ہے اور ادیب کے پیش نظر ایک مقصد اور مدعا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمزی نے غزل کو پس پشت ڈال کر اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کے لیے نظم کے دامن کو تھام لیا۔ وہ 'حریم نیاز' میں لکھتے ہیں کہ ''میں صالح ادب کا حامی ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں نے جلد ہی غزل کہنا چھوڑ دیا اور نظم کہنے کی طرف مائل ہو گیا۔''

(صحرا میں بھٹکتا چاند، راجستھان اردو اکادمی، جے پور، 2001، ص 141)

جب ادب بامقصد ہو جاتا ہے تو پھر وہ مہ جبینوں اور نازنینوں کی اداؤں اور ان کے رخ و رخسار اور گیسوؤں کے پیچ و خم اور صنم کدے و حرم کدے سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کی فکر کا معیار بلند تر ہو جاتا ہے۔ اسے حیات و کائنات کے رموز نظر آنے لگتے ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان موجود تمام راز آشکار ہونے لگتے ہیں۔ ہر عقدہ کھلنے لگ جاتا ہے۔ پھر شاعر، شاعر نہیں پیمبر کی صورت ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تصدیق خود رمزی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ دیار میں میرے مہ جبیں، نہ حسین عربدہ آفریں
نہ صنم کدے، حرم کدے، نہ نجوم و لالہ و یاسمیں
نہ ہیں منتشر میرے دوش پر، وہ کسی کے گیسوئے عنبریں

میرا ملک شعر و سخنوری غم حسن و عشق سے ہے بری
کہ ازل سے مجھ کو عطا ہوا ہے مذاق شعر و پیمبری

جو شاعر غزل کے معنی صرف حسن و عشق کی باتیں کرنا سمجھتے ہیں رمزی کے نزدیک وہ ''قدامت پرست شاعر ہیں۔'' انھیں قدامت پسند شاعروں کو وہ عار دلاتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

فسانہ تا بکے دہرائے گا جذبات عریاں کا؟
پرستار تغزل، اے گناہ عشق کے بندے
کبھی اقبال کی صورت خودی کا گیت گایا ہے؟
کبھی اشعار کے نشتر سے پہلو گدگدایا ہے؟
جہاں والوں کو پہنچایا کبھی پیغام یزداں کا ؟
کبھی پیغمبرانہ نطق سے روحوں کو گرمایا ؟

رمزی اٹاوی کے پہلے طبع شدہ مجموعے 'صحرا میں بھٹکتا چاند' کے حرف آخر میں اشراق الاسلام ماہر رقم طراز ہیں کہ ''آپ کی اکثر نظمیں شعریت، روانی اور منظر کشی کا جادو بکھیرتی ہوئی شروع ہوتی ہیں اور اختتام تک پہنچتے پہنچتے مشرف بمقصد ہو جاتی ہیں۔'' (ایضاً، ص 141)

یہ بات سو فیصد درست ہے۔ شاعری کے تعلق سے اپنے مضمون 'حدیث شعر و شاعری' میں آپ رقم طراز ہیں کہ ''شاعر میں شعور و سلیقہ کمال درجے کا ہوتا ہے۔ شاعر اپنی پوری قوت صرف کر کے بحر جذبات کی تہ سے موتی نکالتا ہے۔ عرش تخیل کے تارے توڑتا ہے، موشگافی، دقیقہ سنجی کی آخری حد پر پہنچ جاتا ہے۔''

اسی مضمون میں آپ لکھتے ہیں کہ ''شاعری تو وہ وہبی بلکہ شعور ملکوتی ہے جسے قدرت نے صرف بعض مخصوص طبیعتوں میں ودیعت فرمایا ہے۔'' اور کہتے ہیں کہ ''اس میں شک نہیں کہ بعض اشعار میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، جب تک بات میں حکمت و حقیقت نہ ہوگی اثر بھی نہ ہوگا کسی حق بات کو موثر ترین پیرایہ میں ادا کرنا شعریت کا مرتبہ حاصل کرنا ہے، جب تک بات میں سوز و گداز نہ ہوگا شعر شعر نہیں ہوسکتا۔''

(حدیث شعر و شاعری، مطبوعہ شاعر، آگرہ، نومبر 1940)

رمزی اٹاوی کی شاعری کا جب آپ مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو بارہا اقبال کی یاد آتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً اقبال کی ہی طرح انھوں نے بھی اپنی بات کہنے کے لیے نظم کا انتخاب کیا۔ ان کے کلام میں بھی آپ کو اقبال کے جیسی فکر انگیزی، سنجیدگی، متانت، اصلاح قوم کا جذبہ، امت کی فکر، معنی خیز اصطلاحات، نادر تشبیہات، عمدہ الفاظ کا انتخاب، سلاست و روانی، مضامین کی وسعت، مناظر فطرت کی خوب صورت عکاسی اور قرآن و حدیث کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ اسی طرح ان کی کئی نظموں کا انداز خطیبانہ ہے تو کئی نظمیں اقبال کی ہی طرح مکالماتی ہیئت لیے ہوئے ہیں اور تو اور اقبال ہی کی طرح آپ نے بھی بچوں کے ذہنی معیار کے مطابق، بچوں کے لیے بھی عمدہ اور معیاری نظمیں تحریر کی ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ نظمیں اپنے قارئین تک پہنچ نہ سکیں۔ ہمارے فرائض، لڑکیوں کا گیت، چوزے کے ماتم میں، دعائیہ گیت، سونے کا پرنالہ، قلم، عالمی ترانہ، جوش عمل، محترم انسان اور سورج جیسی بہترین نظمیں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

رمزی نے اقبال کی طرح ہی مکالماتی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ 'مناظرہ' ان کی ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں ابلیس اور مومن کے مابین مکالمات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں جہاں ابلیس اپنی طاقت و قوت کی بات کہتا ہے وہیں مومن اسے بتاتا ہے کہ تیرا انجام سوائے جہنم کے کچھ نہیں ہے جبکہ میں امتحاں کے بعد واپس جنت میں جاسکتا ہوں۔ اسی طرح کی ایک نظم بعنوان 'دو مسافر' ہے جس میں انسان اور وقت کے مابین گفتگو پیش کی گئی ہے۔ انسان وقت سے کہتا ہے کہ تو مسلسل اپنی راہ پر گامزن ہے کبھی تو ایسا ہو کہ تو ٹھہر کر گھڑی دو گھڑی آرام کر لے۔ اس پر وقت کہتا ہے کہ میں انسان کی طرح سست اور غافل نہیں ہوں۔

کہیں نہ راہ میں ہو دیر ڈر رہا ہوں میں
خدا کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں میں
سنا نہ مجھ کو یہ افسانہ گل و شبنم
ابد کی سرحد آخر پہ جا کے لوں گا دم

اسی طرح ان کی دو نظمیں 'قدامت پرست شاعر' اور 'شاعر کا عہد نامہ' بھی اہم ہیں۔ قدامت پرست شاعر میں جہاں انھوں نے شاعری کو بامقصد بنانے کی طرف متوجہ کیا ہے اور شاعر کو غیرت دلانے کی کوشش کی ہے وہیں 'شاعر کا عہد نامہ' کے ذریعے انھوں نے ایک طرح سے شاعروں کے سامنے شاعری کا مینی فیسٹو اور منشور پیش کیا ہے۔

اسی طرح ان کی بہت سی نظموں میں ان کا خطیبانہ انداز دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک بہت ہی خوبصورت نظم ہے جس کا عنوان ہے 'خطاب خاص' اس نظم کی خاص بات یہ ہے کہ یہ نظم ہمارے وطن عزیز میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگوں سے نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً خطاب کرتی ہے بلکہ سبھی کو ان کی مذہبی تعلیمات اور عقائد کے ذریعے باہمی محبت اور اخوت کی جانب رغبت دلاتی ہے اور مل جل کر امن سے رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔

پھر وہی جاری کرو مہر و محبت کا چلن
پھر صدا دے کر بلاؤ اپنا وہ عہد کہن
اپنے روٹھوں کو مناؤ ہم بغل ہو ایک ہو
رسم الفت دیکھ کر دنیا کہے تم نیک ہو

'مادر وطن کا اپنے فرزندوں سے خطاب' ایک طویل نظم ہے جس میں وہ اس ملک کے باشندوں سے خطاب کرتے ہیں اور انھیں غیرت دلاتے ہوئے خون خرابا اور مارکاٹ سے رک جانے کی ترغیب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ نظمیں ہند و پاک تقسیم کے بعد رونما ہونے والے مذہبی فسادات کے پس منظر میں تحریر کی گئی ہیں۔

کون سا مذہب ہے جس میں قتل و غارت ہے روا
یہ تباہی امن سوزی یہ شرارت ہے روا
رشوت و اغوا کی بے ہودہ تجارت ہے روا
بے گناہوں پر ستم ہدم عمارت ہے روا
کر دیے تم نے فنا اف کیسے کیسے دل دماغ
صبح سے پہلے بجھا کر رکھ دیے روشن چراغ

ان کے یہاں نظموں میں ایک جوش اور ولولے کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ فکر و بصیرت اور شعور و دانائی ان کی نظموں کا لازمی عنصر ہے۔ ان کی نظمیں اسرار و رموز اور سرود ازل اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

دونوں کے ارتباط سے رونق جہاں کی ہے
کچھ خاک میرے سر کی ہے کچھ آستاں کی ہے
برسوں سے پڑھ رہا ہوں میں افسانہ حیات
اب تک نہیں کھلا کہ عبارت کہاں کی ہے

[اسرار وموز]

مری لغزشوں نے گرا دیا، مجھے خاکدان خراب میں
میں وگرنہ خلد کی روح ہوں، جو رہی ہے اس کی جناب میں
یہ میں کن حدود میں آ گیا، کہ عدم سے بود میں آ گیا
قفس شہود میں آ گیا، فقط ایک کن کے جواب میں

[سرود ازل]

رمزی کی نظموں میں آپ کو ان کا ایک اور انداز دیکھنے کو ملے گا اور وہ ہے موازنے کا انداز۔ حالانکہ اقبال کی نظموں میں بھی یہ رنگ پایا جاتا ہے مثلاً نظم پہاڑ اور گلہری میں پہاڑ کا گلہری سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح رمزی کی نظم 'تحقیق' میں تحقیق اور تقلید کا موازنہ پیش کیا گیا ہے اور تحقیق کی برتری کا اعلان کیا گیا ہے۔ وہ تقلید کو مرگ دانش کہتے ہیں اور تحقیق کو ایک روشن دنیا سے تعبیر کرتے ہیں۔

تحقیق کی روشن دنیا میں ہر سمت چراغاں ہوتا ہے
تقلید کی اندھی دنیا میں ظلمت کا بیاباں ہوتا ہے

ہم خاک کی باتیں کرتے ہیں وہ خاک سے باتیں کرتا ہے
جو شخص محقق ہوتا ہے افلاک سے باتیں کرتا ہے
تقلید تو مرگِ دانش ہے پرواز بشر کی کھوتی ہے
تقلید کی دنیا میں رمزی ذہنوں کی غلامی ہوتی ہے

وہیں نظم 'ارتقا و اتقا' میں ارتقا اور اتقا کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ اتقا کے بغیر ارتقا یقینی طور پر انسانیت کے لیے ہر دور میں مہلک ثابت ہوا ہے۔

جلوہ ایجاد پر سائنس شیدا ہو گئی
اور اس سے آدمی کی موت پیدا ہو گئی
آدمی کے قلب سے خوفِ خدا جاتا رہا
ارتقا کا ہے جنوں اور اتقا جاتا رہا

اسی طرح ان کی نظم 'مثلیث' ہے جس میں باری باری سے جنگ، ظلم اور عشق کا تبصرہ کرتے ہیں۔ اس نظم میں وہ جنگ کو تباہی، ظلم کو شرارت اور عشق کو خدا کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

جنگ ہے لاشوں کا ڈھیر، شور و شر و ازدہام
جنگ سمِ زندگی، جنگ تباہی کا دام
ظلم بھیانک ہنسی، ظلم جہنم کی شام
ظلم جنونِ فساد، ظلم شرارت کا نام
عشق ازل کا جمال، عشق شگفتِ تمام
عشق ستاروں کی چھاؤں، عشق خدا کا ہے نام

ان کی نظموں میں بھی حالی کی طرح مقصدیت کا غلبہ ہے اور ان کا عالمانہ اور خطیبانہ انداز، ان نظموں کا خاصہ ہے مگر یہ قاری پر گراں نہیں گزرتا بلکہ ان کی نظموں میں موجود الفاظ کی سادگی، روانی، سلاست اور منظر نگاری کی وجہ سے نظم میں حسن اور کشش پیدا ہو جاتی ہے جو قاری کو نظم کے اخیر تک باندھے رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں سوز و گداز بھی ہے اور روح کے تار کو متحرک کرنے والی صدائے دل نواز بھی۔ ان کے کلام میں شعریت، معنویت، صالحیت، نصیحت اور فکر و بصیرت کے گوہر بہت سلیقے اور قرینے سے نظم کیے گئے ہیں۔ وہ سر سید، شبلی، حالی اور اقبال کی طرح ہی اپنی ہنرمندانہ شعری تخلیقات سے معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ایسا انقلاب جس میں طہارتِ فکر و نظر کا سامان اور نفاستِ فن کا امکان موجود ہو۔ وہ ایک صالح اور مثالی معاشرہ قائم کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں جس کی ایک جھلک وہ اپنی طویل نظم 'سمندروں کے آئینے' میں دکھاتے ہیں۔

میرے تخیلات کی کوئی حسین موج تھی
جو مجھ کو اس جہان سے فضائے نو میں لے گئی
یہاں کے سارے آدمی تھے بھولے بھالے فلسفی
دماغ و دل میں روشنی جمیل و سادہ زندگی
نفس نفس میں بانسری نظر نظر میں قیصری
زبان میں فسوں گری، کلام میں پیمبری
کوئی سحر کے زمزموں کا کر رہا تھا ترجمہ
کوئی ازل کی شام کا سنا رہا تھا واقعہ
کوئی شفق کی سرخیوں پہ کر رہا تھا تبصرہ
کسی کا شغل چاندنی کا پرسکوں مطالعہ

[سمندروں کے آئینے]

اسی طرح ان کی ایک نظم 'منھ بولتی غزل' بھی فکر و بصیرت، علم و معرفت اور شعور و دانائی کے نور سے روشن کسی چراغ سے کم نہیں ہے۔ اس نظم میں مستعمل استعارات اور تشبیہات بھی اپنی ندرت، کمال خوبصورتی اور مناسبت کی اپنی مثال آپ ہیں۔ ظلمت کو افسردہ روشنی اور موت کو تمہید زندگی کہہ کر انھوں نے ان لفظوں کو نئی معنویت بخشی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار دیکھیے۔

تاروں کا ٹمٹمانہ دھڑکن ہے میرے دل کی
یہ اضطراب پیہم ہے جانِ آب و گل کی
ظلمت ہے نام جس کا افسردہ روشنی ہے
کہتے ہیں موت جس کو تمہید زندگی ہے
اس آسماں سے آگے اک چیز دیکھتا ہوں
فردوسِ معرفت کی دہلیز دیکھتا ہوں
میری نیاز مندی دیباچہ غزل ہے
میثاقِ بندگی کی منھ بولتی غزل ہے

[منھ بولتی غزل]

رمزی اناوی کے شعرستان میں عشقِ حقیقی کی سرمستی، حسن و وارفتگی، جمال و کمال، ترنم و تغزل کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحانات کا غلبہ صاف طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ادیب کی پرچھائیں، اس کا عکس، اس کی شخصیت اور مزاج، اس کی تخلیق میں شعوری اور لاشعوری طور پر شامل ہو ہی جاتے ہیں۔

مذہبی جنون، قتل و غارت گری، باہمی نفرت و کدورت، ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی آپ نے ہمیشہ تردید اور مخالفت کی ہے۔ وہ امن و محبت کے سفیر اور معلم اخلاق بن کر برادرانِ وطن کو آواز دیتے ہیں۔ اپنی بہت سی نظموں میں آپ نے اس کو موضوع بنایا ہے خصوصاً تقسیم ملک کے بعد ہندو پاک میں ہونے والے خونی فسادات کے پس منظر میں آپ نے بہت ہی دردمندانہ طریقے سے اسے پیش کیا ہے۔ مثلاً

پھولوں کی دیکھتا ہوں جہنم کی ریت میں
جھلسی ہوئی بہار ہے شعلوں کے کھیت میں
ہر شے گراں ہے دہر میں ارزاں ہے صرف موت
ہر ذی نفس ملول ہے شاداں ہے صرف موت
رنگیں ہیں لہو سے الم کی کہانیاں
طے کر رہی ہیں خون کی زخمی جوانیاں

[پھولوں کے مقبرے]

شہر و جنگل میں لہو ہے کوہساروں میں لہو
بہہ رہا ہے آدمی کا سبزہ زاروں میں لہو
اس طرف سے آ رہی ہے خون جلنے کی چراند
اس طرف سے بے کفن لاشوں کی زہریلی سڑاند
شہر غارت ہو گئے گلشن بیاباں ہو گئے
اہلِ ساحل اور ساحل نذرِ طوفاں ہو گئے

[فانوس میں دبے چراغ]

آدمیت پی رہی ہے آدمیت کا لہو
رو رہی ہیں نیکیاں اور شیطنت ہے سرخ رو
مختصر ہوتے چلے جاتے ہیں اسبابِ حیات
ہوتا جاتا ہے معطل سا نظامِ کائنات

[دکھ کے سائے میں]

وہ خرابی کی ہے اس بھٹکے ہوئے انسان نے
اپنی آنکھیں بند کر لیں شرم سے شیطان نے

[خونی نمائش]

امن و اخوت اور رسم الفت کو عام کرنا ہمیشہ سے ان کا مقصد رہا ہے۔ اسی لیے وہ صدا دے رہے ہیں کہ۔

جامِ صہبائے بقا پیتے رہو، پینے بھی دو
اس خدا کے ملک میں خود بھی جیو جینے بھی دو
اپنے روٹھوں کو مناؤ، ہم بغل ہو، ایک ہو
رسمِ الفت دیکھ کر دنیا کہے تم نیک ہو

رمزی انسان اور انسانیت کے احترام کے قائل ہیں اسی لیے وہ اپنی نظم 'احترام انساں' میں رقمطراز ہیں۔

یہ سب کارخانہ بشر کے لیے ہے
یہ سارا زمانہ بشر کے لیے ہے
کی قسم شاہ کار خدا ہے
یہ انسان آئینہ دار خدا ہے
خدا کا خلیفہ ہے مخدوم سب کا
ہیں سب اس کے خادم وہ ہے بندہ رب کا
کرو آدمی سے محبت زیادہ
اسے رب نے دی ہے کرامت زیادہ

[احترام انساں]

رمزی نے نظیر اکبر آبادی کی طرح فاسد رسم و رواج اور امت کے نوجوانوں کی بے راہ روی پر بھی بڑے بے باکانہ انداز میں اپنے قلم کو تلوار کی مانند جنبش دی ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں مثلاً کارواں نمود، باغی تتلیاں اور باغی بھنورے وغیرہ اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ نظم 'کارواں

نمودٗ میں وہ جہیز کی لعنت کو بڑی چابک دستی اور بڑے روح پرور انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ۔

ضو فشاں یہ سیم گوں سوغات کا انبار دیکھ
عرصہ ہستی میں آب و رنگ کا بازار دیکھ
کس طرح ہوتی ہے گھر کی زندگی دشوار دیکھ
آنے والی پستیوں کے دور سے آثار دیکھ
اس بہارستان میں بوئے خزاں پاتا ہوں میں
سینہ عشرت میں پلتی اک فغاں پاتا ہوں میں

[کاروان نمود]

اور جدید دور میں خواتین میں فیشن کی صورت گھر کر گئی عریانیت، کلب لائف، شراب اور سگریٹ نوشی پر حیرت کرتی ہوئی اور آنسو بہاتی ہوئی طویل نظم 'باغی تتلیاں' کے کچھ اشعار بھی دیکھتے چلیے۔

آہ گلزار تمدن کی یہ باغی تتلیاں
جن کی بے باکی سے لرزاں زاہدوں کی نیکیاں
عظمت اسلاف اور ناموس سے منہ موڑ کر
آ گئی ہیں خارزاروں میں گلستاں چھوڑ کر
ماتم اے ناموس، یہ کیا پرخطر نظارہ ہے
حد فطری چھوڑ کر اب حسن یوں آوارہ ہے

[باغی تتلیاں]

خواتین کی طرح ہی انھوں نے مردوں کو بھی اپنے نشانے پر لیا ہے اور ان میں پیدا ہو چکی اخلاقی اور سماجی برائیوں کی جانب نہ یہ کہ صرف اشارہ کیا ہے بلکہ بہت سخت الفاظ میں غیرت دلانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کی طویل نظم 'باغی بھنورے' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

آدمیت کو ہوا ہے کیا یہ اخلاقی جذام
ارض عالم کا خلیفہ اہرمن کا ہے غلام
مغربی عینک لگاتے ہی یہ اندھے ہو گئے
طالبان روشنی تاریکیوں میں کھو گئے
آنکھ اندھی، روح گندی، دل سیہ، مردہ ضمیر
آدمی سوسائٹی کی لعنتوں میں ہے اسیر

ابوالاسرار رمزی کو مصورِ مناظر اور نقاشِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تقریباً تمام ہی نظمیں ان کے اس لقب کو صادق ثابت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مطالعہ فطرت، ریگستانی گاؤں، سیر ماضی، آئینۂ الہام، دو مسافر، شاعر فطرت جیسی بہت سی نظمیں ان کے نگار خانے میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ نظم 'ریگستانی گاؤں' کا ایک بند دیکھیے جسے پڑھتے ہوئے آپ کی نظروں کے سامنے اس ریگستانی گاؤں کا ایک ایک منظر ایسے گزر جائے گا کہ آپ خود اس گاؤں میں اسی جگہ موجود ہیں جس کا ذکر شاعر کر رہا ہے اور

ابو الاسرار رمزی کو مصورِ مناظر اور نقاش فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تقریباً تمام ہی نظمیں ان کے اس لقب کو صادق ثابت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مطالعہ فطرت، ریگستانی گاؤں، سیر ماضی، آئینہ الہام، دو مسافر، شاعر فطرت جیسی بہت سی نظمیں ان کے نگار خانے میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔

ان مناظر کا آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دیکھیے۔

گرد و غبار ہر سو جنگل پہ چھا رہا ہے
بستی پہ جیسے کوئی آسیب آ رہا ہے
بھوری پہاڑیوں سے بھیڑیں گزر رہی ہیں
اونٹوں کی کچھ قطاریں نیچے اتر رہی ہیں
تالاب کی طرف سے حوریں گزر رہی ہیں
مٹی کی گاگروں کو پانی سے بھر رہی ہیں
ماتھے پہ جن کے رنگیں قشقے لگے ہوئے ہیں
گویا دھنک کے فیتے سر سے بندھے ہوئے ہیں

[ریگستانی گاؤں]

اسی طرح ان کی نظم 'سیر ماضی' کو پڑھ کر آپ کو اختر شیرانی کی نظم 'ایک لڑکی کا گیت' ضرور یاد آئے گا۔

جہاں پیپل کے پتے جھوم کر تالی بجاتے ہوں
جہاں بچے کسانوں کے گھنی چھاؤں میں گاتے ہوں
جہاں بے باک ساتھی جھیل میں غوطے لگاتے ہوں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے پھسل کر ڈوب جاتے ہیں
وہ بچپن کاش مل جائے تو کھلیانوں میں کھیلوں پھر
وہاں جاؤں میں اور زرخیز میدانوں میں کھیلوں پھر

[سیر ماضی]

رمزی نے ادب اطفال کی تخلیق کے لیے بھی اپنی صلاحیتوں اور شعور و فکر کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ادب اطفال کی تخلیق کوئی آسان کام نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں بہت کم شاعر طبع آزمائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ بچوں کا ادب ایسا ہونا چاہیے جو ان میں تجسس، تفکر اور تجدد کی صلاحیتیں پیدا کرے۔ ان میں جرأت و ہمت پیدا کرنے، چیلنجز کو قبول کرنے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت کو پروان چڑھائے۔ بچوں کے ادب کو مثبت رجحانات کا حامل ہونا چاہیے تاکہ بچوں کی فکر و سوچ، ان کا رویہ اور ان کا عمل مثبت ہو سکے۔ زبان سہل اور موثر ہونی چاہیے، مضامین پر تجسس اور فکر انگیز ہونے چاہیے۔ ساتھ ہی دلچسپ ہونا پہلی شرط ہے جس کے لیے اس میں کسی مزے دار قصے، کہانی یا حکایت کو شامل کیا جانا چاہیے۔

ایک جوشیلی نظم ہے جس کا عنوان ہے 'جوش عمل'۔ یہ نظم بچوں سے علم حاصل کرنے، قوم وملت کا نام روشن کرنے، کردار کو بہتر بنانے اور نیک اعمال کے ذریعے آخرت کی تیاری کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

کر ایسا کام جس سے قوم کا معیار اونچا ہو
بڑھیں علم و ہنر انسان کا کردار اونچا ہو
پہاڑوں کو ہلا دے بحر کو زیر و زبر کر دے
ہوا کو روک دے تو بجلیوں کو بے اثر کر دے
کمندیں آسماں پر پھینکنے کے ڈھنگ پیدا کر
تو سورج کی شعاعوں سے ہزاروں رنگ پیدا کر

[جوش عمل]

اپنی نظم بعنوان 'سورج' کے ذریعے انھوں نے سورج کی اہمیت و افادیت اور اس کے کاموں کو تفصیل سے سورج کی ہی زبانی بڑے سہل اور موثر انداز میں پیش کیا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بتانا بھی نہیں بھولے ہیں کہ میری پرستش کرنے والے انسان دراصل جہالت کا شکار ہیں کیونکہ میں معبود نہیں ہوں بلکہ میں بھی خدا کی مخلوق میں شامل ہوں اور اسی کے حکم کی تعمیل میں مسلسل لگا ہوا ہوں۔

میں بے شک آگ کا گولا ہوں لیکن خاصیت یہ ہے
درختوں میں لگے میوے بنا ایندھن پکاتا ہوں
سنہری دھوپ کی چادر جہاں کو مفت دیتا ہوں
ہزاروں جانداروں کو میں سردی سے بچاتا ہوں
مجھے خالق سمجھ کر پوجنے والے ہیں ظلمت میں
میں خود مغرب میں جا کر پیش خالق سر جھکاتا ہوں
خدا نے مجھ کو رمزی خادم عالم بنایا ہے
نظام پرورش اس کا زمانے کو سکھاتا ہوں

مختصر یہ ہے کہ رمزی اٹاوی کے فن اور شخصیت کو کسی ایک مضمون میں سمیٹ پانا مشکل امر ہی نہیں بلکہ ناممکن عمل ہے۔ رمزی کے فکر و فن پر مختلف زاویوں سے گفتگو کی جانی چاہیے اور ان کی شعری و نثری تخلیقات کو تحقیق کا موضوع بنایا جانا چاہیے۔

■

Akmal Naeem Siddiqui
Faize Aam Masjid, G Sector
Partap Nagar
Jodhpur- 342003 (Rajasthan)
Mob.:9413844624
Email.: vedandquraan@gmail.com

ریحان حسن

شعرائے نامورانِ امرتسر

امرتسر ہمیشہ سے علمی وادبی مرکز رہا ہے۔ یہاں اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے مختلف علمی وادبی مجالس قائم تھیں۔ امرتسر میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں مشاعروں کے کردار سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جس میں ہر مکتب فکر کے افراد بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یہ مشاعرے امرتسر کے باشندگان کے اردو سے دلی محبت کا ثبوت بھی ہیں اور اردو سے دلچسپی کا مظہر بھی۔ ان مشاعروں نے نئی نسل کو بھی اردو کی جانب راغب کیا۔ آج بھی یہاں اردو زبان سے محبت کرنے والوں کی کمی نہیں، یہی نہیں کہ یہاں کے باشندے صرف اردو سے محبت کا دم بھرتے ہوں بلکہ یہاں کے لوگوں نے اردو کے فروغ کے لیے عملی اقدامات بھی کیے ہیں جس بنا پر اردو کی بیشتر اصناف میں اہل پنجاب کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ صنف شاعری میں تو پنجاب والوں نے اپنی ذہنی جودت اور فکری بصیرت کا جو ثبوت دیا ہے اس سے اردو شاعری کے اثاثے میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ لہٰذا اس مقالے میں امرتسر کے ان شعرا کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو زبان کے فروغ میں حصہ لیا۔

اوم پرکاش بھنڈاری قمر جلال آبادی

امرتسر کے ان شعرا میں تھے جنھوں نے شعر وادب کی دنیا میں علم وفضل کے گہرے نقوش ثبت کیے۔ ان کی ولادت 28/فروری 1917 کو جلال آباد ضلع امرتسر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1933 میں کپورتھلہ سے میٹرک پاس کرنے کے بعد روزنامہ 'پرتاپ' کے ادارتی اسٹاف میں 1935 میں شامل ہوئے اور اپنی محنت ولگن سے دنیائے صحافت میں بھی اپنی شناخت بنائی۔ ترقی کے پر لگے تو 'ملاپ' میں چلے گئے لیکن ان کی خوب سے خوب تر کی جستجو نے انھیں قرار نہ لینے دیا بالآخر 'ستارہ ویکلی' کے ایڈیٹر مقرر کیے گئے جہاں سے نہ جانے کتنے ہی ادبا وشعرا کو ادبی دنیا سے انھوں نے متعارف کرایا۔ جن میں ایک اہم نام قتیل شفائی کا بھی ہے۔ پھر انھوں نے صحافت کی پرخار وادیوں کو خیرباد کہہ کر 1940 میں بطور نغمہ نگار پنچولی پکچرز لاہور سے تعلق قائم کر لیا نیز 1943 میں انھوں نے پربھات فلم کمپنی کو بھی اپنی خدمات دیں۔ قمر جلال آبادی کو دنیائے شاعری میں جو شہرت وناموری حاصل ہوئی اس میں فلمی دنیا سے وابستگی کا بھی اہم حصہ ہے۔ انھوں نے ڈیڑھ سو سے زائد فلموں کے لیے گیت لکھے جس بنا پر ہندوستان کے گلی کوچوں میں بھی بچے بچے کی زباں پر ان کا نام زباں زد ہو گیا ایسا نہیں کہ ان کی شاعری محض عوام کے لیے ہو بلکہ انھوں نے شاعری کے قواعد وضوابط کی بھی پابندی کی ان کا کلام زبان وفن کے اغلاط سے پاک ہی نہیں ہوتا بلکہ کلام میں تخیل کی رفعت اور انداز نگارش میں بھی ندرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ کلام ملاحظہ ہو:

عشق میں کتنے عاشق ہوئے ہیں فنا دل مٹائے گئے سر اچھالے گئے
جو نہ دل کھو سکے جو نہ سر دے سکے وہ تری انجمن سے نکالے گئے
خوب ساقی کی محفل کا دستور تھا اس کو رندوں کا دل رکھنا منظور تھا
ہوش میں جو رہے ان کو پوچھا نہیں گرنے والے لپک کر سنبھالے گئے
حسن رنگیں کی جلوہ گری ہے عجب یاد کچھ بھی نہیں یاد اتنا رہا
تیرے آتے ہی سارے اندھیرے گئے تیرے جاتے ہی سارے اجالے گئے
حسن میں اب اداؤں کی نرمی کہاں عشق میں اب خطاؤں کی گرمی کہاں
شمع بجھ بجھ گئی جام گر گر گئے میکدہ لٹ گیا پینے والے گئے [1]

قمر جلال آبادی کی اس قبیل کی شاعری میں حسن وعشق کے بیان کے ساتھ ساتھ زندگی

کے تجربات اور کائنات کے سربستہ اسرار کا بیان جس انداز سے ملتا ہے اس میں ان کا حریف ملنا آسان نہیں، ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ شاعر وادیب اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور شاعر گر بھی تھے۔ انھوں نے ادبی دنیا میں شعرا کو متعارف کرانے میں جو اہم رول ادا کیا ہے اسے ادبی دنیا فراموش نہیں کرسکتی۔

باوا بلونت

علم وادب کی دنیا میں جو شہرت ومقبولیت باوا بلونت کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکی۔ ان کی پیدائش اگست 1915 میں واگھا بارڈر کے نزدیک نیشٹا گاؤں ضلع امرتسر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام ٹھاکر دیناناتھ تھا۔ روزی کی تلاش میں دہلی کا سفر کیا اور 'نو یگ' پریس میں پروف ریڈنگ کا کام کیا 1992 میں گرمی کے زمانے میں لو لگنے کے سبب سڑک پر گر گئے اور ان کی موت واقع ہوگئی۔ 2

ان کی کتابوں میں امر جیت، مہاناچ، سگندھ سمیر، جوالا مکھی، بندرگاہ ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی زبان میں مضامین کا مجموعہ 'کس کس طرح دے ناچ' اور بابا بلونت سنگھ کی منتخب نثر معروف ومشہور ہے۔ دراصل وہ سنسکرت، ہندی، پنجابی، اردو و فارسی پر غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے پہلی کتاب جو لکھی وہ اردو زبان میں ہی تھی۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ اردو زبان میں 1930 میں 'شیر ہند' کے نام سے شائع ہوا جسے انگریز حکومت نے ضبط کرلیا۔ ان کی شاعری کلاسیکی ادب کا شاہکار نمونہ تھی ڈاکٹر محمد اقبال کا اثر ان کی شاعری میں صاف

علم و ادب کی دنیا میں جو شہرت و مقبولیت باوا بلونت کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکی۔ ان کی پیدائش اگست 1915 میں واگھا بارڈر کے نزدیک نیشٹا گانوں ضلع امرتسر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام ٹھاکر دیناناتھ تھا۔ روزی کی تلاش میں دھلی کا سفر کیا اور 'نویگ' پریس میں پروف ریڈنگ کا کام کیا 1992 میں گرمی کے زمانے میں لو لگنے کے سبب سڑک پر گر گئے اور ان کی موت واقع ہوگئی۔

صاف جھلکتا ہے۔ دراصل شاعری کا یہ مجموعہ عوام کو غفلت سے بیدار کرنے کے لیے انھوں نے رقم کیا تھا۔ باوا بلونت سنگھ معاشرتی نظام سے متاثر ہوکر شاعری کرتے تھے۔ اس لیے عوام میں بیحد مقبول ہوئے۔ ساتھ ہی ان کے اشعار میں دینی، مذہبی مضامین اور رومانیت کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے امن قائم کرنے اور دنیا سے غیر رسمی چیزوں کو دور کرنے کے لیے اپنا قلم اٹھایا۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ اس مجموعۂ کلام میں بیشتر کلام انقلابی خیالات اور جذبات کے ترجمان تھے چونکہ اس مجموعے میں انگریزوں کی غلامی کا جوا اتار کر پھینک دینے کی ترغیب دی گئی تھی لہٰذا انگریز حکومت نے کتاب کو ضبط کرنے کا حکم صادر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کی آئندہ نسل باوا بلونت سنگھ کی شاعری کے رنگ و آہنگ سے واقف نہ ہوسکی۔

برج موھن لال تکوزیبا

شعر وادب کی دنیا میں شناخت بنانے والے شعرا میں ایک اہم نام پنڈت برجموہن لال تکوزیبا کا بھی ہے۔ وہ ہندو سبھا کالج امرتسر میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی تھی۔ علم وادب سے دلچسپی ابتدا سے ہی انھیں رہی۔ چنانچہ شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ امرتسر سے نکلنے والا رسالہ چمن میں آپ کا کلام عاشقان ادب کی پیاس کو بجھانے میں پیش پیش تھا۔ ان کی ایک غزل چمن میں 'زمزمۂ تغزل' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو

خامشی کہہ رہی ہے یہ غنچۂ نو بہار کی!
منہ پہ ہے مہر گونگی دل میں ہوس ہے یار کی

پار نہ دل کے ہو سکا جدّ و جہد ہزار کی
طاقتیں دیکھ لیں ترے خنجر دلفگار کی

اس نے نظر جو پیار کی غیر پہ بار بار کی
ہم نے اٹھا کے تیغ خود اپنے جگر کے پار کی

کس طرح راہ لیں نہ ہم ہجر میں کوئے یار کی
آس نہ جب ہو دید کی تاب نہ انتظار کی

کیسے چمن میں دل لگے کیا ہو خوشی بہار کی
جب نہ امید ہو کوئی آمد گلعذار کی

طرز جفا میں کیا کہوں اپنے ستم شعار کی
رکھّی بغل میں ہے چھری بات ہے منہ پہ پیار کی

دل کو، جگر کو، سینے کو میں بھی کڑا نہ کیوں کروں
تیز بہت ہے آج کل نوک نگاہ یار کی

آبلہ ہائے بیشمار، داغ ہزار آشکار
کیا کیا بنی ہیں صورتیں دل میں مرے غبار کی

عشق بتاں میں ٹھوکریں کھائیں ہر ایک گام پر
زیبا پر اب بھی راہ حق تم نے نہ اختیار کی 3

زیبا کی شاعری میں فنی چابکدستی کی کارفرمائی جا بجا نظر آتی ہے۔ ان کا یہ مخصوص لب ولہجہ اور خصوصی رنگ غزلوں میں قاری کو متوجہ کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا غزل بہت ہی سادہ اور صاف ہے لیکن ان اشعار میں بھی زندگی کی حرارت موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ الفاظ کو نئے مفاہیم عطا کرنے کے ہنر سے برجموہن لال زیبا بخوبی واقف ہیں۔

پرشوتم لال ضیا

پرشوتم لال ضیا امرتسر کے شعرا میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ امرتسر میں ان کی ولادت ہوئی۔ وہ بہترین غزل گو، معتبر نظم نگار اور مشہور افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کے کلام میں تخیل کی نزاکت اور معنی آفرینی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ ان کا جو مخصوص رنگ تھا اس کی بدولت انھیں اپنے معاصرین میں امتیاز حاصل تھا۔

امرتسر کے شعرا میں ضیاء نے اردو غزل میں جو نیا لب ولہجہ پیش کیا اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں علمیت کا اظہار، تخیل کی بلندی اور فکر کی جو جامعیت نظر آتی ہے وہ امرتسر کے شعرا میں انھیں امتیاز وانفراد عطا کرتی ہے۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی نظمیں بھی بے مثال ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم 'طلوع آفتاب' ملاحظہ ہو

عروس شب نے سمیٹا ہے زلف برہم کو
ہے خیر مقدم دو شیزۂ سحر منظور

عجب ہے عارض گردوں پہ ہلکا ہلکا نور
عیاں ہوئی خط ابیض سے جلوہ رانیِ طور

بجا ہے خوف شکستِ جمود انجم کو
عروسِ شب نے سمیٹا ہے زلف برہم کو

اٹھایا چہرے سے محبوبۂ سحر نے نقاب
طیور کیف نوا سب ہیں زمزمہ پیرا

وہ زمزموں سے طلسم سکوتِ شب ٹوٹا
شفق نے وقفِ گریباں کیا ہے ہاتھ اپنا

ہے غرق بحرِ تجلّی سفینۂ مہتاب
اٹھایا چہرے سے محبوبۂ سحر نے نقاب

ہے دلنشیں شہ خاور کی کشتیِ زرّیں
بہا کے لے گئی خوابوں کی بے حسی کو نسیم

فضا میں رقص کناں ہے سرور بیز شمیم
تو محوِ خوابِ گراں ہے ابھی تلک بھی ندیم

ضیائے صبح میں ہاں چھیڑ نغمۂ رنگیں
ہے دل نشیں شہ خاور کی کشتیِ زریں 4

ضیا کی نظموں کے موضوعات نو بہ نو ہوتے ہیں۔ ان کی نظمیں ہیئت کے اعتبار سے بھی

منفرد ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں میں روانی اس قدر ہوتی ہے کہ طوالت کا احساس نہیں ہوتا۔ انھوں نے فطرت کے مناظر کو اپنی نظموں میں جس خوبی سے نظم کیا ہے وہ لائق تحسین وآفریں ہے۔

پرتھوی راج ہوش

امرتسر کے قدآور اور بلند پایہ شعرا میں پرتھوی راج ہوش کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ آپ نے نئی آبادی کرم پور امرتسر کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ سن طفولیت ہی سے شاعری کی طرف ملتفت ہوئے۔ آپ نے بیک وقت اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی زبانوں میں شاعری کی جس میں ایثار ومحبت، تہذیب وتمدن اور حب الوطنی کے پیغامات کو نظم کرکے پیغام محبت کو عام کیا۔ پرتھوی راج ہوش نے جملہ اصناف سخن مثلاً فرد، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع ومثمن وغیرہ میں اخلاق وہمدردی اور ایثار ومحبت کے مضامین کو نظم کیا۔ دوسو سے زائد غزلیں کہیں، رباعیات وقطعات کا مجموعہ 'گلزار ہوش' کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکا ہے۔ ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ کلام میں پند ونصائح کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے محور کا ذکر اپنی ایک نظم ''میری شاعری میں اور وہ'' میں اپنے تخیلات کا اظہار کرتے ہیں۔

مری شاعری درد والوں کی دنیا — مری شاعری آہ و نالوں کی دنیا
مری شاعری خستہ حالوں کی دنیا — مری شاعری پائمالوں کی دنیا

میری شاعری ہے غریبوں کا رونا
میری شاعری ہے نصیبوں کا رونا

میری شاعری آرزو ہر کسی کی — میری شاعری جستجو ہر کسی کی
میری شاعری گفتگو ہر کسی کی — میری شاعری ہو بہو ہر کسی کی

ہے تصویر کھینچی ہوئی زندگی کی
ہے تفسیر لکھی ہوئی زندگی کی

مصور ہوں میں میری تصویر غم ہے — مدبر ہوں میں میری تدبیر غم ہے
مقرر ہوں میں میری تقریر غم ہے — محرر ہوں میں میری تحریر غم ہے

میری ابتدا انتہا غم ہیں دونوں
میرا واقعہ ماجرا غم ہیں دونوں 5

ظاہر ہے کہ شاعر میں شدت احساس اور درد دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے یہی شدت احساس ہوش کے یہاں بھی ہے۔ ان کے یہاں منافرت اور تفرقے کو بڑھاوا دینے والے مضامین شاذ ہی نظر آئیں گے۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے فرض شناس ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ کہنا تھا۔

عبادت سے ریاضت سے زیارت سے کہیں بڑھ کر
میں اپنے فرض میں ہی بندگی محسوس کرتا ہوں

پرکاش ناتھ پرویز

سرزمین امرتسر کے لائق وفائق فرزند پرکاش ناتھ پرویز کا شمار اردو دنیا کے خوش فکر شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ 25/اکتوبر کو 1930 میں قصبہ رام داس ضلع امرتسر میں لالہ رام جی داس کے گھر پیدا ہوئے۔ (حساب کتاب) کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے جہاں شاعرانہ ماحول دور دور تک میسر نہیں لیکن ایسے غیر شاعرانہ ماحول میں بھی انھوں نے شاعری کی شمع کو روشن رکھا۔ 1959 میں 'شفق زار' کے نام سے قطعات کا مجموعہ شائع کرایا اور 1962 میں غزلیات اور منظومات کا مجموعہ 'جادۂ منزل' کے نام سے چھاپا۔ جسے ادبی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔

ان کی غزلیں اور نظمیں سلاست، روانی اور تازہ کاری کے ساتھ ساتھ افراط و تفریط سے پاک ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام میں بھی صداقت بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔ انھوں نے شاعری میں خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جس فنکاری کا ثبوت دیا ہے اسے آنے والی نسلیں فراموش نہیں کرسکتیں۔

دھرم پال مرواہا جگر

دھرم پال جگر جالندھری اردو کے قادرالکلام سخنور تھے۔ دراصل اصناف شعر میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کامرانی کے ساتھ کی ہے۔ ان کی پیدائش 17/جنوری 1935 کو امرتسر کے موضع سارنگدیو میں ہوئی۔ لیکن تعلیم اور عمر کا ابتدائی حصہ جالندھر میں گزارنے کے سبب جالندھری نام کا جزو لاینفک بن گیا۔ وہ پنجاب بجلی بورڈ میں انجینئر تھے انھیں شعروادب سے دلچسپی اوائل عمر ہی سے تھی۔ ساحر سیالکوٹی اور جوش ملسیانی سے انھوں نے شاعری میں مشورہ کیا۔ ان کے شعری مجموعوں میں سوز جگر اور لخت جگر کو قبول عام حاصل ہوا۔ جگر کا کلام نفاستِ بیان اور لطافت خیال کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کے کلام میں جدت، خیال آفرینی، ترنم اور جو اثر ہے وہ بہت کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے ان کا یہ کہنا بجا ہے۔

بات جو حق کی ہے حق والے سنا دیتے ہیں — لوگ بے شک انھیں سولی پہ چڑھا دیتے ہیں
ڈال کر عکس وہ آئینے میں بھر دیتے ہیں رنگ — ورق سادہ کو تصویر بنا دیتے ہیں
سو بہاروں سے بھی پھول اتنے نہ کھلنے پائیں — جتنے اک جنبش لب سے وہ کھلا دیتے ہیں
خون ناحق نہیں پروانوں کا دیکھا جاتا — ہم چراغوں کو سر شام بجھا دیتے ہیں
مجرم عشق ہوں میں سب سے بڑا جرم ہے عشق — جو سزا مجھ کو وہ دیتے ہیں بجا دیتے ہیں
امتحاں اہل ہوس کا ہے عبث، یاد رہے — جان دیتے ہیں تو ارباب وفا دیتے ہیں
ایسے لوگوں سے جگر کیا ہو توقع ہم کو — قتل کرکے بھی جو احسان جتا دیتے ہیں 6

مندرجہ بالا اشعار میں جگر جالندھری کے واردات قلب، مطالعے کی وسعت اور مشاہدے کی گہرائی بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔ انھوں نے زندگی کی صداقتوں کو جس خوبی سے بیان کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے چند سال بعد وہ اپنے گھر سے نکلے اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔

رام رتن مضطر

رام رتن مضطر یکم ستمبر 1906 میں موضع تھریے وال ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا امرتسر میں مستقل قیام رانی کا باغ میں تھا۔ آپ کے والد کاشتکار تھے

ان کے کلام میں تخیل کی بلندی اور مضمون آفرینی کے ساتھ عشقیہ بیان قابل غور ہے۔

کھو گیا ہوں راہ وفا میں کچھ اس طرح — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

امرتسر کے قدآور اور بلند پایہ شعرا میں پرتھوی راج ہوش کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ آپ نے نئی آبادی کرم پور امرتسر کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ سن طفولیت ہی سے شاعری کی طرف ملتفت ہوئے۔ آپ نے بیک وقت اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی زبانوں میں شاعری کی جس میں ایثار و محبت، تہذیب و تمدن اور حب الوطنی کے پیغامات کو نظم کرکے پیغام محبت کو عام کیا۔

کیا دے سکے گا کوئی فریب نظر مجھے　　پہچانتا ہوں خوب ہر اک کی نظر کو میں
پھوٹے گی یاس سے بھی کوئی آس کی کرن　　تاریک شب میں ڈھونڈ رہا ہوں سحر کو میں
رہ رہ کے یاد آتی ہیں باتیں نئی نئی　　اک اک قدم پہ روکتا ہوں نامہ بر کو میں
تجھ سے پھر ایک تیرِ نظر کی ہے آرزو　　پاتا ہوں آج درد سے خالی جگر کو میں
اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں　　تکتا ہوں صبح و شام تری رہ گزر کو میں
مضطر یہ بات قدرِ ہنر کے خلاف ہے　　منہ کس طرح لگاؤں کسی بے ہنر کو میں [7]

مضطر کا یہ کلام ان کے زبان و بیان پر قدرت کا اظہار ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے آسان اور عام فہم الفاظ کا استعمال کرتے ہیں ان کے کلام میں جو نرمی دیکھنے کو ملتی ہے وہ خصوصیت انھیں امرتسر کے شعرا کی بھیڑ میں امتیازی مقام عطا کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں عہد حاضر کی جو عکاسی کی ہے وہ انسان کو غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

رام رتن مضطر کی غزلوں میں فصاحت و بلاغت، سادگی اور نفاست دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہیں۔ خصوصاً انھوں نے جو رباعیاں کہی ہیں ان میں ان کا فن بولتا نظر آتا ہے۔

جب میں نے کیا قصدِ گنہ دل نے کہا ہے　　دیکھے نہ زمانہ تو خدا دیکھ رہا ہے
اک وہ بھی ادا ہے تری اک یہ بھی ادا ہے　　در اصل کوئی چیز فنا ہے نہ بقا ہے [8]

ستیہ پال ملہوترہ عارف

نام ستیہ پال ملہوترہ عارف کی پیدائش 7/فروری 1924 میں ہوئی۔ انھوں نے عمر کا بیشتر حصہ خواب غفلت میں گذارا۔ پھر طبیعت شاعری کی جانب ملتفت ہوئی اور پینسٹھ سال کی عمر میں 1994 میں پہلا مجموعۂ کلام 'حرف حرف' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ دوسرا مجموعۂ کلام 1999 میں 'عقیدت' کے نام سے شائع ہوا۔ چھ سال بعد تیسرا مجموعۂ کلام 'درِ مرشد پر' کے نام سے چھپا۔

انھیں مترنکودری اور کالی داس گپتا رضا سے شرف تلمذ تھا۔ ان کے کلام کو فنی کسوٹی پر تو نہیں تولا جا سکتا البتہ ان کے کلام سے قاری کو حظ ضرور حاصل ہوتا ہے اور یہی عارف کا ہدف بھی تھا کہ قاری کلام کو پڑھ کر لطف اندوز ہو سکے۔ ان کی شاعری تلاش حق کی شاعری ہے۔ وہ خدا کی رحمتوں کا گن گان جس طرح کرتے ہیں وہ قابل رشک ہے۔ ان کے کلام میں ہمیں سادگی و بے تکلفی بھی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں خاصان خدا کے تئیں جو جذبۂ عقیدت و محبت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں دوہے کے علاوہ قطعات بھی کافی تعداد میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعری میں قطعہ کو کافی مقبولیت حاصل رہی ہے لیکن کم ہی ایسے شاعر ہیں کہ جنھوں نے اس صنف میں نئی راہ بنا کر اپنی اہمیت تسلیم کرائی ہو۔ عارف اردو کے ان شعرا میں ہیں جنھوں نے اس راہ میں بھی اپنی اہمیت منوائی۔ ان کا ایک مشہور قطعہ ہے۔

دل کس نے دیا ہے مجھے اس درد سے لبریز　　کس نے مجھے یہ درس محبت کا دیا ہے
عزت سے محبت سے مجھے ملنے لگے لوگ　　اعزاز یہ جو ہے مرے مرشد کی عطا ہے [9]

صداقت تو یہ ہے کہ ان کا سرمایۂ شاعری جستجو، عقیدت اور لگن کی شاعری ہے۔ انھیں جو خاصان خدا سے عقیدت و الفت ہے اس کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے ہوئے وہ نہیں تھکتے۔ اس طرح ان کا سرمایۂ شاعری اخلاق و نصیحت، عشق و عقیدت اور تلاش و جستجو کے مضامین سے پر ہے جو ان کے خدا ترس ہونے کی دلیل ہے۔

ستیہ پال طالب

ستیہ پال طالب کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے لیکن ایک حلقہ صحافی کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات کو سراہتا ہے اور وہ اس لیے کہ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو جالندھر میں ملازمت ہی نہ کی بلکہ ریڈیو میں ایسے پروگرام بھی ترتیب دیے کہ جس کی بدولت برقی ذرائع ابلاغ کو ترقی حاصل ہوئی لیکن ان کی شاعری میں جو جذب و کشش ہے وہ انھیں ایک اچھا اور اہم شاعر تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

ساقیا جام پلا پھر سے گھٹا چھائی ہے　　ورنہ ایسے میں تیرے فیض کی رسوائی ہے
ہم نے کل ہی تو نہ پینے کی قسم کھائی ہے　　ابر پھر اٹھا ہے پھر توبہ پہ بن آئی ہے
غم دوراں غم جاناں غم ہجراں طالب　　زندگی لائی تو کیا میرے لیے لائی ہے

ستیہ پال طالب کے اس لب و لہجے میں ان کا فکری رویہ اپنے خاص اسلوب میں جب ڈھل کر سامنے آتا ہے تو وہ اردو کے قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کے کلام میں جو رومانی کیفیتیں نظر آتی ہیں وہ اردو شاعری کا ایسا حصہ ہے جن سے ان کی شاعری کی منفرد شناخت بنتی ہے۔

ضیا فتح آبادی

امرتسر کے مشاہیر ادب میں ایک اہم نام مہر لال سونی ضیا کا بھی ہے۔ جن کا وطن مالوف تو فتح آباد ضلع امرتسر ہے لیکن ان کی پیدائش 9/فروری 1923 کو کپورتھلہ (پنجاب) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے انگریزی زبان میں ایم اے کی سند حاصل کی بعدہ ریزرو بینک آف انڈیا میں ڈپٹی چیف آفیسر کی حیثیت سے ملازمت کی، شعر و سخن کی دنیا میں آپ کو فرخ امرتسری، فیروز الدین طغرائی اور علامہ سیماب اکبر آبادی سے شرف شاگردی حاصل رہا۔ آپ نے اردو زبان کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزلوں کے مجموعے 'حسن غزل' اور 'دھوپ اور چاندی' کے نام سے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ نیز نظموں کا مجموعہ 'نور مشرق' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ غزلیں، نظمیں، گیت اور رباعیات کا مجموعہ 'گرد راہ' اور قطعات کا مجموعہ 'طلوع' کے نام سے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکا ہے نیز ایک کتاب 'شعر اور شاعر' (تذکرہ) بھی ہے جو اردو زبان و ادب کے شائقین کے لیے خاصی اہمیت کی چیز ہے۔ ضیا قادر الکلام شاعر ہیں وہ جس رنگ میں کہتے ہیں خوب سے خوب تر کہتے ہیں۔ امرتسر کے غزل نگاروں میں ان کی غزل بہت جاندار ہوتی ہے بطور مثال ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

جلووں سے معمور ہیں ہم　　پردوں میں مستور ہیں ہم
ذوقِ عمل پر شرمندہ　　سعی نامشکور ہیں ہم
قطرہ قطرہ ہیں دریا　　ذرّہ ذرّہ طور ہیں ہم
کالے سورج سے کہہ دو　　شمع شب دیجور ہیں ہم
ہم آہنگ یک جہتی　　آوازِ جمہور ہیں ہم
کچھ مرنے کا خوف اور کچھ　　جینے پر مجبور ہیں ہم
زخمی سینہ گیتی کا　　رستا ہوا ناسور ہیں ہم
کیسا علم، کہاں کا ہوش　　سودائی مشہور ہیں ہم
سولی دیکھی، بھاگ چلے　　کہتے تھے منصور ہیں ہم
ہم سے اتنے پاس ہو تم　　تم سے جتنے دور ہیں ہم
اڑیں تو رشکِ قوس قزح　　گریں تو چکنا چور ہیں ہم
ہاں روندو، پامال کرو　　خود دار اور غیور ہیں ہم
بزم میں نظاروں کی ضیا　　ناظر یا منظور ہیں ہم [10]

بلا شبہ ان کی غزل میں غزل کا حسن بھی ہے اور تغزل کی رعنائی بھی۔ انھوں نے سہل ممتنع میں اپنے افکار و خیالات کو جس خوبصورت پیرائے میں نظم کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

امرتسر میں اردو شاعری کے حوالے سے جن شعرا کے نام آتے ہیں ان میں ایک اہم نام مسٹر کرشن کمار عادل کا بھی ہے، وہ امرتسر کی انجمن ایوان ادب کے سیکریٹری بھی رہے، صداقت تو یہ ہے کہ ان کی سعی پیہم کے سبب اس انجمن کو بہت فروغ حاصل ہوا، اس پس منظر میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی خدمت شعری زیادہ قابل قدر ہے۔

کرپا رام شرما ناظم امرتسری

کرپارام شرما ناظم منفرد لب ولہجے کے شاعر تھے۔ ان کی پیدائش 8/نومبر 1891 میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام پنڈت رام رتن تھا ابھی ولادت کے بیس دن ہی ہوئے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا چنانچہ ان کے ماموں پنڈت گنگا بشن نے ان کی پرورش کی، ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی چند ماہ بعد گورنمنٹ اسکول امرتسر کی برانچ میں داخلہ لیا۔ پنڈت بیج ناتھ ہائی اسکول سے انٹرنس کا امتحان دے کر خالصہ کالج سے کیمسٹری اور فارسی میں 1913 میں بی۔ اے کیا اور اکتوبر 1913 میں خالصہ کالج میں ملازم ہو گئے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے 14-1913 میں بزم ادب کی بنا ڈالی تو آپ بزم کی مجلس مشاعرہ کے سکریٹری منتخب ہوئے لیکن افسوس کہ جب 1919 میں مارشل لا کے حادثے کے سبب یہ بزم درہم برہم ہو گئی تو دیوان امرناتھ محسن، غلام قادر فرخ اور ایمن صاحب کے ایما پر امرتسر میں بزم سروش کی بنا رکھی گئی۔ اس بزم کے منشی غلام قادر فرخ صدر تھے اور پنڈت کرپارام شرما ناظم اس بزم کے معتمد منتخب کیے گئے۔ بزم کے سالانہ اجلاس میں ناظم نے 'اردو خانم کا استغاثہ' نامی عنوان سے مضمون پڑھا جسے بے حد پسند کیا گیا۔

1924 میں خالصہ کالج مینیجنگ کمیٹی سے مسٹر واڈن پرنسپل کے مستعفی ہونے پر ناظم نے بھی کالج سے استعفیٰ دے دیا اور تجارت کرنے لگے لیکن ناگزیر وجوہات کے سبب تجارت کے پیشے کو چھوڑنا پڑا بالآخر 1930 میں لا کالج لاہور میں داخلہ لیا اور 1932 میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے امرتسر میں وکالت شروع کی۔ 1934 میں دیوان امرناتھ محسن کی بے وقت وفات کے بعد 'بزم سروش' کے 1938 تک سکریٹری رہے لیکن افسوس کہ 1938 میں دختر کی وفات کے سبب بزم سے مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئے۔

پنڈت کرپارام شرما ناظم اچھے وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین شاعر ہی نہیں شعرا کے نسل کی رہنمائی وسرپرستی بھی کرتے رہے۔ غزل سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ان کی غزلوں میں محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی پائی جاتی ہے ساتھ ہی حسن وعشق کے مضامین میں بھی فکر اور نصیحت کے مضامین ملتے ہیں ان کا کہنا ہے۔

دیکھنے والوں میں چشم قیس ہی شامل نہیں　　کون سا ذرہ ہے جو معشوق کا محمل نہیں
ہے تلاش دلربا میں حور کا قائل نہیں　　خلد بھی اک رہ گذر ہے یہ مری منزل نہیں
پستیِ اندیشۂ انساں اگر حائل نہیں　　منزل و رہرو میں کوئی بھی حدِ فاصل نہیں
موت کیا ہے کشمکش میں التوائے عارضی　　بحرِ ہستی میں جزیرہ سا ہے یہ ساحل نہیں
سیل عصیاں اس طرف طوفانِ رحمت اس طرف　　میں ادھر غافل نہیں ہوں وہ ادھر غافل نہیں
سجدہ ہائے بے تمنا اور دعا بے آرزو　　عاشق مخلص ہوں ناظم میں کوئی سائل نہیں

کرپارام شرما ناظم کی غزلوں میں حسن وعشق کے مضامین میں جہاں ایک طرف داخلی کیفیت ملتی ہے تو دوسری جانب زندگی کے تقاضے بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں زندگی کے حسن سے واقف کراتے ہوئے حسن وعشق کی کہنہ حقیقت کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ وہ اپنے عہد کے ایسے باکمال اور باوقار شاعر تھے جن کے افکار و خدمات کو ادب کا کوئی بھی ناقد نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کرشن کمار عادل امرتسری

امرتسر میں اردو شاعری کے حوالے سے جن شعرا کے نام آتے ہیں ان میں ایک اہم نام مسٹر کرشن کمار عادل کا بھی ہے۔ وہ امرتسر کی انجمن ایوان ادب کے سیکریٹری بھی رہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ ان کی سعی پیہم کے سبب اس انجمن کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس پس منظر میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی خدمت شعری زیادہ قابل قدر ہے۔

عادل امرتسری کو شعر وادب سے ذوق قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ انھوں نے مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی خصوصاً غزل ان کی پسندیدہ صنف تھی جس میں انھوں نے خوب گل بوٹے کھلائے ثبوت کے طور پر ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

کوئی سکوں سے کبھی زیر آسماں نہ رہا　　لبوں پہ کس کے یہاں نالہ و فغاں نہ رہا
وفور شوق سے سجدے کیے وہاں اتنے　　مری جبیں نہ رہی ان کا آستاں نہ رہا
ہمارے عشق کی شہرت کہاں کہاں نہ ہوئی　　تمھارے حسن کا چرچا کہاں کہاں نہ رہا
تری نگاہِ محبت ہے کیا مسرت خیز　　قدم زمیں پہ نہیں سر پہ آسماں نہ رہا
وہ دن گئے کہ حسینوں سے چھیڑ تھی عادل　　جواں ہوں اب بھی مگر دل میرا جواں نہ رہا

کرشن کمار عادل کی غزلوں میں ہمیں روایتی مضامین اور حسن وعشق کا بیان خوب ملتا ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں ایسی ہیں جن میں ہندوستانی زبان کا اثر غالب ہے۔ عادل کے کلام میں سلاست اور نغمگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اردو غزل میں حسن وعشق کے مضامین کے ساتھ تخیل کی بلندی کا ثبوت بھی خوب دیا اور اس طرح اردو غزل کو فنی وفکری بلندی عطا کی۔

امرتسر کے مندرجہ بالا شعرا کے کلام اس بات کے شاہد ہیں کہ انھوں نے اپنے تجربات، مشاہدات اور خیالات کو نظم کر کے ادب فہموں اور ناقدوں کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان شعرا نے اپنے قلم کے جوہر بکھیر کر اپنی اور پنجاب کی ایسی پہچان بنائی ہے جو مٹنے والی نہیں ہے۔

حواشی

1 مدیر فیض سرحدی، پرواز ادب، غزل نمبر، جولائی اگست 1979، ص:28
2 باوا بلونت سنگھ، ایک ادھین، ڈاکٹر دھرم پال سنگل، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ
3 رسالہ چمن، ج:2، جنوری: 1929، ص:42
4 بہارستان، مرتبہ ریاض قریشی، مطبوعہ مجلس منتظمہ آل انڈیا مشاعرہ امرتسر، ص:208
5 جذبات ہوش، بار اول، مطبوعہ آزاد بک ڈپو ہال بازار، امرتسر، ص:16
6 مدیر فیض سرحدی، پرواز ادب، غزل نمبر جولائی اگست 1979، ص:142
7 مضطر، چمنستان (مجموعۂ کلام) مطبوعہ آزاد بک ڈپو ہال بازار امرتسر، اکتوبر 1928، ص:66
8 ایضاً، ص:147
9 در مرشد پر، ستیہ پال ملہوترہ عارف، مطبوعہ خواجہ پریس، دہلی 2005، ص:59
10 مدیر فیض سرحدی، پرواز ادب، غزل نمبر جولائی اگست 1979، ص:38

Dr. Raihan Hasan
Dept of Urdu
Guru Nanak Dev University
Makka Singh Colony,
Amritsar-143005 (Punjab)

ممبئی

صہیب عالم

عرب تاریخی مطالعے کا ایک اہم ترین مرکز

’عروس البلاد‘ ممبئی طویل زمانے سے ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے۔ شہر کے چپے چپے پر عرب تجارتی قافلوں کی گواہی موجود ہے۔ یہ وہی شہر ہے، جہاں عرب تاجر خیمہ زن ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کے سمندر، زمین، گلیوں اور کوچوں کو اپنی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا، عرب میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ: ’الهند هندك، اذا قل ما عندك‘، یہ کہاوت عرب تاجروں پر صحیح ثابت ہوتی ہے، کیونکہ وہ سرزمین عرب سے خالی ہاتھ آئے تھے، اور ممبئی شہر میں رہ کر انھوں نے تجارت کے ذریعے کافی مال و دولت جمع کرلیا تھا، جنھیں آج کے حساب سے ارب پتی کہنا غلط نہ ہوگا۔ کچھ کپڑوں کے برانڈ جو عرب تاجروں نے ممبئی میں شروع کیا تھا آج بھی وہ برانڈ عرب دنیا کا سب سے اعلی برانڈ مانا جاتا ہے، جسے ہم ’شماغ احمر‘ کے نام سے جانتے ہیں۔

ممبئی میں کچھ عمارتیں، لائبریریاں، محلے، اور گلیاں آج بھی ان کی یادوں سے معمور ہیں۔ یہ عرب و ہند کی تاریخ کا سنہری باب ہے، جو ہمیں ان تجارتی قافلوں کی کہانیاں، اور ان کی تاریخ کو محفوظ کرنے پر مہمیز کرتا ہے۔ عرب و ہند کی تاریخ کا یہی باب ہے جس کا شوق مجھے کشاں کشاں ممبئی لے گیا۔ شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد اور ان کے رفیق کار ڈاکٹر محمد تابش خان نے اس شوق کو پورا کرنے میں میری معاونت کی۔ ہمارے احباب، جن میں خاص طور پر عبدالحسیب جامعی، جمال اصلاحی اور فیضی علی اصلاحی، نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنی مہمان نوازی سے ہماری حوصلہ افزائی کی۔

ممبئی تجارتی، اقتصادی اور تفریحی دارالحکومت ہے، جہاں زیادہ تر بڑی بڑی ہندوستانی و کثیر ملکی کمپنیوں کے دفاتر، بیشتر ہندوستانی بینکوں کے ہیڈ کوارٹرس ہیں۔ ممبئی شہر بحر عرب کے مغربی ساحل پر واقع ہے اور عالمی مالیاتی بہاؤ کے لحاظ سے، اس کا شمار دنیا کے دس بڑے تجارتی مراکز میں ہوتا ہے، یہ ہندوستان کی مجموعی گھریلو پیداوار کا 6.16% پیدا کرتا ہے۔ مصنوعات، صنعتی پیداوار کا 25%، اور سمندری تجارت کا 70% کی نمائندگی ممبئی ہی کرتا ہے۔ ہندوستانی معیشت کے 70% سرمائے کا لین دین یہیں سے ہوتا ہے۔ یہ ہندوستانی فلمی صنعت کا مرکز بھی ہے، جسے بالی ووڈ کے نام سے ہم جانتے ہیں، نیز ہندوستان کے کچھ معروف سائنسی اور جوہری اداروں کا مرکز بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممبئی کے کاروباری مواقع نے پورے ہندوستان سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

امریکی خانہ جنگی (1861-1865) کے دوران، ممبئی دنیا میں کپاس کی تجارت کی ایک بڑی منڈی بن کر ابھرا، جس کی وجہ سے اس کی معیشت مضبوط ہوئی، اور اس کی اقتصادی حیثیت نمایاں ہوئی۔ برطانوی استعماریت نے ممبئی کو ہندوستان اور خلیج عرب کا انتظامی مرکز کے طور پر استعمال کیا، کیونکہ ممبئی بحر عرب کی سب سے بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا، اس طرح یہ ایک قدیم ماہی گیر برادری اور تجارتی نوآبادیاتی مرکز کی وجہ سے جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ پارسی، گجراتی، میمنی اور بوہرہ برادریوں نے اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستانی اور برطانوی مورخین نے اسے مشرق کا سب سے خوبصورت شہر قرار دیا، کیوں کہ یہ مغرب کے کسی بھی شہر سے کمتر نہیں تھا، اس کی جغرافیائی، تجارتی اور ثقافتی اہمیت اور اس میں منفرد شاندار تاریخی آثار کی موجودگی نے ’عروس البلاد‘ کا خطاب حاصل کیا۔

سر سید احمد خان جب 1896 میں انگلستان کے لیے روانہ ہوئے، تو ممبئی تشریف لے گئے اور اس کے بارے میں لکھا: ’’ممبئی ایک بہت بڑا تجارتی مرکز ہے، اور اس شہر میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی ہندوستانی شہر سے تعلق رکھتی ہو، جیسا کہ یہ انگریز شہر جیسا لگتا ہے۔‘‘ بہت سے ہندوستانی مسافرین، جو ممبئی سے جدہ یا خلیج عرب جیسے احسا، شارجہ، دبئی، ابوظہبی، اور مسقط، گئے، انھوں نے ممبئی کی تجارت، عرب اور ہندوستانی تاجروں کا ذکر اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔

1970 کی دہائی سے ممبئی کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ممبئی میں جگہ کی کمی کی وجہ سے، اس کے مضافاتی علاقے جیسے: باندرہ اور واشی وغیرہ میں تیزی سے تعمیری

کام شروع ہوئے، جلد ہی یہ علاقے گنجان شہر میں تبدیل ہوگئے۔ ان لوگوں کی اکثریت کا تعلق اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش اور تامل ناڈو سے ہے، جو اپنے گھربار چھوڑ کر کام اور ملازمت کے مواقع کی تلاش میں نقل مکانی کر کے آئے اور یہیں آباد ہوگئے۔

'کوکن' ہندوستان کے تین ساحلی علاقوں پر مشتمل ہے، عرب تاجر نہ صرف سندھ بلکہ ان علاقوں میں کثرت سے آئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے بھی ان کی آمد و رفت تھی، اور ان کی تجارت ان علاقوں کے علاوہ بھٹکل، کیرالہ اور سرندیپ وغیرہ (سری لنکا) میں بھی تھی۔ نتیجتاً، ان میں سے بہت سے تاجر یہیں آباد ہوگئے، اور مقامی لوگوں میں شادیاں کیں، جس کے سبب بعض کوئی برادری کے افراد کا تعلق عرب نسل سے ہے، اس لیے آپ کو بھیونڈی، بھٹکل اور کیرالہ میں ایسے لوگ ملیں گے جن کی شکل عرب باشندوں سے ملتی جلتی ہوگی، ان میں اکثریت ان عرب تاجروں کی اولاد ہے، جو عراق اور جزیرہ نما عرب سے آئے تھے۔ بہت سے مقامی لوگ عربوں کی ایمانداری اور حسن سلوک سے بہت متاثر ہوئے، اور ان عربوں کا اثر اس قدر ہوا کہ ساحلی علاقوں کے لوگوں کی اکثریت خواہ ان کا تعلق کوکن، بھٹکل یا کیرالہ سے ہو، شافعی مسلک کی پیروی کرنے لگے۔ کوکن کے لوگ کوکنی زبان بولتے ہیں، جو مراٹھی، عربی اور فارسی زبانوں سے قدرے مشترک ہے۔ جب حجاج کے لیے سمندری جہاز اکلوتا ذریعہ تھا تو ممبئی ہندوستان بھر کے حجاج کرام کے لیے ایک بڑا اور اہم مرکز تھا، سمندری تجارت کی تاریخ بھی ممبئی کی اہمیت اور مرکز کی تصدیق کرتی ہے، جس پر پرتگالیوں کے قبضے سے قبل عربوں کی اجارہ داری تھی۔

ممبئی کا سب سے قدیم، مشہور اور تھوک بازار 'کرافورڈ مارکیٹ' ہے، جس کی تعمیر 1869 میں ہوئی۔ یہ بازار 1864-1884 کے دوران ممبئی میونسپلٹی کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا، اور اس کا ڈھانچہ کرلا نامی کھردرے قسم کے نارنجی پتھروں سے بنا ہوا ہے، جس میں باسین کے سرخ پتھر کا استعمال ہوا ہے۔ یہ برطانوی فن تعمیر کا بہترین نمونہ کے طور پر جانا جاتا ہے، اور ہندوستان میں جدید اہم تاریخی یادگاروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ بھنڈی بازار کرافورڈ مارکیٹ کے پیچھے واقع ہے، جو کبھی کچھ عرب گھوڑوں کے تاجروں کا صدر دفتر تھا، انھوں نے یہاں اپنا اصطبل بھی بنایا تھا، اور اس وقت تھوک تجارت کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ عرب تاجر یہاں طویل عرصے تک مقیم رہے، اور ان میں سے کچھ لوگ ممبئی میں وفات پائے، ممبئی کے قبرستان کے بعض کتبے آج بھی اس کے گواہ ہیں۔ کرافورڈ مارکیٹ کے قریب 'بدری بلڈنگ' ہے، جو کبھی کچھ نجدی سوداگروں خاص طور سے 'بسام کا خاندان' کی رہائش گاہ تھی۔ یہاں عبدالرحمٰن اسٹریٹ بھی ہے، جو نجدی گھوڑوں کے سوداگر 'عبدالرحمٰن منیع' سے منسلک ہے، یہ بحث و تحقیق کا موضوع ہے۔

اس گلی کے قریب ایک 'سنٹرل ریسٹورنٹ' ہے، جو ہندوستان کی آزادی سے قبل عرب تاجروں کی مجلس اور ان کے کیفے کے نام سے جانا جاتا تھا، اور عرب تاجر یہاں اکثر آتے، بیٹھتے، کافی پیتے، باتیں کرتے تھے۔ اسی جگہ سوتر چال اسٹریٹ بھی ہے، یہ گلی کاٹن اور کپڑوں کا ایک مشہور بازار ہے، یہاں عرب تاجروں کی کچھ دکانیں ہوا کرتی تھیں، اور اسی کے ساتھ 'زیوری بازار' ہے جو اس وقت 'موتی بازار' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ بازار جزیرہ نما عرب اور خلیج عرب کے موتیوں اور زیورات کے تاجروں کا صدر مقام تھا۔ ان تاجروں نے ممبئی کے باشندوں میں اچھی شہرت حاصل کی، اور ان عربوں نے یہاں ایک بحری ٹرانسپورٹ کمپنی انگلش ٹرانسپورٹ کمپنی کے مقابلے قائم کی، جو کافی کامیاب تھی۔

ممبئی کی شہ سواری کی تاریخ گھوڑوں کے عرب تاجروں کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے، ان تاجروں میں عبدالرحمٰن منیع، عیسیٰ راشد قرطاس اور ابراہیم بن علی کے نام اہم ہیں جنھیں ہندوستان کے تجارتی حلقوں میں ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی، ان لوگوں کا تجارتی اور اقتصادی طور پر مقامی اور غیر ملکی تاجروں میں گہرا اثر تھا۔ عبدالرحمٰن منیع نے عرب سوداگروں کے ساتھ مل کر ممبئی کے 'بھنڈی بازار' میں گھوڑوں کے اصطبل قائم کیے۔ اگر ہندوستان کی شہ سواری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ گھوڑوں کے عرب تاجروں نے اس کی حوصلہ افزائی کی، اور اسے فروغ دیا، اور پھر یہ فن ہندوستان اور یورپی ممالک میں مشہور ہوگیا۔

ہندوستانی اور نوآبادیاتی کھیلوں کی تاریخ اس کی گواہ ہے، اور اس کے شائقین جوق در جوق اس میں شرکت کے لیے آنے لگے۔ اسی طرح ہندوستان، خاص طور سے ممبئی میں، عرب کے گھوڑوں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ نجدی گھوڑوں نے کئی بار شہ سوار کپ جیتے، اور ممبئی میں ایک شہ سواری کا میدان بھی بنایا گیا، جسے ہم 'مہالکشمی اسکوائر' کے نام سے جانتے ہیں۔ تقریباً 1880 میں، بائی کلا سے یہ ریس ٹریک اسی میدان میں منتقل ہوا، ممبئی میں بائی کلا عربی گھوڑوں کا سب سے مشہور بازار تھا۔ اس کے سب سے اہم حامیوں میں عرب تاجر بھی شامل تھے، جن کے پاس عالیشان ریسنگ گھوڑے تھے، اور اس وقت پانچ سو سے چھ سو گھوڑے اس میدان میں دیکھے جاسکتے تھے۔ اس لیے ممبئی عرب ریسنگ کا مرکزی ہیڈ کوارٹر بن گیا، ممبئی میونسپلٹی نے شہر کے قلب میں سیاہ گھوڑے کا ایک مجسمہ نصب کیا ہے جسے ''کالا گھوڑا'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ممبئی کی شہ سواری کی پرانی ثقافت کی یادگار نشانی ہے۔ ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے ہوئے شاہ سعود بن عبدالعزیز کا ہندوستانی اور عرب شخصیات کی موجودگی میں اسی میدان میں پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔

میں نے ممبئی کی جامع مسجد کی زیارت بھی کی۔ اس مسجد کا سنگ بنیاد 1775 میں قاضی حسین بلاکر کے ہاتھوں رکھا گیا اور تعمیر کا کام 1802 تک مسلسل جاری رہا، اور اس مسجد کا نام 'آخرت کا جہاز' رکھا گیا۔ اس مسجد سے ملحق ایک محمد یہ اسکول کی بنیاد رکھی گئی جو آج 'محمد یہ سیکنڈری اسکول' کے نام سے جانا جاتا ہے، اسی مسجد سے ملحقہ ایک لائبریری بھی قائم کی گئی۔ یہ لائبریری مسجد کی بالائی منزل پر ہے۔ اس لائبریری کو دیکھنے، یہاں بیٹھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اس میں ہزار سے زائد عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات ہیں، یہ علمی خزانہ ان قیمتی خزانوں میں شمار ہوتا ہے جو نایاب اور کمیاب ہیں۔ ان مخطوطات کی دیکھ بھال عبدالمتین بستوی مفتی اشفاق قاضی کی سربراہی اور نگرانی میں کر رہے ہیں، مفتی اشفاق اسی مسجد میں فیملی گائیڈنس سینٹر بھی چلا رہے ہیں۔ ان کے ہمراہ میں نے مسجد، لائبریری اور فیملی گائڈینس مرکز کی زیارت کی۔

میں نے مہاراشٹر آرکائیوز کا بھی دورہ کیا، جو جنوبی ممبئی میں ایلفنسٹن کالج کے اندر واقع ہے۔ اس ارکائیوز کی بنیاد اگست 1821 میں رکھی گئی، جس کا مقصد سیکرٹری کے دفتر، اور پریذیڈنسی اور دیگر دفاتر کا ریکارڈ حاصل کرنا اور جمع کرنا تھا۔ مسٹر ولیم ویزن کرافٹ اس دفتر میں ریکارڈ کے پہلے کیپر تھے، اور اس ارکائیوز میں 1630 سے 1955 تک کے ریکارڈ ہیں، اور ان میں حجاز، نجد، خلیجی ممالک، عرب ممالک اور بحر احمر پر واقع ممالک سے متعلق بہت سے اہم دستاویز اور فائلیں موجود ہیں۔ مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے ہندوستانی اخبارات خاص طور پر ٹائمز آف انڈیا کے تراشے بھی کچھ فائلوں میں محفوظ کیے گئے ہیں۔ ان دستاویزوں میں جزیرہ نما عرب، شخصیات اور ان کی تجارت کے بارے میں قیمتی معلومات موجود ہیں۔ ہندوستان اور جزیرہ نما عرب کی تاریخ پر کسی بھی سنجیدہ تحقیق کے لیے ایک اہم مرجع ہے، کیونکہ یہ ایک اہم اور انمول تاریخی ورثہ ہے۔ یہ بحر ہند کی تاریخ کا ایک بڑا

اوراہم ذخیرہ بھی ہے، میں نے 'جزیرہ نما عرب کی تاریخ' سے متعلق کچھ اہم دستاویزات دیکھے، مجھے ان میں محمد مشاری،مقبل ذکیراور دیگر عرب تاجروں کا ذکر ملا، نیر ان کے دفاتر کے پتے، اوران بینکوں کے ناموں کا ذکر بھی ملا جس سے ان کالین دین تھا، ان کی کمپنیوں کے نام،تجارت کی اقسام وغیرہ سے بھی واقفیت ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تاریخی ذخیرہ ایک اہم قومی ورثہ اورخزانہ ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی آف ممبئی کی بنیاد سر جیمز میکنٹوش نے رکھی تھی، جو ممبئی میں برطانوی بادشاہ کے رجسٹرار یا جج تھے، اور یہ مشرقی علوم وفنون اور مختلف ادب کا اہم علمی ذخیرہ ہے، اور اس میں سنسکرت، عربی، فارسی، اردو اور پراکرت زبان کے 3,000 سے زیادہ مخطوطات موجود ہیں جو ہندوستان اور نیپال کے مختلف حصوں سے جمع کیے گئے ہیں۔ ان مخطوطات کا تعلق لسانیات، علم طب، علم نجوم، علم فلکیات، قصے کہانیوں وغیرہ سے ہے۔ اس سوسائٹی میں عربی خطاطی، ڈرائنگ، اور پینٹنگ کے اعلی نمونے بھی ہیں۔علم انساب، سفرنامے اور مختلف علوم وفنون اور ادب سے متعلق 15,000 سے زیادہ نایاب اور 250,000 سے زیادہ کتابیں، اخبارات اورنادر اخبارات کوبھی محفوظ کیا گیا ہے۔

1874 میں، مسلمانوں کے ایک نمائندہ گروہ نے 'انجمن اسلام' کے نام سے ایک اسلامی تنظیم کی بنیاد رکھی اور اسی کی نگرانی میں 'کریمی لائبریری' کے نام سے ایک لائبریری بھی قائم کی گئی، جس میں عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ملیالم کی 50,000 سے زیادہ نایاب کتابیں موجود ہیں۔ ایک بڑی تعداد میں مخطوطات بھی محفوظ ہیں۔ اس میں مختلف زبانوں میں جاری ہونے والے ہندوستان کی آزادی سے پہلے شائع ہونے والے اخبارات اوران کی کاپیاں بھی ہیں۔

1912 میں صابو صدیق مسافرخانہ کے باضابطہ افتتاح سے پہلے، برصغیر پاک و ہند میں ڈھاکہ سے دہلی تک کے زائرین ممبئی کی بندرگاہ کے قریب خیمے لگاتے تھے اور وہیں جہازوں کا انتظار کرتے تھے، جو انھیں جدہ لے جاتے اور واپس لاتے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتے اور بہت ساری مشکلات اور اذیتوں سے دوچار ہوتے تھے۔ایک باوقار سرائے کا قیام وقت کی ضرورت تھی، اس غرض کے لیے حاجی صابو صدیق نے 5 ہزار روپے کی رقم عطیہ کی، جو اس وقت ایک بڑی رقم تھی، اور اس وقت کے گورنر جارج سڈنیم کلارک نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کی عمارت 1909 میں بننی شروع ہوئی۔ اب ممبئی کی تاریخ ایک صدی قبل قائم ہونے والے صابو صدیق ہاسٹل کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہ ہندوستانی زائرین کے لیے گیسٹ ہاؤس کے طور پر معروف ومشہور ہوگیا۔ یہ سرائے ایک صدی تک عازمین حج کے لیے سرائے کا کام کرتی رہی۔ اس کی ایک شاندار تاریخ ہے، جس کے بارے میں لکھا جانا اہم ضرورت ہے۔تاکہ ہندوستان میں حج اور عازمین کی خدمت میں اس کے کردار کواجاگر کیا جاسکے۔ اسے کبھی 'باب مکہ' کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، آج نئی نسل کرافورڈ مارکیٹ میں موجود اس تاریخی عمارت کے قدیم محراب والے دروازوں سے گزرتی ہے، لیکن اس کے تاریخی ورثے کی اہمیت سے ناواقف ہے۔ یہ سرائے چارمنزلہ عمارت 114 سال سے قائم ہے، اس میں 89 کمرے اور زیریں منزل پر ایک مسجد ہے۔ ہمارے موجودہ دور میں، بالخصوص 1995 سے ہندوستانی حکومت نے بھارت سے سمندری راستے سے حج کومکمل طور پر روک دیا ہے۔ اس سے اب کوئی ہندوستانی حاجی سمندری سفرنہیں کرتا ہے، یہ سرائے اس سے متاثر ہوئی، کیونکہ اب یہ ان زائرین کے لیے جگہ نہیں رہی، جو انفرادی طور پر یا گروہوں میں آتے تھے، اوراب یہ ان مریضوں کی پناہ گاہ بن چکی ہے جو ممبئی میں علاج کے لیے آتے ہیں، اور بہت کم تعداد میں حج اور عمرہ کے زائرین اس سرائے میں اب قیام کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ عمارت بڑی حد تک ہاسٹل، اسکول اور ووکیشنل کورس سینٹر کے طور پر استعمال ہورہی ہے۔

ہندوستان اور جزیرہ نما عرب کی تاریخ پر کسی بھی سنجیدہ تحقیق کے لیے ایک اہم مرجع ہے، کیونکہ یہ ایک اہم اور انمول تاریخی ورثہ ہے۔ یہ بحر ہند کی تاریخ کا ایک بڑا اور اہم ذخیرہ بھی ہے، میں نے 'جزیرہ نما عرب کی تاریخ' سے متعلق کچھ اہم دستاویزات دیکھے، مجھے ان میں محمد مشاری، مقبل ذکیر اور دیگر عرب تاجروں کا ذکر ملا، نیر ان کے دفاتر کے پتے، اور ان بینکوں کے ناموں کا ذکر بھی ملا جس سے ان کالین دین تھا، ان کی کمپنیوں کے نام، تجارت کی اقسام وغیرہ سے بھی واقفیت ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تاریخی ذخیرہ ایک اہم قومی ورثہ اور خزانہ ہے۔

ممبئی میں اپنے قیام کے دوران خلافت سوسائٹی کے ہیڈکوارٹر جسے 'خلافت ہاؤسز' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے بانیوں کے جزیرہ نمائے عرب کے حکمرانوں اور شخصیات سے گہرے روابط تھے اور وہاں ایک پرانی لائبریری موجود تھی جو بند کردی گئی، لیکن میں نے سنا ہے کہ اس میں عرب رہنماؤں کے اہم دستاویزات، رسائل، مکتوبات اور تحریریں محفوظ تھیں، اوراب اس خلافت ہاؤس کو خلافت ایجوکیشنل کالج میں تبدیل کر دیا گیا، اس طرح میں نے الصباح اور الجبریہ کمپلیکس کو دیکھا جو کبھی کویت کے حکمران خاندان کی ملکیت میں تھا، یہ کمپلیکس میرین ڈرائیو پر واقع ہے، یہ میرین ڈرائیو 'ملکہ کا نیکلس' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، جو بحر عرب کے ساحل کے ساتھ نیرمن پوائنٹ اور ملبار پہاڑی کے درمیان واقع ہے۔

میں نے ممبئی شہر کا سفر کیا، جو جزیرہ نمائے عرب کی اقتصادی تاریخ کا ایک اہم اور روشن باب ہے۔ میں اس کی بہت سی گلیوں میں گھوما، جو عرب تاجروں کے دفاتر اور رہائش گاہوں کے لیے مشہور تھیں، جیسے: بھنڈی بازار، محمد علی روڈ، عرب اسٹریٹ، عبدالرحمٰن اسٹریٹ، ناگ دیوی سٹریٹ، وغیرہ۔ میں نے ان کی رہائش گاہوں اور دفاتر کی کچھ تصویریں لیں، لیکن اب یہ پرانی عمارتیں نئے 50 منزلہ رہائشی ٹاورز میں تبدیل ہونا شروع ہوگئی ہیں، جنھیں بوہرہ کمپنی تیار کر رہی ہے، اورانھیں وہ عربی نام دے رہی ہے، جیسے کہ 'السعادہ ٹاور'، 'النصر ٹاور' وغیرہ۔ یہ کمپنی بھنڈی بازار اور آس پاس کے علاقے میں 11 ٹاور بنائے گی۔ ان جگہوں کی تاریخ کو قلم بند کرنا وقت کی اشد ضرورت ہے، جو پہلے عرب تاجروں کی ملکیت میں تھیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، ہم ان رہائش گاہوں اور دفاتر کو دستاویزی شکل دینے کے بارے میں سوچیں، کیونکہ ان کی موجودگی ہند-عرب تعلقات کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اور ممبئی کی تاریخ خاص طور پر برطانوی نوآبادیاتی دور میں ان کی تجارتی اور اقتصادی تاریخ ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ جہاں ہمیں دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے میں ان کے نمایاں کردار کو یاد رکھنا چاہیے، تاکہ ان کی تاریخ کو فراموش نہ کردیا جائے۔

■

Dr. Suhaib Alam
Asst. Prof. Dept of Arabic
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9811159071
Email.: salam5@jmi.ac.in

شیخ ظہور عالم

اظہار الاسلام کے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت

جدیدیت کے پیروکار اظہار الاسلام مغربی بنگال کے جید افسانہ نگار رہے جنھوں نے معیار و مقدار کا خاص خیال رکھا۔ ان کے افسانے ملک اور بیرون ملک کے معیاری رسالوں میں چھپ کر اصول نقد کے معلمین سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان ناقدین میں شمس الرحمن فاروقی ،شرف عالم ذوقی، ابوذر ہاشمی، ڈاکٹر عشرت بیتاب، ڈاکٹر مشتاق انجم اور مقصود دانش وغیرہ شامل ہیں جنھوں نے ان کے افسانوں کے دروبست میں اپنی ناقدانہ بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے افسانوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان کی شخصیت، حیات اور فن پر کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے بھی منظرِ عام پر ہیں واپسی اور کانچ کا پل۔ ان کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ معیاری افسانے تخلیق کرنے کے باوجود انھوں نے افسانوی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ دوست واحباب کے اصرار پر 17 سال بعد مجموعہ 'واپسی' کے ذریعے افسانوی کینوس میں واپسی ہوئی۔ یہ مجموعہ 1998 میں آلہ آباد، کتاب گھر 'شب خون' کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ جس کے پیش لفظ میں شمس الرحمن فاروقی رقمطراز ہیں:

''میں اظہار الاسلام کے افسانے ایک عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ فنی اعتبار سے انھوں نے ایک ایسی راہ ہمیشہ اختیار کی جو دو انتہاؤں کے بین بین چلتی ہے یعنی وہ نہ تو بالکل شفاف اور ایک برابر ایک طرح کا افسانہ لکھتے ہیں جس سے قاری کو کسی قسم کی ذہنی یا روحانی الجھن نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ تجریدی وعلامتی طرز کی ان وادیوں کی سیر کراتے ہیں جہاں قاری کو قدم قدم پر ٹھٹھک کر معلوم کرنا پڑتا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ صاف اور یک سطحی طرز کے افسانے کے مقابلے میں موخر الذکر افسانہ یقیناً بہتر ہے۔ یعنی براہ راست بات کہنے کے بجائے علامت، استعارہ اور تجرید کے پردے میں بات ہمیشہ زیادہ خوبصورت بن جاتی ہے۔ اظہار الاسلام نے جو بیچ کی راہ اختیار کی تو اس کی بنا پر وہ سیدھے اور یک سطحی بیان سے محفوظ رہتے ہوئے بھی ایک طرح کی پیچیدگی اور بالواسطگی کو اختیار کر سکے۔ لہٰذا وہ قاری بھی جو بالواسطہ بیان کو پسند کرتے ہیں۔ اظہار الاسلام کو خوش ہو کر پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔ (مجموعہ 'واپسی' پیش لفظ)

شمس الرحمن فاروقی کے اس قول سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اظہار الاسلام نے تین طرح کے افسانے خلق کیے ایک بیانیہ اسلوب دوسرا علامتی و تجریدی اسلوب اور تیسرا بیانیہ اور تجریدی اسلوب کے بین درمیانی راہ جن کے بیشتر افسانے اسی راہ کی زائیدہ ہیں۔ بقول شمس الرحمن فاروقی:

''افسانہ وہی اچھا ہوتا ہے جس میں نتیجہ یا نتائج خود قاری نکالے۔ اظہار الاسلام اس نقطے کو بخوبی جانتے ہیں۔''
(مجموعہ 'واپسی' پیش لفظ)

مجموعہ 'واپسی' میں کل 18 افسانے ہیں اور مجموعہ 'کانچ کا پل' میں 21 افسانے اس طرح دونوں مجموعوں میں شامل افسانوں کی تعداد 39 ہے لیکن بعض افسانے دونوں میں مشترک ہیں۔ اس طرح کل افسانوں کی تعداد 31 بنتی ہے۔ بنگال کے آسنسول کے شہر رانی گنج میں ان کی پیدائش 10 فروری 1949 کو ہوئی۔ بالکل سنِ صغیر میں والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ پرورش والدہ کے بغیر والد اور بڑی بہن اقلیمہ کے ہاتھوں ہوئی۔ وہ بچپن سے ہی تنہائی کے عادی تھے۔ ہر روز جب والد صبح سویرے کام پر روانہ ہوتے تو دونوں بچوں کو ایک کمرے میں بند رسالوں کے سپرد کر جاتے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچپن سے ہی کہانیوں کو پڑھنا اور خیالوں میں غرق رہنا شروع کر دیا۔ رسالوں اور کتابوں کے مطالعے، شہر رانی گنج کا قدرتی ماحول، دوست واحباب کی بزم اور جغرافیائی خدوخال نے بہت جلد ان کی ذہنی آبیاری شروع کر دی۔ اوائل عمری میں انھوں نے مشرق و مغرب کے بڑے بڑے ادیبوں، فلسفیوں، مفکروں اور دانشوروں کو پڑھ ڈالا۔ ان ادیبوں میں پریم چند، بیدی، منٹو، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، الیاس احمد گدی، عبداللہ حسین، انتظار حسین، مشتاق احمد یوسفی، ابن صفی، قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد وغیرہ مشرق کے ہیں جب کہ مغربی مفکرین میں ورجینا وولف، موپاساں، ہنری۔ جیمس جوائس، سارترے، کامیو، چیخوف، گراہم گرین وغیرہ کے نام آتے ہیں جن کی تحریروں نے ان کے اندر بیٹھے تخلیق کار کو بیدار کیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک کہانی کار اور افسانہ نویس تھے۔ جن کو کہانیوں کے گھڑنے

کا اچھا سلیقہ آتا تھا۔ پہاڑی علاقے، سطح مرتفع، قدرتی چٹان اور کالے ہیرے کے شہر سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں منظر کشی، واقعہ طرازی، جزئیات نگاری، کردار بندی اور ماحول تراشی درجۂ کمال کی ہے۔ ان کے افسانوں میں ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ اس تخلیقی سفر میں وہ ہمیں نئی دنیا کی سیر کراتے ہیں ایک ایسی دنیا جن کے پردے ہم پر دھیرے دھیرے وا ہوتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کی کارفرمائیاں ان کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''یوں تو اظہارالاسلام کے افسانے بہار اور بنگال کے اس علاقے سے متعلق ہیں جسے سیاہ الماس (Black Diamond) یا کوئلے کا علاقہ (Coal Field) کہا جاتا ہے لیکن ان کے افسانوں کا فکری پس منظر کوئلے کے

ہندوستانی تہذیب و ثقافت، معاشرتی زندگی، سیاسی سرگرمیاں، تمدّنی ماحول، اقتصادی لین دین، بنگالی کلچر، کردار، بھاشائیں، کلکتہ اور اس کے مضافاتی علاقے ان کے افسانوی سیاق کا حصّہ بنے، جس کا پر تو ان کی کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔ اس زمرے میں آنے والے ان کے افسانوں میں وہ آدمی، الائو، موہن دھیر، پرندے، کانچ کا پل، دھنک کا ساتواں رنگ، چہکار، چوبارہ، دائرے، پوسٹ مارٹم، اجالے کی مہک، جہاں اندھیرا ہانپتا ہے، ڈیڑھ منزلہ سورج، دھواں اور آخری شب کا کرب وغیرہ میں ہندوستانی عناصر کی بھر مار دکھائی دیتی ہے۔

میدانوں تک محدود نہیں وہ اکثر ہمیں نئی دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں لیکن بالواسطہ اور خفیف اشاروں کے ذریعہ۔ اس طرح ان کا افسانہ یک سطحی ہونے سے بچ جاتا ہے۔''

(مجموعہ 'واپسی' پیش لفظ)

ان کی تخلیقی اپج میں سیر وسیاحت کا برابر عمل دخل ہے۔ ایام جوانی میں انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر پوری دل جمعی کے ساتھ کیا۔ انھوں نے کشمیر کی وادیوں، دہلی کے گلیاروں، ممبئی کی چوپاٹیوں، گوا کی لہروں، دارجلنگ اور گینگٹاک کی پہاڑیوں اور کلکتہ کی سڑکوں کا گہرا مشاہدہ کیا۔ ہندوستانی تہذیب وثقافت، معاشرتی زندگی، سیاسی سرگرمیاں، تمدّنی ماحول، اقتصادی لین دین، بنگالی کلچر، کردار، بھاشائیں، کلکتہ اور اس کے مضافاتی علاقے ان کے افسانوی سیاق کا حصّہ بنے، جس کا پرتو ان کی کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔ اس زمرے میں آنے والے ان کے افسانوں میں وہ آدمی، الاؤ، موہن دھیر، پرندے، کانچ کا پل، دھنک کا ساتواں رنگ، چہکار، چوبارہ، دائرے، پوسٹ مارٹم، اجالے کی مہک، جہاں اندھیرا ہانپتا ہے، ڈیڑھ منزلہ سورج، دھواں اور آخری شب کا کرب وغیرہ میں ہندوستانی عناصر کی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔

کانچ کا پل، ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو مغربی بنگال اردو اکادمی کے مالی تعاون سے 2015 میں شائع ہوا۔ اس کا پہلا افسانہ 'وہ آدمی' ہے۔ کہانی میں آغاز سے انجام تک تسلسل کی لے باقی ہے۔ کہانی کے اختتام پر اس راز سے پردہ اٹھتا ہے کہ وہ آدمی جو راوی کا پیچھا کرتا ہے وہ کوئی اور نہیں خود اس کا ضمیر ہے۔ جواب مرچکا ہے اور موسلا دھار بارش میں اس کی لاش بھیگ رہی ہے۔ اس افسانے کی خاص خوبی اس کی عصری معنویت ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع چھیڑتا ہے جس پر کم وبیش تمام افسانہ نگاروں نے لکھا ہے لیکن اس کی خاص خوبی اس کا علامتی اور تجریدی اسلوب ہے۔ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال پر بحث کرتے ہوئے افسانہ نگار نے رشوت ستانی (Bribe) کو اپنا موضوع بنایا۔ یہاں ہر دس میں سے آٹھ اس جرم میں ملوث ہے۔ اگر کوئی اس جرم سے بچنا چاہیے تو ہاتھوں میں انگارہ لینے کے مترادف ہوگا۔ کہانی کار نے بھی شروع شروع میں رشوت لینے سے انکار کیا۔ لیکن کب تک؟ بالآخر اس طاغوتی نظام نے اسے رشوت لینے پر مجبور کر دیا۔ دراصل اس کے پیرائے میں افسانہ نگار نے اس نظام (system) کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے جس کی تبدیلی انفرادیت میں رہ کر ممکن نہیں بلکہ اجتماعیت پر مبنی ہے۔

پیش خدمت ہے افسانہ کا یہ اقتباس:

''ایک بڑا سا لفافہ میرے اور باس کے درمیان جھول رہا ہے۔ میرا جی چاہا لفافہ باس کے منہ پر کھینچ ماروں۔ پھر ریاض کا خیال آیا پتہ نہیں اسے کیوں معطل کر دیا گیا۔ وہ اب بھی عدالتوں کے چکر کاٹ رہا ہے۔ کہیں میں بھی ...؟ میں ہاتھ بڑھا کر لفافہ دبوچ لیتا ہوں۔''

(مجموعہ 'کانچ کا پل' ص13)

ان کا ایک افسانہ 'رات اور سمندر' ہے۔ اپنی باتوں کی ترسیل کے لیے انہوں نے استعاراتی جملوں، تجریدی اسلوب اور معنی خیز علامتوں کا سہارا لیا ہے۔ جہاں ان کا فن بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے معاصر فکشن نگاروں میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے جملے کے در وبست میں وہ اساسی پہلوؤں کو رواں رکھتے ہیں۔ جہاں قاری کا رشتہ مواد سے گہرا نظر آتا ہے۔ ممبئی کی بھاگتی دوڑتی زندگی کو پیش کرتا ہوا اسمگلنگ کے موضوع پر لکھا افسانہ 'رات اور سمندر' دلکش بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ دلکش اس لیے کہ اس میں ممبئی کے قدرتی مناظر کو افسانوی لباس پہنا کر اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کیا گیا ہے جو دیکھنے سے علاقہ رکھتا ہے اور دلچسپ اس لیے کہ اس میں کہانی کو اپنی رنگین بیانی اور جادو بیانی سے اسلوبیاتی سطح پر ڈھال کر علامت اور تجرید کا حق کماحقہٗ ادا کیا ہے۔ بمبئی سنٹرل، بھنڈی بازار، فلورا فاؤنٹین، گیٹ وے آف انڈیا، میرن ڈرائیو، ہینگنگ گارڈن، جوٹ ہاؤس، مہالکشمی ریس کورس اور جوہو چوپاٹی وغیرہ قابل دید جگہیں ہیں جہاں کا منظر آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔ ممبئی اپنی تمام تر رعنائیوں کے باوجود اپنے دامن میں کچھ منفی اثرات بھی رکھتا ہے۔ جس نے بہتوں کو تباہ و برباد کیا۔ جیسے کہانی کے کردار ریٹا اور راجو۔ ریٹا کو اس کے باس نے ہی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور اس کی برہنہ لاش کو ریت میں دفن کر دیا۔

افسانہ 'الاؤ' ہندوستان کے گاؤں کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ جہاں سردی کے موسم میں ٹھنڈ سے بچنے کے لیے لوگ الاؤ سلگاتے ہیں اور اس کے ارد گرد جمع ہو کر ایک دوسرے کی بپتا سنتے ہیں۔ اس اثنا میں ایک مسافر راستہ بھٹک کر ان میں شامل ہو جاتا ہے اور اپنی رودادِ سفر ان سے بیان کرتا ہے۔ آدمی چونکہ شریف اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے اس لیے گاؤں والوں کو جلد اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی مجرم یا مخبر نہیں بلکہ بھٹکا ہوا مسافر ہے جو صبح اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ گاؤں والوں نے اسے ٹھنڈ سے بچنے کے لیے اپنا کمبل تو دینا چاہا لیکن کسی نے اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ مسافر چونکہ خوددار تھا۔ اس نے کمبل لینے سے صاف منع کر دیا۔ نتیجتاً صبح ہونے تک وہ کڑاکے کی سردی سے جاں بحق ہو جاتا ہے اور بجھے ہوئے الاؤ کے پاس اس کی اکڑی ہوئی لاش ملتی ہے اور کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے اور پھر ایک نئی کہانی یہاں سے شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ جس نقطے سے کہانی کا آغاز کیا تھا اسی نقطے پر آ کر کہانی ختم ہوتی ہے۔ یہ ایک چونکا

دینے والا اسلوب ہے جہاں قاری کا ذہن کچھ کے کھانا شروع کر دیتا ہے۔ان کے اس اسلوب سے متاثر ہو کر بنگال کے معروف افسانہ نگار جناب محترم صدیق عالم نے اپنے ایک خط میں افسانہ 'الاؤ' کے متعلق کلمات لکھے ہیں۔

''آخری افسانہ جس نے مجھے متاثر کیا وہ اظہارالاسلام کا 'الاؤ' ہے۔اظہارالاسلام نے اپنے افسانوں کے ذریعے ہمیشہ مجھے چونکایا ہے اور ان دنوں مغربی بنگال سے لکھنے والے افسانہ نگاروں میں وہ میرے سب سے محبوب افسانہ نگار ہیں۔افسانے کا آخری جملہ:

''دور اندھیرے میں کوئی ہاتھ میں ٹارچ لیے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔پورے افسانے کو روشن کر جاتا ہے۔''

(اظہارالاسلام: حیات اور فن، مقدمہ ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا،ص 11)

افسانے کے کچھ چنندہ جملے دیکھیں جو گاؤں کی یاد ذہن میں تازہ کرتے ہیں۔

''وہ معمولی پتلون قمیض اور سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ چہرے مہرے سے وہ اس گاؤں کا نہیں لگ رہا تھا۔''

''اے گلٹو! ذرا جا کر دیکھ، چوڑا ہو گا تو لے آنا اور ساتھ میں تھوڑا پانی۔ پہلے آتے تو لٹی مل جاتی۔''

''ارے میرے گھر جا اور بوا کی مائی سے کہہ کر تھوڑا گرم دودھ ہلدی میں ملا کر بھیج دے۔رات بھر میں آرام ہو جائے گا۔'' (کانچ کا پل۔افسانہ 'الاؤ')

اظہارالاسلام کی کہانیوں میں مقامی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ وہ بنگال کے رہنے والے تھے۔کیسے ممکن تھا کہ ان کی کہانیوں میں بنگال دکھائی نہ دے۔انھوں نے بنگال کی راجدھانی کلکتہ اور اس کے مضافاتی علاقوں سے سفر کیا تھا۔ان اسفار کو اپنے مشاہدات کی گہری بھٹی میں تپا کر افسانے کی شکل میں پیش کیا ہے۔وہ پیدائشی طور پر آسنسول کے شہر رانی گنج کے رہنے والے تھے۔قدرتی طور پر یہ علاقہ جغرافیائی اعتبار سے معدنیات سے گھرا ہوا ہے۔پہاڑی علاقے، اونچے نیچے ٹیلے اور کوئلے کی کانوں سے گھرا یہ شہر لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ایسے موضوعات پر مبنی ان کے افسانوں میں جہاں اندھیرا ہانپتا ہے، موہن دھیبر، ڈیڑھ منزلہ سورج، وہ آدمی، اجالے کی مہک اور دھواں کو پڑھا جا سکتا ہے۔جہاں بنگالی زبان، کردار اور کلچر کی بھی بھرمار ہے۔

افسانہ 'جہاں اندھیرا ہانپتا ہے' کولیری میں کام کرنے والے مزدوروں کی دکھ بھری کہانیاں ہیں۔ایسے مزدور جو اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈال کر اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتے ہیں۔جن کی زندگی بے وفائی اور موت وفاداری نبھاتی ہے۔ہریا، ردھوا، جگن، دینوا، پھیکنوا، سرجوا، درعیدوا اسی ماحول کی پیداوار ہیں جو ہر روز اپنے سر پر کفن باندھ کر اس نیت کے ساتھ کان میں اترتے ہیں کہ نہ جانے کس روز اپنی زندگی کی شام ہو جائے۔افسانے کا یہ اقتباس دیکھیں:

''پربتیا جانتی تھی وہ بازی ہار چکی ہے۔دینو کے بعد اس نے بہت کچھ دکھ جھیلے تھے۔اس نے کیا کیا نہیں سہا تھا، مگر آج اس کی ساری تپسیا ایک ضد کے آگے دھری کی دھری رہ گئی۔اسے لگا کہ جیسے کالے پتھروں کے ساتھ اس کا مقدر لکھ دیا گیا ہے۔''

(مجموعہ کانچ کا پل'افسانہ جہاں اندھیرا ہانپتا ہے)

افسانہ 'اجالے کی مہک' 'ڈیڑھ منزلہ سورج اور وہ آدمی' ایسے ہیں۔جن میں شہر کلکتہ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ روشن ہے۔اس شہر کی گہما گہمی، عوامی ہجوم، گاڑیوں کے ریل پیل، یہاں کی چاق و چوبند زندگی اور برٹش راج کی عمارتیں اور کچھ خاص نشانیاں جو آج بھی فن تعمیرات کے بہترین نمونوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ٹرام، ٹرین، رکشہ، پائدار اور مستحکم عمارتیں آج بھی برٹش کی یادوں کو ذہن میں تازہ کیے ہوئے ہیں۔

اُجالے کی مہک میں رکشہ کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کتنی محنت سے یہ ان پڑھ گنوار رکشہ چالک دو وقت کی روٹی کا بندوبست کر پاتے ہیں۔ان کے افسانوں کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس میں ہوڑہ پل، ہوڑہ اسٹیشن، پارک سرکس، زکریا اسٹریٹ، نیو مارکٹ، بالی گنج، اسپلینڈ، پارک اسٹریٹ، میدان، شہر کلکتہ اور اس کے اطراف جگمگ جگمگ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کی سڑکیں، سڑکوں پر چلنے والی سواریاں، فٹ پاتھ پر دست بستہ ہاکروں کا ہجوم، ہگلی ندی، بڑے بڑے تعلیمی ادارے، ٹرافک پر قابو پانے کے لیے فلائی اوور اور زیر زمین میٹرو ٹرین اس شہر کی گہما گہمی کو پیش کرتے ہیں۔پیش خدمت ہیں یہ اقتباسات جن میں شہر نشاط اپنی جملہ تر خوبیاں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

''سڑک کے اس پار سبزہ زار اسپلینڈ، کچھ فاصلے پر شہید مینار، آگے ریڈیو اسٹیشن، بائیں جانب وکٹوریہ میموریل پھر نیتاجی انڈور اسٹیڈیم اور ایڈن گارڈن۔ میرے قدم آگے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ سامنے اوٹرم گھاٹ جس کے دائیں بائیں رابندر سیتو اور ودیا ساگر سیتو اندھیرے میں جگمگا رہے ہیں۔''

''کبھی کبھی میٹرو ٹرین کا سفر، اسپلینڈ اور رابندر سدن کے درمیان دو ہی اسٹیشن آتے ہیں، پارک اسٹریٹ اور میدان۔زیر زمین ٹھنڈے ٹھنڈے پلیٹ فارم پر معلق ٹی وی اسکرین مجھے اچھے لگتے ہیں، میٹرو ٹرین کے آتے ہی پل بھر میں پلیٹ فارم خالی ہو جاتا ہے۔ٹرین چلنے سے پہلے ایک گھسی پٹی نسوانی آواز ابھرتی ہے۔

''دروازہ بند ہو رہا ہے!''

''اگلا اسٹیشن پارک اسٹریٹ!''

''پلیٹ فارم بائیں طرف!''

(مجموعہ کانچ کا پل افسانہ'وہ آدمی')

بنگال میں رہ کر بنگالی کلچر کو پیش کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔اظہارالاسلام نے اپنے افسانوں کی بنت میں بنگالی زبان، کردار اور کلچر کی بھی نشاندہی کی ہے۔جو ان کے افسانوں کی جان اور شان ہے۔ان کے افسانوں کے چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

''کوتھائے جابین آپنی............؟''

''دوئی بالی گنج۔'' (افسانہ ڈیڑھ منزلہ سورج)

''کی رے بیٹا! کی ہوے چھے؟''

'سپنو دیکھو چھلیس نا کی......؟''

''دھواں......؟ کی آبول تابول بوک چھس......سن ایک ٹی بھالو بوتول جوگاڑ کورے چھی، چولبی......؟''

''تورمورجی......'' (افسانہ۔دھواں)

کرداروں میں منورنجن داس، سنہا، رام شنکر، مایا، موہن، آنند، رمیش، ورما، شیکھا، نیہا ورما، بخیا، پربتیا، ہریا، ردھوا، دینوا، سراجوا، پھیکنوا، جگن، کویتا، نمرتا، دلیپ بندھو پادھیائے اور تلک دھاری سادھو بنگالی کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

''اس دن اسکول جاتے ہوئے دھیبر پارا سے گزرا۔ ایک سجے سجائے پنڈال کے نیچے رنگ برنگ کپڑوں میں بچے چہک رہے تھے اور بوڑھے خوش گپیوں میں مگن۔جگہ جگہ پوشاک میں عورتیں گنگا پوجا کی تیاری میں مشغول تھیں۔میری نظر موہن دھیبر پر پڑی اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''نمشکار بابو...'' موہن دھیبر میرے سامنے تھا۔

''بابو! آپ کا بابا بھی اسی کارخانے میں چاکیری کرتا ہے۔وہ مانس نہیں تھا بابو، دیوتا تھا، دیوتا، ہمارا اوپر کیا کیا اپکار کیا تھا وہ ہم بولنے نہیں سکتا، سارا جیون اسے بھولنے نہیں سکتا۔'' (مجموعہ کانچ کا پل افسانہ موہن دھیبر)

مندرجہ بالا اقتباسات ان کے افسانوں سے اخذ شدہ ہے جن سے بنگالی کلچر کی ترجمانی ہوتی ہے۔

■

Sk. Zahur Alam
Dept. of Urdu, Research Scholar,
Calcutta University
5/H/9, Motihjeel Lane,
Kolkata-700015
Mobile: 9163245420
E-mail : armanalam7@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی ،سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢urduduniyancpul@yahoo.co.in

رؤف خیر

دشینت کمار ہندوستانیت کا نمائندہ قلم کار

دشینت کمار اردو کا ایک ایسا جینوئن Genuine شاعر ہے جسے ہندی والوں نے کھلے دل سے اپنالیا۔ اردو میں بحر و وزن، قافیہ، ردیف، عروض، ایطا، اعراب زبان و بیان کی اتنی باریکیاں ہیں کہ شعر کہنا آسان نہیں رہ جاتا۔ فطری بہاؤ کے ساتھ اپنے جذبات واحساسات کو شعر میں ڈھالنے والے کے سامنے فنی رچاؤ چٹان بن کر آتا ہے اور کوئی اسے سر کر لے تو پھر وہ کامیاب شاعر ہو جاتا ہے اور جو ہمت ہار جاتا ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہندی میں اتنی پابندیاں نہیں ہیں اس لیے شاعر کے لیے جذبات و احساسات کا اظہار آسان ہو جاتا ہے۔

1960 سے 1975 تک دشینت کمار کے بہت چرچے رہے۔ 1965 کے آس پاس ایک افسانہ نگار دوست انور رشید کے ذریعے ہندی کے ادیبوں شاعروں سے ملاقاتیں ہوتی تھیں جیسے راجا دوبے، اوم پرکاش نرمل وغیرہ جو دشینت کمار کا بہت ذکر کرتے تھے۔ اس زمانے میں گوپال متل کے ماہ نامہ تحریک دہلی میں دشینت کی غزلیں گاہے گاہے پڑھنے کو ملتی تھیں۔ اردو میں دشینت کمار کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی حالاں کہ دشینت کمار عام فہم اردو میں اور عوام وخواص تک پہنچنے والے اسلوب میں شعر کہتے تھے۔ ہندوستانیت کے اس نمائندہ قلم کار نے بعض الفاظ کو اپنے اشعار میں اُسی طرح باندھا جس طرح وہ عام طور پر بولے جاتے ہیں جیسے وزن، شہر، فصل، بحث (متحرک انداز میں) جو اردو والوں سے برداشت نہیں ہو پائے اس لیے دشینت نے ہندی کا رخ کیا۔

اس زمانے میں اردو ہندی میں کوئی فصل نہیں تھی۔ ہندی میں دشینت کمار کی خوب پذیرائی ہوئی۔ دشینت کمار جو کچھ لکھتے تھے وہ اردو زبان میں ہوتا تھا یا الگ بات ہے کہ رسم الخط دیوناگری ہوا کرتا تھا۔ اردو ہندی کی تفریق سے ماورا ہو کر دشینت کمار کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ آج بھی یو پی اور بہار کے بعض شاعر اردو زبان کی بجائے ہندی رسم الخط میں اپنا کلام لکھوا کر لاتے ہیں اور مشاعرے لوٹتے ہیں۔ (اس میں مسلم غیر مسلم کی قید نہیں ہے)۔

ہندی کو بتا دوں ہے اور دیگر اصناف میں جو کچھ کہا جاتا رہا ہے وہ اپنا آب و روغن کھوتا جا رہا تھا۔ عوام تو عوام خواص بھی اردو غزل کی مقبولیت سے متاثر ہوتے جا رہے تھے۔ ہندو مسلم مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی وجہ سے زبان وہی بولی جاتی رہی ہے جو بلا لحاظ مذہب و ملت سب کی سمجھ میں آتی ہے۔ یہ عام فہم اسلوب شعر و ادب میں بھی در آیا۔ البتہ بعض شاعروں نے اردو غزل اپنائی ضرور مگر اُسے ہندیایا تھا جیسے جے شنکر پرساد (1889-1937) برج بھاشا سے کھڑی بولی میں آئے ضرور مگر غزلیں بھی کہیں تو سنسکرت آمیز ہندی میں۔

چھایاوادی ہری کرشن پریمی نے اپنے شعری مجموعے 'روپ ریکھا' میں کھلے دل سے اعتراف کیا:

''غزل کو ہندی ادب میں لانے کی کوشش تو بہت پہلے سے چل رہی ہے اور مہا کوی کہے جانے والے ماہرین بھی کثرت سے غزل کہتے رہے ہیں لیکن اردو والے نکھار، شوخی اور ادا کے درشن ابھی تک نہیں ہوئے ہیں۔''

مرزا غالب کے زیر اثر پریمی کہتے ہیں۔

ہزاروں صورتیں سندر کہ جن پر من مچلتا ہے
مگر ادھکار کر سکنا بہت مشکل ہوا جگ میں
بنا کر کوئی سیمائیں ہر دے کو باندھتی دنیا
وشدھ دستار کر سکنا بہت مشکل ہوا جگ میں

پریوگ وادی شمشیر بہادر سنگھ کی ہندی غزلیں اردو سے بہت قریب ہیں۔

وہی عمر کا ایک پل کوئی لائے
تڑپتی ہوئی سی غزل کوئی لائے
حقیقت کو لائے تخیل سے باہر
مری مشکلوں کا جو حل کوئی لائے

ترلوچن شاستری کے ہندی کلام کے مجموعے کا نام ہے 'گلاب اور بلبل' جس میں جو غزلیں ہیں وہ اردو کی نہیں لگتیں۔

اندھیری رات ہے میں ہوں اکیلا دیپ جلتا ہے
ہوا جگ جگ کے سوتی ہے، وہ تھک اب کون چلتا ہے
دھرا کو کون آکرشن تمر میں کھینچ لایا ہے
کشش سے ویوم میں کوئی ترل تارا نکلتا ہے
ترلوچن بھاؤ آتے ہیں تو پھر روکے نہیں رکتے
کبھی جھرنے کو دیکھا ہے جو اپنی ڈھال ڈھلتا ہے

(بحوالہ ہندی غزل تاریخ و تنقید: ڈاکٹر انیس الفسا، 2014)

دشینت کمار اردو غزل کو سینے سے لگا لینے کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی تکلیف کو، اس تکلیف کو جس سے سینہ پھٹنے لگتا ہے، زیادہ سے زیادہ سچائی اور بھرپور انداز

میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے غزل کہی ہے۔ یہاں یہ صاف کردوں کہ غزل مجھ پر نازل نہیں ہوئی ہے۔ میں پچھلے پچیس برسوں سے اسے سنتا اور پسند کرتا آیا ہوں اور میں نے کبھی چوری چھپے اس میں ہاتھ بھی آزمایا ہے لیکن غزل لکھنے یا کہنے کے پیچھے ایک جستجو اکثر مجھے تنگ کرتی رہی ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کے شاعروں میں سب سے بلند تخیل کے حامل شاعر مرزا غالب نے اپنے درد کے اظہار کے لیے غزل ہی کو ذریعہ کیوں بنایا اور اگر غزل کے وسیلے سے غالب اپنے کرب کو اتنا عام بنا سکتے ہیں تو میری دوہری تکلیف جو ذاتی بھی ہے اور سماجی بھی، اس صنف کے ذریعے عام قارئین تک کیوں نہیں پہنچ سکتی۔ مجھے اپنے بارے میں کبھی مغالطے نہیں رہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں غالب نہیں ہوں۔ اس صلاحیت کا سواں حصہ بھی شاید مجھ میں نہیں ہے لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ میری تکلیف غالب سے کم ہے یا میں نے اُسے کم شدت سے محسوس کیا ہے۔ ہوسکتا ہے اپنی اپنی تکلیف کے بارے میں ہر آدمی کو یہ وہم ہو لیکن تاریخ مجھ سے جڑی ہوئی میرے درد کی، تکلیف کی گواہ خود ہے۔ بس تجربے اور ادراک کی اسی ذرا سی پونجی کے سہارے میں اُستادوں اور ماہرین فن کے اکھاڑے میں اُتر پڑا۔ میں جانتا تھا کہ نرالا سے لے کر شمشیر تک کئی بڑے شاعروں نے غزل کی صنف کو آزمایا ہے۔ غزل کا چسکا مجھے خود شمشیر بہادر سنگھ کی غزلیں سُن کر لگا تھا۔''

ہاں! میں نے غزل کو اپنے چاروں طرف بُنی جا رہی شاعری کی یکسانی کو توڑنے کے لیے شروع کیا ہے۔''

دشینت کمار اپنے دور کی ہندی شاعری کی صورت حال سے غیر مطمئن تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جدید شاعری کا رشتہ سامعین اور قارئین سے ٹوٹ چکا تھا۔

(دشینت کمار نمبر میری غزلیں 'ساریکا' مئی 1976 بحوالہ ڈاکٹر انیس انساء بیگم)

اردو میں ترقی پسند ادب اور حلقۂ ارباب ذوق کے دور میں غزل سے بے اعتنائی برتی گئی اور نظموں کو فروغ دیا گیا۔ ساحر، سردار جعفری، مخدوم، جوش، فیض، ن م راشد، میراجی اور اختر الایمان وغیرہ۔ بعد میں فیض، مخدوم، جاں نثار اختر، ساحر نے بڑی کامیاب غزلیں بھی کہیں۔ اس کے بعد 1960 کے بعد جدیدیت نے ادب پر جو شب خون مارا اس نے قاری کو ادب سے دور کردیا۔ جیسے افتخار جالب، عادل منصوری، محمد علوی، ظفر اقبال وغیرہ کی شاعری۔ فکشن کا حال بھی ایسا ہی کچھ تھا۔ تفصیلات سے بچتے ہوئے ہم ہندی ادب کی اسی طرح کی صورت حال کی طرف آتے ہیں کہ 1950 کے آس پاس ہندی شاعری بھی دیو مالائی استعارات، دور از فہم علامات اور سنسکرت آمیز زبان و بیان کی وجہ سے عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہوگئی تھی۔ نرالا نے 'مکت چھند' کے نام پر ہندی شاعری کو بحر اور وزن کی قید سے بھی آزاد کردیا۔ ثقیل زبان اور نثری اسلوب نے ہندی شاعری کو بے رس بنا دیا تھا۔ مگر اردو غزل کی سخت جانی نے اپنی نغمگی، سلاست اور موسیقیت کی وجہ سے عوام و خواص کے دلوں پر بہ ہر حال راج کرنا شروع کردیا۔ فلموں کی غزلوں کے علاوہ غزل گائیگی کی محفلوں نے اسے قبول عام بخشا۔ 1960 کے آس پاس ہندی شاعری کی جو صورتِ حال تھی اس کے بارے میں خود دشینت کمار کہتے ہیں:

''میں برابر محسوس کرتا رہا ہوں کہ جدیدیت کا یہ نیا اور مصنوعی لہجہ شاعری کو برابر قارئین سے دور کرتا گیا ہے۔ شاعری اور قاری کے بیچ اتنا فاصلہ کبھی نہیں تھا جتنا آج ہے۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ شاعری لمحہ لمحہ اپنی پہچان اور شاعر اپنی شخصیت کھوتا گیا ہے۔ ایسا لگتا گویا دودرجن شاعر ایک ہی انداز ایک سی لفظیات میں ایک ہی کویتا لکھ رہے ہیں۔ اس شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سماجی اور سیاسی انقلاب کی راہ ہموار کررہی ہے۔ میری سمجھ میں ایسا تصور محض خوش فہمی ہے اور یہ دلیل کھوٹی ہے۔ جو شاعری لوگوں تک پہنچتی نہیں، اُن کے گلے نہیں اترتی وہ کسی بھی انقلاب کا سبب کیسے ہوسکتی ہے۔ پچھلی پیڑھی کے شاعروں کے برعکس آج کی ان کویتاؤں میں یہ طے کرپانا بھی مشکل ہے کہ یہ کس کی کویتا ہے اور یہ کویتا ہے بھی کہ نہیں۔ اسی لیے میں نے کویتا کی یکسانیت یا پھر جدید کویتا کے اُلجھاؤ اور سپاٹ بیانی سے اُکتا کر اُردو کی اس پرانی اور آزمودہ صنف (غزل) میں پناہ لی ہے۔''

(میری غزلیں: دشینت کمار نمبر، ساریکا، مئی 1976)

(بحوالہ ہندی غزل تاریخ و تنقید: ڈاکٹر انیس النساء بیگم، 2014، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 6)

دشینت کی زد میں کھوکھلے سماج کے سفید پوش White Collar لوگ آتے ہیں:

کھڑے ہوئے تھے الاؤ کی آنچ لینے کو
سب اپنی اپنی ہتھیلی جلا کے بیٹھ گئے
دکان دار تو میلے میں لٹ گئے لیکن
تماش بین دکانیں لگا کے بیٹھ گئے
لہو لہان نظاروں کا ذکر آیا تو
شریف لوگ اٹھے دور جا کے بیٹھ گئے

دشینت کی زبان وہی ہے جو فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، نریش کمار شاد، بانی بولتے تھے۔ صاف سیدھی دل میں اتر جانے والی زبان۔ چند شعر دیکھیے۔

حالاتِ جسم، صورتِ جاں اور بھی خراب
چاروں طرف خراب یہاں اور بھی خراب
روشن ہوئے چراغ تو آنکھیں نہیں رہیں
اندھوں کو روشنی کا گماں اور بھی خراب

دشینت کمار کی خوبی یہ ہے کہ وہ جو محسوس کرتے ہیں بانگِ دہل کہتے ہیں۔ دل میں کچھ زبان پر کچھ والا معاملہ ان کے پاس نہیں ہے۔ مردانہ لہجے میں کہہ گزرتے ہیں۔

ہمت سے سچ کہو تو بُرا مانتے ہیں لوگ
رورو کے بات کہنے کی عادت نہیں رہی
کچھ دوستوں سے ویسے مراسم نہیں رہے
کچھ دشمنوں سے ویسی عداوت نہیں رہی
ہم نے تمام عمر اکیلے سفر کیا
ہم پر کسی خدا کی عنایت نہیں رہی

1950 سے 1975 کا ایسا دور تھا جس میں بیشتر ادیب و شاعر یا تو مادّہ پرست تھے یا مادہ پرست۔ اس میں بادہ پرستی بھی عیب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ دشینت بھی اسی دور کے شاعر تھے۔ وہ مانیں نہ مانیں مگر اُن پر خدا کی بڑی عنایتیں رہیں کیونکہ ان کی تحریریں ضائع نہیں ہوئیں بلکہ کتابی صورت اختیار کرتی گئیں۔

'سوریہ کا سواگت' دراصل دشینت کا ادبی سواگت ہے۔

'آوازوں کے گھیرے' میں دشینت کی آواز الگ پہچانی گئی۔

'سائے میں دھوپ' بن کر دشینت نے یہ ثابت کردیا کہ وہ کسی صورت بے نام ونشاں ہونے والا نہیں ہے۔

'چھوٹے چھوٹے سوال' داغ کر دشینت نے لاجواب کردیا۔

'آنگن میں اک ورش' لگا کر دشینت نے دھوپ چھاؤں اور موسموں کو محسوس کیا اور کروایا۔

'جلتے ہوئے وَن کا بسنت' میں دشینت نے رُتوں کی سفا کی دکھائی ہے۔

'ایک کنٹھ وِش پائی' میں آکاش وانی کے لیے لکھے ہوئے ڈراموں کے ذریعے زہراب وشہداب (سوم رس) کا فرق دکھایا۔

ان کارناموں کے علاوہ اُسی خدا کی عنایت سے دشینت نے بعض دل چسپ کہانیاں بھی لکھیں جو مختلف رسائل میں چھپتی رہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

صرف ہنگامہ کھڑا کرنا مرا مقصد نہیں
میری کوشش ہے کہ یہ صورت بدلنی چاہیے

میرے سینے میں نہیں تو تیرے سینے میں سہی
ہو کہیں بھی آگ لیکن آگ جلنی چاہیے

نظر نواز نظارہ بدل نہ جائے کہیں
ذرا سی بات ہے منہ سے نکل نہ جائے کہیں
چلے ہوا تو کواڑوں کو بند کرلینا
یہ گرم راکھ شراروں میں ڈھل نہ جائے کہیں
تمام رات ترے مے کدے میں مے پی ہے
تمام عمر نشے میں نکل نہ جائے کہیں
یوں مجھ کو خود پہ بہت اعتماد ہے لیکن
یہ برف ،آنچ کے آگے پگھل نہ جائے کہیں

شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی مسدس مدو جزر اسلام، علامہ اقبال کا نیا شوالہ اور شکوہ و جواب شکوہ کی گونج بھی دشینت کمار کے شعروں میں سنائی دیتی ہے۔

غضب ہے سچ کو سچ کہتے نہیں وہ
قُران و اُپنشد کھولے ہوئے ہیں
مزاروں سے دعائیں مانگتے ہیں
عقیدے کس قدر پولے ہوئے ہیں

حوصلہ مند دشینت کی لغت میں بھی 'ناممکن' لفظ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ حوصلہ بڑھاتا ہے کہ۔

رہنماؤں کی اداؤں پہ فدا ہے دنیا
اس بہکتی ہوئی دنیا کو سنبھالو یارو
کیسے آکاش میں سوراخ نہیں ہوسکتا
ایک پتھر تو طبیعت سے اچھالو یارو

یہاں طبیعت کا لفظ کس سلیقے سے عوامی لہجے میں برتا گیا ہے۔ یہی دشینت کا کمال ہے۔ ذرا حسن معذرت کی داد تو دیجیے۔

آپ کے قالین دیکھیں گے کسی دن
اس سے تو پاؤں کیچڑ میں سنے ہیں

دشینت کمار نہ لکھنؤ کا ہے نہ دہلی کا مگر اہل زبان اس کی زبان کی داد دینے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ خالص زبان کا شعر دیکھیے: وہ کہتا ہے۔

جس نے نظر اٹھائی وہی شخص گم ہوا
اُس جسم کے طلسم کی بندش تو دیکھیے

سفاکانہ سچائی کا بے باکانہ اظہار تو دیکھیے:

اس سرے سے اُس سرے تک سب شریک جرم ہیں
آدمی یا تو ضمانت پر رہا ہے یا فرار

دشینت کے ایسے اشعار میں زبان کی چاشنی ہی نہیں سماج کی کڑوی سچائی بھی پوشیدہ ہے۔

یہ سارا جسم جھک کر بوجھ سے دہرا ہوا ہوگا
میں سجدے میں نہیں تھا آپ کو دھوکا ہوا ہوگا

یہاں تک آتے آتے سوکھ جاتی ہیں کئی ندیاں
مجھے معلوم ہے پانی کہاں ٹھہرا ہوا ہوگا
یہاں تو صرف گونگے اور بہرے لوگ بستے ہیں
خدا جانے یہاں پر کس طرح جلسہ ہوا ہوگا

اتنی اچھی زبان بولنے والا دشینت کیا اردو کے دو چار الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں باندھ سکتا تھا مگر اس نے عمداً بعض الفاظ ہندیا کر باندھے جیسے وہ عام طور پر بولے جاتے ہیں۔

اس شہر میں اب کوئی بارات ہو یا واردات
اب کسی بھی بات پر کھلتی نہیں ہیں کھڑکیاں
ایک بازو اکھڑ گیا جب سے
اور زیادہ وزن اٹھاتا ہوں
بھوک ہو تو صبر کر روٹی نہیں تو کیا ہوا
آج کل دلّی میں ہے زیر بحث یہ مدّعا

شہر، وزن اور بحث کو متحرک کرکے دشینت کمار نے دراصل عام بول چال کی پابندی کی ہے۔ 'مدّعا' کا لفظ بالکل صحیح صورت میں Issue کے معنی میں اس نے باندھا ہے حالاں کہ ہندی والے اسے مدّا بولتے ہیں۔ بمعنی نکتہ Point۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کی چھوٹ شاعر کو ملنی چاہیے مگر صوتی قافیے کے نام پر اردو کے شاعر بھی تو ہنگامہ کررہے ہیں بقول رؤف خیر۔

بظاہر استفادہ ہوگیا ہے
حقیقت میں تو سرقہ ہوگیا ہے
ترے آتے ہی مطلع ہوگیا تھا
ترے جاتے ہی مقطع ہوگیا ہے

شہر، وزن، بحث، فصل وغیرہ الفاظ کو 'ہندیا لینے' کے باوجود دشینت کمار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے کبھی بے بحر شعر نہیں کہا ورنہ ہندی کے بیشتر شاعروں کے پاس بحر کا تصور ہی نہیں ہے۔ دشینت کہتے ہیں۔

میں جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں
وہ غزل آپ کو سناتا ہوں
ایک جنگل ہے تیری آنکھوں میں
میں جہاں راہ بھول جاتا ہوں
تو کسی ریل سی گزرتی ہے
میں کسی پل سا تھرتھراتا ہوں

بحر چھوٹی ہو کہ بڑی دشینت کمار نے اس میں بے پناہ شعر نکالے ہیں جیسے۔

ایک عادت سی بن گئی ہے تو
اور عادت کبھی نہیں جاتی
کیسے منظر سامنے آنے لگے ہیں
گاتے گاتے لوگ چلانے لگے ہیں

اب تو اس تالاب کا پانی بدل دو
یہ کنول کے پھول کمھلانے لگے ہیں
وہ صلیبوں کے قریب آئے تو ہم کو
قاعدے قانون سمجھانے لگے ہیں

قبرستانوں کی پلاٹنگ کرکے بیچ کھانے والوں پر دشینت کمار کا انوکھا طنز ملاحظہ فرمائیے۔

ایک قبرستان میں گھر مل رہا ہے
جس میں تہہ خانوں سے تاخانے لگے ہیں
کہاں تو طے تھا چراغاں ہر ایک گھر کے لیے
کہاں چراغ میسر نہیں شہر کے لیے
یہاں درختوں کے سائے میں دھوپ لگتی ہے
چلو یہاں سے چلیں اور عمر بھر کے لیے

دشینت کمار نے صرف غزلوں ہی سے شہرت ضرور پائی ہے مگر اس نے کہانیاں بھی لکھیں، ڈرامے بھی لکھے۔ ہر چند وہ بنیادی طور پر ایک باغی قلم کار شمار ہوتا ہے مگر اس کی ایک رومانی نظم دیکھیے:

رات کے گھنے کالے سے میں
میری ہتھیلی پر
تم نے بنایا جو سورج
مہندی سے
کہیں صبح تک رچے گا
لال ہوگا

یکم ستمبر 1933 کو بجنور کے راج پور گاؤں میں وہ پیدا ہوا۔ مراد آباد سے گریجویشن کی۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہا مجاز، اختر شیرانی، نریش کمار شاد کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ 29/30 دسمبر 1975ء کی رات پچھلے پہر سینے میں شدید دکھن کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس نے اپنی بیٹی سے کہا: ''بس بیٹے ۔لگتا ہے۔ ہم تو چل دیے''۔ اور سدا کے لیے خاموش ہوگیا۔''

اس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مشہور قلم کار کملیشور نے اپنے رسالے 'ہنس' کا دشینت کمار نمبر نکالا۔ ساہتیہ اکادمی دہلی نے مونوگراف لکھوایا جس کے لکھنے والے ہندی کے مشہور قلم کار وجے بہادر سنگھ ہیں۔ بے ثباتی حیات کے تعلق سے دشینت کمار چونکا کرتے ہیں۔

تمھارے پاؤں کے نیچے کوئی زمین نہیں
کمال یہ ہے کہ پھر بھی تمھیں یقین نہیں

■

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda
Hyderabad - 500008 (Telangana)
Cell: 9440945645
Email : raoofkhair@gmail.com

مجلہ 'عالمی اردو ادب'

ایک اجمالی جائزہ

نندکشور وکرم نے برصغیر ہندو پاک میں اردو زبان بولنے والوں کی تعداد، موجودہ و گزشتہ ادبا و شعرا سے متعلق مواد حاصل کرنے میں پیش آنے والی دشواریوں اور حوالہ جاتی مجلہ اجرا کرنے کی وجوہات اور مقاصد وغیرہ جیسے امور پر بحث کی ہے۔

اردو کے بھولے بسرے مجاہد نندکشور وکرم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، خاکہ نگار، مضمون نگار، تذکرہ نویس، مترجم و مرتب ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین ادبی صحافی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی صحافت نگاری کا آغاز تقسیم ہند کے بعد 1948 میں مشہور صحافی اور شاعر میلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبارات 'قومی اخبار' اور 'امرت' سے کیا۔ کچھ مدت تک ان اخبارات سے وابستہ رہنے کے بعد انھوں نے اپنے قریبی دوست دیویندر اسر کے ساتھ مل کر 1949 میں کانپور سے ایک ترقی پسند رسالہ 'ارتقا' جاری کیا۔ بدقسمتی سے اس رسالے کا ابھی صرف ایک ہی شمارہ منظر عام پر آیا تھا کہ دیویندر اسر کو رسالہ اجرا کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد وہ کانپور چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ اس طرح یہ رسالہ جاری ہونے کے ساتھ ہی بند ہوگیا۔

نندکشور وکرم نے 1953 میں کانپور سے ہی ایک اور ماہ نامہ 'نئی کہانی' کے نام سے جاری کیا جس میں ہندی زبان کے رسائل 'مایا' اور 'منوہر کہانیاں' کی طرح صرف کہانیاں ہی شائع ہوتی تھیں۔ ماہ نامہ 'نئی کہانی' کے دو شمارے شائع کرنے کے بعد انھیں یہ احساس ہوا کہ اردو میں غزلوں اور نظموں کے بغیر کوئی رسالہ کامیابی کے ساتھ شائع نہیں ہوسکتا اس لیے انھوں نے اس ماہ نامہ میں منظوم حصہ بھی شامل کردیا لیکن اس کے باوجود اس ماہ نامہ کے صرف پانچ شمارے ہی شائع ہوسکے۔ ماہ نامہ 'نئی کہانی' کی اشاعت بند ہونے کے بعد نندکشور وکرم نقل مکانی کرکے کانپور سے دہلی آگئے۔

1964 میں نندکشور وکرم دہلی سے شائع ہونے والے اردو کے مقبول عام سرکاری ماہنامہ 'آجکل' کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1979 میں اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے اور اسی سال ان کا تبادلہ پریس انفارمیشن بیورو نئی دہلی میں ہوگیا۔ پریس انفارمیشن بیورو نئی دہلی میں تقریباً آٹھ سال تک خدمات انجام دینے کے بعد 30 ستمبر 1987 کو نندکشور وکرم سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہوگئے۔

پریس انفارمیشن بیورو نئی دہلی میں ملازمت کے دوران ہی نندکشور وکرم نے اردو کا پہلا حوالہ جاتی مجلّہ 'عالمی اردو ادب' کے نام سے جاری کیا۔ اس حوالہ جاتی مجلّے کا پہلا شمارہ جولائی 1983 میں 'اردو' کے نام سے منظر عام پر آیا جب کہ اس مجلّہ کے باقی تمام شمارے 'عالمی اردو ادب' کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے نندکشور وکرم لکھتے ہیں:

''بہت غور وخوض کے بعد میں نے پہلی بار اسے (عالمی اردو ادب) 'اردو' کے نام سے 1983 میں شائع کیا مگر جب اگلے شمارے کے لیے پریس رجسٹر کے دفتر میں 'اردو' کے نام سے ڈیکلیریشن لینے گیا تو معلوم ہوا کہ اس نام سے کسی شخص نے حیدرآباد سے پہلے ہی ڈیکلیریشن لیا ہوا ہے۔ لہٰذا مجبوراً مجھے 'عالمی اردو ادب' کے نام پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔''

(نندکشور وکرم، عالمی اردو ادب (پبلشرز اینڈ ایڈ ورٹائزرز کرشن نگر دہلی، 2011) جلد نمبر 32، ص 8)

نعمانی پریس دہلی سے شائع ہونے والے مجلّہ کے پہلے شمارے کا سرورق نریش کمار نے تیار کیا تھا۔ اس شمارے کے پیش لفظ میں مدیر مجلّہ نندکشور وکرم نے برصغیر ہندو پاک میں اردو زبان بولنے والوں کی تعداد، موجودہ و گزشتہ ادبا وشعرا سے متعلق مواد حاصل کرنے میں پیش آنے والی دشواریوں اور حوالہ جاتی مجلّہ اجرا کرنے کے وجوہات اور مقاصد وغیرہ جیسے امور پر بحث کی ہے۔

نند کشور وکرم نے اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ اس حوالہ جاتی مجلّے کو شائع کرنے کے پیچھے ان کا کوئی ذاتی مفاد کارفرما نہ تھا بلکہ انھوں نے اس رسالے کو بغیر کسی سرکاری یا غیر سرکاری امداد کے اپنی نجی آمدنی سے شائع کیا۔ وہ کسی شہرت اور مقبولیت کے خواہاں نہ تھے بلکہ وہ خلوص نیت سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اس حوالہ جاتی مجلّہ کے اجرا کرنے کا مقصد نہ صرف ہندو پاک بلکہ دنیا کے دیگر ممالک کے شعرا و ادبا کی تخلیقات سے بھی قارئین کو روشناس کرانا تھا۔ اس حوالہ جاتی مجلّہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے نند کشور وکرم یوں رقم طراز ہیں:

’’حوالہ جاتی مجلّہ عالمی اردو ادب کی اشاعت کا مقصد اردو قارئین کو سال بھر کا منتخب اردو ادب پیش کرنے کے علاوہ ہر طرح کی ادبی سرگرمیوں سے روشناس کرانا نیز تحقیقی اور معلوماتی مضامین پیش کرنا ہے۔‘‘

(نند کشور وکرم، عالمی اردو ادب (پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز کرشن نگر دہلی، 1986)، جلد نمبر 3، ص 5)

درحقیقت اس طرح کے حوالہ جاتی مجلّے کی ترتیب و تدوین کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک ادارے کا کام ہے لیکن نند کشور وکرم نے ایک ادارے کا کام انفرادی طور پر انجام دے کر ثابت کیا کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ نہ صرف اس مجلّے کے مدیر تھے بلکہ اس کے کمپوزر، کلرک بھی خود ہی تھے۔ اردو کے چند قارئین نے انھیں مالی معاونت کی پیش کش کی تھی لیکن انھوں نے صاف انکار کیا اور آخری دم تک اس مجلّے کو اپنی ذاتی کمائی سے شائع کرتے رہے اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

’’میں نے آج تک جو بھی نمبر نکالے ہیں وہ اپنے پلے سے پیسے خرچ کر کے نکالے ہیں یعنی گھر پھونک تماشا دیکھا ہے... اگر مجھے ان نمبروں سے کوئی مالی منفعت حاصل کرنا ہوتی تو میں مرحوم ادبا و شعرا پر خصوصی نمبر کیوں نکالتا۔ ان تھرڈ اور سیکنڈ گریڈ ادبی شخصیتوں پر کیوں نہ نکالتا جو بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے مختلف رسائل میں اپنے خصوصی گوشے یا خصوصی نمبر نکلواتے ہیں۔‘‘

(مشرف عالم ذوقی، نند کشور وکرم مشترکہ وراثت کا آخری داستان گو (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2019)، ص 352)

نند کشور وکرم بھارت اور پاکستان سے شائع ہونے والے ادبی رسائل و جرائد کا ہر سال مطالعہ کر کے معیاری تخلیقات کا انتخاب 'عالمی اردو ادب' کے لیے کرتے تھے۔ بھارت اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں ہر سال شائع ہونے والے مضامین، افسانوں، نظموں اور غزلوں کا انتخاب کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اوّل تو ایسے تمام رسائل و جرائد تک رسائی کا مرحلہ ہی خاصا دشوار تھا پھر ان سب کا مطالعہ اور چھان بین کے بعد اچھی تخلیقات کا انتخاب یقیناً جان جوکھوں کا کام تھا لیکن نند کشور وکرم یہ کام آخر تک بڑی فراخ دلی اور باقاعدگی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ حوالہ جاتی مجلّہ 'عالمی اردو ادب' سال میں ایک بار شائع ہوا کرتا تھا۔ ابتدا میں مجلّے کو بہت کم لوگوں نے پسند کیا لیکن آہستہ آہستہ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر مدیر مجلّہ نند کشور

وکرم نے 1994 میں اسے ششماہی کر دیا۔ ایک شمارے میں معمول کے مطابق گزشتہ سال کے دوران بھارت، پاکستان اور دیگر ممالک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی شعری و نثری تخلیقات کا انتخاب ہوتا تھا۔ شعری انتخاب میں نظمیں، غزلیں، دوہے، گیت، رباعیات اور قطعات ہوتے تھے جب کہ نثری انتخاب افسانوں اور مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اہم شاعروں اور ادیبوں کے سوانحی اشارے اور 'وفیات' کے زیر عنوان مرحومین ادبا کا تذکرہ بھی شامل ہوتا تھا نیز خراج عقیدت کے طور پر اہم شعرا اور ادبا پر مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ 'بخط شاعر' کے زیر عنوان مشہور شعرا کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تخلیقات شامل ہوتی تھیں۔ سال بھر کی ادبی خبروں کے علاوہ اہم اردو کتابوں کی فہرست، کتب خانوں کی فہرست، بھارت اور پاکستان کی مختلف دانش گاہوں میں کیے جانے والے تحقیقی کام کا جائزہ بھی دیکھنے کو ملتا تھا۔

مجلّے کا کوئی شمارہ خصوصی نمبر بھی ہوتا تھا جس میں باری باری بھارت اور پاکستان کی ممتاز ادبی ہستیوں کے فن، شخصیت اور ادبی خدمات کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا جاتا تھا۔ 2019 تک اس مجلّے کے 44 شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں عام حوالہ جاتی شماروں کے علاوہ 14 خصوصی نمبرات بھی شامل ہیں۔ ان خصوصی نمبرات میں حبیب جالب نمبر 1994، احمد ندیم قاسمی نمبر 1996، علی سردار جعفری نمبر 2001، اشفاق احمد نمبر 2006، گوپی چند نارنگ نمبر فروری 2008، کشمیری لال ذاکر نمبر 2009، محمد حسن نمبر اپریل 2011، دھارنگ ادب نمبر مئی 2012، سیفنا صدی نمبر اگست 2013، کرشن چندر نمبر 2014، دیویندر اسر نمبر 2016، انتظار حسین نمبر دسمبر 2016، مصوّر یادگار غالب نمبر دسمبر 2017 اور مشتاق احمد یوسفی نمبر 2018 شامل ہیں۔ یہ نمبرات اتنے مقبول ہوئے کہ ہندو پاک کے بڑے بڑے ادیبوں اور قلم کاروں نے ان خصوصی نمبرات پر تعریفی و توصیفی الفاظ میں تبصرے کیے ہیں۔ ذیل میں چند اہم خصوصی نمبرات کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

> نند کشور وکرم نے ایک ادارے کا کام انفرادی طور پر انجام دے کر ثابت کیا کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ نہ صرف اس مجلے کے مدیر تھے بلکہ اس کے کمپوزر، کلرک بھی خود ھی تھے۔

گوپی چند نارنگ نمبر: 'گوپی چند نارنگ: بین الاقوامی اردو شخصیت' کے عنوان سے شائع شدہ یہ خصوصی نمبر 415 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ضخیم نمبر فروری 2008 میں منظر عام پر لایا گیا۔ اس خصوصی نمبر کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ 'اوراق داستان' کے عنوان سے ہے جس میں گوپی چند نارنگ کے مختصر سوانحی کوائف کے تحت ان کی تاریخ و مقام پیدائش، تعلیمی سفر، ملازمت، علمی و ادبی مشاغل مختلف اداروں سے وابستگی، ان کی تخلیق کردہ اور ان پر تحریر شدہ کتابوں کی مکمل فہرست، قومی و بین الاقوامی سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے علاوہ انھیں ملنے والے انعامات و اعزازات کی مکمل تفصیل بھی درج ہے۔ اس حصے میں 'بقلم خود' کے عنوان سے نو صفحات پر مشتمل گوپی چند نارنگ کی تحریر کردہ مختصر آپ بیتی بھی شامل

ہے جس میں انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش سے لے کر اپنے ادبی سفر کے عروج تک کی داستان بیان کی ہے۔

زیرِ بحث خصوصی نمبر کا دوسرا حصہ 'آئینہ زندگی۔تصویریں' کے عنوان کے تحت ہے جس میں گوپی چند نارنگ کی زندگی کے اہم موقعوں پر لی گئی یادگار تصویریں شامل ہیں۔ان تصویروں میں گوپی چند نارنگ اپنے افرادِ خانہ، اردو کی مشہور اور نامور شخصیات کے علاوہ ملک کے سابقہ وزرائے اعظم اور صدور کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔اس خصوصی نمبر کا تیسرا حصہ گوپی چند نارنگ سے متعلق مشاہیر ادب کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ان مشاہیرِ ادب میں احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ، مجتبیٰ حسین اور مظہر امام وغیرہ شامل ہیں۔ چوتھا حصہ انٹرویوز پر مبنی ہے جب کہ پانچویں حصے میں گوپی چند نارنگ کی سات اہم تحریروں کو شامل کیا گیا ہے جن میں 'بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں'، 'سانحہ کربلا بطورِ شعری استعارہ: اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان' اور 'سنسکرت شعریات اور ساختیاتی فکر' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زیرِ نظر خصوصی نمبر کا آخری اور اہم حصہ 'نقد و نظر' کے عنوان کے تحت درج ہے۔ اس حصے میں اردو کے بڑے بڑے محققین و ناقدین کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں۔اس حصے میں حامدی کاشمیری، شمس الرحمٰن فاروقی، عتیق اللہ، قمر رئیس، گیان چند جین، ناصر عباس نیرّ اور وہاب اشرفی وغیرہ کے مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔غرض یہ خصوصی نمبر اس قدر مکمل اور بھرپور انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ گوپی چند نارنگ کی شخصیت اور فکر و فن کا کوئی بھی پہلو نظروں سے اوجھل نہیں رہتا۔

کشمیری لال ذاکر نمبر: اپریل 2009 میں شائع شدہ یہ خصوصی نمبر چار حصوں پر مشتمل ہے۔'شخصیت' کے عنوان سے شامل پہلے حصّے میں مختلف قلم کاروں نے کشمیری لال ذاکر کے سوانحی کوائف اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ اس حصّے میں کشمیری لال ذاکر کی تمام تصنیفات (اردو، ہندی، پنجابی) اور انھیں ملنے والے انعامات و اعزازات کی مکمل فہرست بھی درج کی گئی ہے۔

زیرِ بحث خصوصی نمبر کا دوسرا حصہ 'فکشن' کے عنوان سے ہے۔اس حصے میں تین ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔'ناول نگاری' کے عنوان کے تحت درج پہلے حصّے میں کشمیری لال ذاکر کے ناولٹ 'سمندری ہواؤں کا موسم' کا متن دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس حصے میں کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری سے متعلق دو مضامین بھی شامل ہیں۔

دوسرے ذیلی حصّے کا عنوان 'افسانے' رکھا گیا ہے۔اس حصّے میں کشمیری لال ذاکر کے سات افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ان افسانوں میں 'اس صدی کا گرہن'، 'پھولا پتھیرن'، 'شام بھی تھی دھواں دھواں' اور 'کورے تہد کا درد' وغیرہ شامل ہیں۔تیسرا ذیلی حصہ 'نقد و نظر' کے تحت درج ہے۔ یہ ذیلی حصّہ پہلے دو حصوں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ حصہ پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین اردو ادب کی مشہور و معروف ہستیوں جیسے بلونت سنگھ، جوگندر پال، خلیق انجم، رتن سنگھ، رشید حسن خان، شمس الرحمٰن فاروقی اور قمر رئیس وغیرہ کے رشحاتِ قلم کی دین ہے۔

اس خصوصی شمارے کا تیسرا حصہ 'خاکہ نگاری' کے عنوان سے ہے۔اس حصے کی ابتدا میں 'کشمیری لال ذاکر: بحیثیت خاکہ نگار' کے عنوان سے آزاد گلاٹی کا لکھا ہوا مضمون شامل ہے۔اس کے علاوہ اس حصے میں اردو ادب کی اہم شخصیات سے متعلق کشمیری لال ذاکر کے لکھے ہوئے چھ خاکے شامل ہیں جن میں جان نثار اختر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی پر لکھے گئے خاکے قابلِ ذکر ہیں۔ زیرِ نظر خصوصی نمبر کا آخری حصہ شاعری کے عنوان سے ہے اس حصّے میں کشمیری لال ذاکر کی شاعری سے متعلق اہم ادبا و شعرا کے مضامین شامل کیے گئے ہیں ایسے ادبا و شعرا میں علی سردار جعفری، قتیل شفائی، کیفی اعظمی اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس حصّے میں کشمیری لال ذاکر کی کچھ غزلیں اور قطعات بھی شامل ہیں۔اس خصوصی نمبر کا اختتامیہ 'اب تو اپنی چھاؤں میں بیٹھا ہوں' کے عنوان سے ہے جو خود کشمیری لال ذاکر کا تحریر کردہ ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔

کرشن چندر نمبر: یہ خصوصی نمبر 2014 میں شائع ہوا۔ یہ خصوصی نمبر کرشن چندر کے صد سالہ جشنِ ولادت کے سلسلے میں انھیں خراجِ عقیدت کے طور پر شائع کیا گیا۔ یہ ضخیم نمبر گیارہ حصّوں پر مشتمل ہے۔اس میں کرشن چندر کی شخصیت اور فن کا بھرپور انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس خصوصی نمبر کا پیش لفظ 'کرشن چندر زندہ ہیں' کے عنوان سے ہے جس میں مدیرِ مجلّہ نند کشور وکرم نے کرشن چندر کے فن پر بحث کرتے ہوئے انھیں ایک عظیم المرتبت افسانہ نگار اور زندہ جاوید فکشن نگار قرار دیا ہے۔

زیرِ نظر خصوصی شمارے کا پہلا حصہ 'شخص اور شخصیت' کے عنوان سے ہے جس میں بلونت سنگھ، جگن ناتھ آزاد، خواجہ احمد عباس اور سلمیٰ صدیقی وغیرہ جیسے قلم کاروں نے کرشن چندر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔'اٹوٹ یادیں' کے عنوان سے شامل دوسرے حصے میں کرشن چندر کے ہم عصر ادبا و شعرا جیسے جیلانی بانو، ساحر لدھیانوی، قرۃ العین حیدر، کشمیری لال ذاکر وغیرہ نے کرشن چندر سے وابستہ اپنی اپنی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ اس کے بعد کرشن چندر سے بلونت سنگھ کا لیا ہوا ایک انٹرویو بھی شامل ہے۔اس خصوصی نمبر کے چوتھے حصے میں کرشن چندر سے متعلق مختلف ناقدین کی آرا کو پیش کیا گیا ہے۔ پانچواں اور چھٹا حصّہ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ پانچویں حصے میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر چھ مضامین شامل ہیں جب کہ چھٹے حصے میں کرشن چندر کے آٹھ مشہور افسانوں کا متن دیا گیا ہے۔ان افسانوں میں اَن داتا، آدھے گھنٹے کا خدا، پشاور ایکسپریس اور 'مہالکشمی کا پُل' وغیرہ شامل ہیں۔

زیرِ بحث خصوصی نمبر کا ساتواں حصہ 'کرشن چندر بحیثیت ناول نگار' کے عنوان سے ہے۔اس حصے میں کرشن چندر کی ناول نگاری پر چار اہم مضامین کے علاوہ ان کے دو ناولوں 'جب کھیت جاگے' اور 'شکست' کے دو اہم حصّوں کا متن شامل کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اس خصوصی نمبر میں کرشن چندر کے تحریر کردہ انشائیہ 'دلیپ کمار کا نائی'، ان کے تحریر کردہ ایک خط کا عکس، مختصر کوائف اور تصویریں بھی شامل ہیں۔اس خصوصی نمبر کا اختتامیہ 'اردو ادب میں ایک نئی آواز' کے عنوان سے ہے جو محمد حسن کی تحریر ہے۔مختصراً یہ خصوصی نمبر کرشن چندر سے متعلق ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مصور یادگار غالب نمبر: 448 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم نمبر دسمبر 2017 میں شائع ہوا ہے۔ 'عالمی اردو ادب' کے تمام خصوصی نمبرات میں اس نمبر کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ یہ وہ واحد نمبر ہے جو کسی متقدّم شاعر یا ادیب پر شائع کیا گیا ہے۔اس سے پہلے یا اس کے بعد نند کشور وکرم نے جتنے بھی خصوصی نمبرات نکالے ہیں وہ تمام نمبرات انھوں نے اپنے ہم عصر ادبا و شعرا پر ہی نکالے ہیں۔

زیرِ مطالعہ خصوصی نمبر کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل میں غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔'توقیت غالب' کے عنوان سے شامل اس باب کے پہلے مضمون میں مالک رام نے 1750 سے 1880 تک غالب سے متعلق تمام اہم واقعات کو تاریخ وار درج کیا ہے۔اس باب کے دوسرے اہم مضامین میں محمد حسین آزاد کا تحریر کردہ مضمون 'نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں غالب' اور محمد عتیق کا مضمون 'غالب کی کہانی۔ غالب کی زبانی' شامل ہیں۔

'مصور یادگار غالب نمبر' کا دوسرا باب 'نقد و نظر' کے

عنوان سے ہے۔ اس اہم حصے میں اردو کے جن مشہور ومعروف محققین وناقدین کے تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں ان میں امتیاز علی عرشی، عبدالرحمٰن بجنوری، قاضی عبدالودود، گوپی چند نارنگ اور گیان چند جین قابل ذکر ہیں۔ امتیاز علی عرشی غالب کی اپنے کلام پر اصلاحوں کو زیر بحث لائے ہیں اور غالب کے کئی ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے جن پر غالب نے خود اصلاحیں کی ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے مقالے میں کلامِ غالب کے فنی محاسن کا جائزہ پیش کیا ہے۔ قاضی عبدالودود کا لکھا ہوا تحقیقی مضمون 'جہانِ غالب' غالب کے تحریر کردہ اردو اور فارسی خطوط کی عبارتوں سے مملو ہے۔ 'حالی، یادگار غالب اور ہم' کے عنوان سے شامل مقالے میں گوپی چند نارنگ نے مولانا حالی کی مشہور ومعروف تصنیف 'یادگار غالب' پر گفتگو کرتے ہوئے کئی اہم سوالات قائم کیے ہیں۔ یہ مقالہ نارنگ کی کتاب 'غالب معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' سے ماخوذ ہے۔ گیان چند جین نے اپنے مضمون میں غالب کے ابتدائی کلام کا جائزہ لیتے ہوئے کلامِ غالب میں فارسی کے استعمال کو اپنے مضمون کا محور بنایا ہے۔

زیر نظر خصوصی نمبر کے تیسرے باب میں غالبیات سے متعلق تحریر وترتیب کردہ کتابیات کی فہرست درج کی گئی ہے۔ 16 صفحات پر مشتمل اس طویل فہرست میں اردو کے علاوہ ہندی، پنجابی اور انگریزی کتابوں کی فہرست بھی شامل ہیں۔ اس حصے میں مختلف رسائل وجرائد کے ان خصوصی نمبرات کی فہرست بھی درج ہے جو غالب پر شائع کیے گئے ہیں۔ اس خصوصی نمبر کے چوتھے باب میں دیوان غالب مرتبہ عبدالرحمٰن چغتائی بعنوان 'نقش چغتائی: دیوان غالب' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ دیوان 'نسخہ حمیدیہ' کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس دیوان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر تین چار صفحات کے بعد ایک صفحے پر ایک رنگین تصویر کے ساتھ غالب کا ایک شعر دیا گیا ہے جس سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے۔

زیر بحث خصوصی نمبر کا آخری باب 'دیوان غالب بخط غالب' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں 'دیوان غالب نسخہ امروہہ' سے متعلق تین اہم مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون امتیاز علی عرشی کا تحریر کردہ 'غالب کا خود نقل کردہ دیوان اردو' کے عنوان سے ہے جس میں امتیاز علی عرشی نے 'دیوان غالب نسخہ امروہہ' کو نہ صرف اہم اور نادر نسخہ قرار دیا ہے بلکہ اسے زمانی اعتبار سے 'نسخہ حمیدیہ' سے مقدم قرار دیا ہے۔ اس حصے میں شامل دیگر دو مضامین نثار احمد فاروقی کے تحریر کردہ ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں 'دیوان غالب نسخہ امروہہ' کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے غالبیات کے سلسلے میں تاریخی حیثیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اس باب کے آخر میں 125 صفحات پر مشتمل 'دیوان غالب نسخہ امروہہ' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ غرض اس خصوصی نمبر میں جہاں غالب کی سوانح، شخصیت اور شاعری پر مشاہیر ادب کے بہترین مضامین اور مقالات شامل ہیں وہیں دیوان غالب کے دو نسخوں کی اضافت سے اس خصوصی نمبر کی قدر ومنزلت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

> حوالہ جاتی مجلہ 'عالمی اردو ادب' کے اداریوں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نند کشور وکرم ایک نڈر، بے باک اور تعصب سے پاک ادبی صحافی تھے۔ نند کشور وکرم نے علاقائی و مذہبی سطح اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر اپنی صحافتی کاوشوں کے ذریعے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے۔ اردو زبان و ادب کو کسی مذہب سے وابستہ کرنے کی شدید مذمت و مخالفت کرتے ہوئے انھوں نے اردو زبان کے سیکولر کردار کو برقرار رکھنے پر زور دیا ہے۔ عالمی اردو ادب کے اداریوں میں انھوں نے اس بات کا تذکرہ بارہا کیا ہے۔

مذکورہ بالا خصوصی نمبرات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نند کشور وکرم نے بھارت کے علاوہ پاکستانی ادبا وشعرا پر بھی خصوصی نمبرات شائع کیے ہیں۔ جن کی اشاعت پر انھیں مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر انھوں نے اس مخالفت اور تنقید کی پروا کیے بغیر اپنا کام خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھا جس سے ان کا غیر جانب دارانہ رویہ وکردار نمایاں ہو جاتا ہے۔

اس حوالہ جاتی مجلّے کی ضخامت ابتدا میں 150 صفحات تھی جو آخر پر 450 صفحات تک پہنچ گئی۔ نند کشور وکرم نے اس مجلّے کو ہر لحاظ سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس مجلّے کے سرورق اور پشت پر اکثر وبیشتر مختلف ادبا وشعرا کی تصویریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ مجلّے میں شعرا وادبا کے قلمی نسخے بھی شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ 1993 کے شمارے کے سرورق پر اردو کے مشہور ومعروف ادبا وشعرا کے دستخط بھی موجود ہیں جن میں فراق گورکھپوری، دیویندر اسر، جمیل جالبی، اختر اورینوی، جوگیندر پال، شمس الرحمٰن فاروقی، بلراج کومل، مالک رام، خواجہ احمد فاروقی، صالحہ عابد حسین، ساحر لدھیانوی، راجندر سنگھ بیدی، قمر رئیس اور ندیم احمد قاسمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مجلّے میں مختلف ادبا وشعرا کی تخلیقات کے علاوہ مدیر مجلہ نند کشور وکرم کی تخلیقات ونگارشات بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی تھیں۔

'عالمی اردو ادب' 1983 سے 2019 تک نند کشور وکرم کے نجی ادارے 'پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز' کرشن نگر دہلی سے مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اگست 2019 میں اس کے مدیر جناب نند کشور وکرم کے اچانک انتقال کے سبب اس کی اشاعت کا سلسلہ بند ہوگیا تھا لیکن ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کی اشاعت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا ہے اور اس کا اڑتالیسواں شمارہ پروفیسر کوثر مظہری کی سرپرستی اور نوجوان اسکالر محمد یوسف رضا کی ادارت میں اکتوبر 2022 میں 'اکادمی اردو زبان و ادب' دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوکر قارئین سے داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔ یہ خصوصی شمارہ اردو کے مشہور ادیب ستیہ پال آنند کے احوال وکوائف اور ادبی کارناموں پر محیط ہے۔

حوالہ جاتی مجلّہ 'عالمی اردو ادب' کے اداریوں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نند کشور وکرم ایک نڈر، بے باک اور تعصب سے پاک ادبی صحافی تھے۔ نند کشور وکرم نے علاقائی و مذہبی سطح اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہوکر اپنی صحافتی کاوشوں کے ذریعے اردو زبان وادب کی خدمت انجام دی ہے۔ اردو زبان و ادب کو کسی مذہب سے وابستہ کرنے کی شدید مذمت ومخالفت کرتے ہوئے انھوں نے اردو زبان کے سیکولر کردار کو برقرار رکھنے پر زور دیا ہے۔ عالمی اردو ادب کے اداریوں میں انھوں نے اس بات کا تذکرہ بارہا کیا ہے۔

الغرض 'عالمی اردو ادب' جیسا ضخیم حوالہ جاتی مجلّہ جاری کر کے نند کشور وکرم نے ادبی صحافت کے میدان میں ایک بہترین اور قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہے جو لائق تحسین ہے۔

■

Sartaj Ahmad Mir
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Hyderabad
Hyderabad- 500046 (Telangana)
Mob.:9469422228

محمد آفتاب عالم

تہذیبی حقائق اور نسلیاتی مطالعہ

انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی ہمیشہ ہی پیچیدہ اور متحرک رہی ہے،اس کی نوعیت وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان پیچیدہ حقائق کو سمجھنا مشکل ہونے کے ساتھ ہمیشہ سوالیہ نشان کے گھیرے میں رہا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زندگی کی مکمل تفہیم ایک نا قابل تکمیل خواب کی طرح ہے۔ انسان کے جسم کو انفرادی طور پر سمجھنے کے لیے جسم، دماغ اور روح کے مختلف فلسفے اور سو سے زائد شاخیں موجود ہیں۔ مزید انسانی ذہن (تدبیری ڈھانچہ، تجربات اور رویے) اور مجموعی طور پر انسان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے انسان کے جسم، دماغ اور روح کے ربط کو جوڑ کر بھی سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مقولہ مشہور ہے کہ 'انسان ایک سماجی مخلوق ہے'، 'انسان کی سماجی زندگی پیچیدہ اور متحرک فطرت کی ہے'، 'معاشرہ سماجی رشتوں کا ایک جال ہے' وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو زندہ رہنے اور اپنی جسمانی، نفسیاتی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سماج میں زندگی گزارنا اور سماجی تعامل بنائے رکھنا بہت اہم ہے۔ سماجی حقیقت کو سمجھنے کے لیے مختلف طریقے موجود ہیں جسے 'میتھڈولوجیکل ڈومین' کہا جاتا ہے جس کا استعمال سماجی حقائق کو سمجھنے میں کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر میتھڈولوجیکل ڈومین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ایک مقداری تحقیق جس سے سماج کا عددی تفہیم ممکن بنا جاتا ہے اور دوسرا معیاری تحقیق جس کے ذریعے غیر عددی تفہیم کو ممکن بنایا جاتا ہے مگر دونوں ڈومینس کی اہمیت کو یکساں مانا جاتا ہے جو ایک دوسرے کی تفہیم یا نتائج کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ کسی بھی طرح کی ریسرچ میں دو مراحل ہوتے ہیں۔ پہلا تجرباتی مرحلہ اور دوسرا تشریحی مرحلہ۔ جس میں ایک ڈیٹا اکٹھا کرنے سے متعلق ہے اور دوسرا نتائج یا نتائج کی اہمیت سے تعلق رکھتا ہے۔ مقداری یا معیاری نظریات یا تکنیکس کا استعمال تحقیق کے موضوع یا مقاصد پر منحصر ہے۔ مقداری تحقیق میں بنیادی طور پر سروے کو ایک طریقے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس میں جواب دہندگان کی ایک بڑی تعداد پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے جنہیں نمونہ نگاری کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے اور ان سے تفتیش کاروں کے ذریعے منظّم طریقے سے انٹرویو کیا جاتا ہے یا ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے جوابات دیے گئے سوالنامے پر لکھ کر بھیج دیں۔ اس کے بعد جوابات کو عددی طور پر کوڈ کیا جاتا ہے اور شماریاتی ٹولز کا استعمال کرتے ہوئے تجزیہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ریسرچ کا مقصد اس حقیقت کو بیان کرنے کا ہے جیسا کہ جواب دہندگان روزمرہ کی زندگی میں تجربہ کرتے ہیں (نا قابل پیمائش حقیقت) مثال کے طور پر رویے، ثقافتی خصائص، برتاؤ یا طرز عمل وغیرہ۔ بنیادی طور پر سماجیات اور سماجی بشریات میدانوں میں زیادہ تر مطالعات معاشرے یا کمیونٹی کے مختلف گروپس یا اداروں، واقعات اور افراد کی زندگی کی تاریخ کے تفصیلی بیانات پیش کرتے ہوئے کیے جاتے ہیں۔ دونوں (مقداری اور معیاری) تحقیقی نظریات کو ایک دوسرے کے مخالف دیکھنے کے بجائے انھیں مربوط کیا جا سکتا ہے اور تحقیق کے نتائج کو گہرا اور با معنی بنانے کے لیے ایک دوسرے کے نتائج کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اس کے تعلق سے میرڈل (1944) نے کہا ہے کہ ''ایک بہتر کمیونٹی اسٹڈی اس کمیونٹی کے افراد اور خاندانوں سے متعلق سماجی اور اقتصادی ڈیٹا کے تجزیے کی شروعات شماریاتی یا مقداری تجزیے سے ہونی چاہیے اور پھر انفرادی و سماجی رویے، ثقافتی خصائص اور طرز عمل سے متعلق کم پیمائشی اعداد و شمار جن سے سماجی سطح بندی کا اظہار کیا جاتا ہے اور جن میں کمیونٹی کے مختلف گروپس کے اراکین کی جانب سے سماجی حیثیت کا اظہار کیا جانا چاہیے اور دونوں کے نتائج کو شماریاتی علم کے فریم ورک میں ضم کیا جانا چاہیے''۔ اس نقطۂ نظر کے برعکس بھی بے شمار بحثیں موجود ہیں جو ان

دونوں (مقداری اور معیاری) نظریات کو الگ الگ استعمال کی وکالت کرتے ہیں۔

سماجی حقیقت سے مراد انسانی معاشرے کی حقیقت ہے جو کثیر جہتی، متعدد درجے، مختلف رنگ و روپ کے ساتھ پیچیدہ اور گہری ہوتی ہے۔ کسی بھی سماج میں مختلف علامتیں (جیسے کھانا پینا، کپڑے، رسومات، فنون، عقائد اور اقدار وغیرہ)، چھپی ہوتی ہیں۔ تیش سبروال کے نزدیک حقیقت کی کئی جہتیں ہیں: طبعی حقیقت اور ثقافتی حقیقت۔ مثال کے طور پر کسی شخص کی موت کو مختلف سماج میں مختلف طریقے سے تصور کیا جاتا ہے۔ کسی معاشرے میں خاموش اور غم کا ماحول ہوتا ہے تو کسی میں اونچی آواز میں قرآن خوانی کا موقع ہوتا ہے۔ لہٰذا ثقافتیں طبعی حقیقت کی تشریح یا تعبیر کرتی ہیں اور ایک مجموعی معنی دیتی ہیں۔ اسی طرح ہر ایک کمیونٹی میں مسائل بھی مختلف نوعیت اور پیمانے کے ہوتے ہیں۔ جیسے کسی بھی کمیونٹی کے فزیکل لوکیشن (دیہی، شہری، قبائلی) کی وجہ سے مسائل کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے۔ ایک کمیونٹی کو بنیادی سہولیات (کھانا، پانی، صفائی، تعلیم، بجلی وغیرہ) کی کمی ہو سکتی ہے اور دوسری کمیونٹی کو جرائم اور انحراف کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اور اسی طرح تیسری کمیونٹی کو جدید وسائل تک رسائی کی کمی ہو سکتی ہے۔ ان مسائل کی وجوہات بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ اس کی وجہ سماجی اداروں میں عدم فعالیت، حکومت کی بے حسی، ثقافتی طور طریقے (جیسے ستی پرتھا، لڑکیوں کو شکم مادر ہی میں مار دینا، دیو داسی پرتھا وغیرہ)، ذات پات، نسل پرستی، عمر پرستی، ہیٹرو سیکسزم، معذوری اور موسمی حالات وغیرہ ہو سکتی ہے۔ اسی طریقے سے کسی بھی سماج کی ثقافتی حقیقت بھی مختلف ہو سکتی ہے جو بہت سی ذیلی حقیقتوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے، جس میں اس کمیونٹی کا نام، جغرافیائی لوکیشن، تاریخ کے آثار، سماجی و ثقافتی طور پر کمیونٹی گروپس، انتظامی اور حکمرانی کا ڈھانچہ شامل ہے۔ مزید کسی بھی کمیونٹی کا اپنا ایک سوشل کمپوزیشن بھی ہوتا ہے جس میں مکانوں یا گھروں کی تعداد، مرد و خواتین کی تعداد، بچوں کی تعداد، نوعمر و نوجوانوں اور بزرگوں کی تعداد، مستقل یا نقل مکانی کی گئی آبادی، تعلیمی پروفائل (خواندہ، ناخواندہ، تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ، اہل اور غیر اہل وغیرہ) آمدنی کا پروفائل (کم، درمیان اور اعلیٰ آمدنی)، پیشے کا پروفائل (ہنر، نیم ہنر اور ہنر مند پیشہ) شامل ہے۔ ساتھ ہی ہر ایک کمیونٹی کی اپنی رسومات، معمولات، تقریبات اور تقاریب ہوتی ہیں جن کا اظہار روزمرہ کی زندگی میں بعض مواقع پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کمیونٹی کے اپنے اندرونی وسائل (قدرتی طور پر یا دستیاب کیے گئے) بھی ہوتا ہے جسے کمیونٹی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اس طرح یہ سبھی عناصر مل کر ایک کمیونٹی یا سماج کی تشکیل کرتے ہیں جن کی اپنی منفرد پہچان ہوتی ہے۔ ایسی حقیقتوں اور سماجی تانے بانے کو سمجھنے، وجوہات معلوم کرنے اور دلیل پیش کرنے کے لیے تحقیق کے مختلف طریقے، ٹولز اور تکنیکس کا استعمال کیا جاتا ہے جس کا انتخاب کسی حقیقت کو سمجھنے، رجحانات سے واقفیت حاصل کرنے، نئی بصیرت معلوم کرنے اور حقیقتوں کے درمیان رشتوں کو سمجھنے کے مقصد کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔

> **سماجی حقیقت سے مراد انسانی معاشرے کی حقیقت ہے جو کثیر جہتی، متعدد درجے، مختلف رنگ و روپ کے ساتھ پیچیدہ اور گہری ہوتی ہے۔ کسی بھی سماج میں مختلف علامتیں (جیسے کھانا پینا، کپڑے، رسومات، فنون، عقائد اور اقدار وغیرہ)، چھپی ہوتی ہیں۔ تیش سبروال کے نزدیک حقیقت کی کئی جہتیں ہیں: طبعی حقیقت اور ثقافتی حقیقت۔ مثال کے طور پر کسی شخص کی موت کو مختلف سماج میں مختلف طریقے سے تصور کیا جاتا ہے۔**

لفظ اتھنوگرافی یا انتھروپوگرافی (ابتدائی دور میں استعمال کیا جانے والا لفظ) دو یونانی الفاظ 'اتھنوس' جس کا مطلب 'لوک یا لوگ' ہے اور 'گرافو' کا مطلب 'لکھنا' ہے جس کا لفظی معنی 'لوگوں کے بارے میں لکھنا' ہے۔ مزید لفظی طور پر اتھنوگرافی کا مطلب 'پورٹریٹ آف پیوپل' ہے۔ ابتدا میں اسے بشریات کی ایک شاخ کے طور پر سمجھا جاتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ سماجی علوم جیسے ثقافتی، سماجیات، معاشیات، تعلیم، سوشل ورک، نظم و نسق اور نفسیات وغیرہ میں مقبول ہوتا گیا۔ اسکالرس نے تاریخی درجہ بندی کرتے ہوئے، لیوس ہنری مورگن سے پہلے جو بھی کوششیں کی گئی تھیں انہیں 'پری۔اتھنولوجی' مانا جس میں 'شدت یا رگیز' کی کمی تھی اور شوقیہ طور پر کیا جاتا تھا۔ میٹکاف (2004) نے ذکر کیا ہے۔ برینسلو ملینوسکی کو اتھنوگرافی کی دنیا میں اہم ترین سمجھا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے جدید سائنسی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے 'پارٹیسی پینٹ آبزرویشن' کا استعمال کیا تھا۔ لیکن پیڈی اگوو (2017) نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ اتھنوگرافی کی تاریخ کے بارے میں جو کہا گیا ہے جس میں مورگن کو اتھنوگرافی کا بانی بتایا گیا ہے اور مالینوسکی کو منظم طور پر پارٹیسی پینٹ آبزرویشن کی شروعات کرنے والا تسلیم کیا جاتا ہے۔ پیڈی کے مطابق ہیروڈوٹس نے پہلی بار اتھنوگرافی لکھی جو موجودہ دور کی اتھنوگرافی سے ملتا جلتا ہے۔ اوک پوکو اور ایزے (2005 اور 2011) نے بیان کیا ہے کہ ماضی میں بہت سے مسافر، تاجر، مشنری اور سرکاری افسران نے لوگوں سے غیر رسمی پوچھ گچھ کی اور ان کے تجربات کے بارے میں لکھا ہے اور اس طرح کی تمام تحریروں کو 'پری اتھنولوجی' کا نام دیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر رسمی اور شوقیہ تھیں۔ ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب 'ہسٹریز' لکھی۔ ہیروڈوٹس سفر کے دوران لوگوں سے بات کرتے تھے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، ان کے ساتھ رہتے اور وقت گزارتے تھے اور ان کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہیروڈوٹس جس طور طریقوں (ٹریپ انٹرویوز، معلومات کی کروس چیکنگ، تحریری یا زبانی شواہد، اوبزرورس وغیرہ) کا ذکر کرتے ہیں جو موجودہ اتھنوگرافک اسٹڈیز سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔ لافیتاو، جو ایک فرانسیسی مشنری تھا، اریوکوئس کی زندگی پر ریسرچ کے لیے چھ سال تک ان لوگوں کے بیچ رہا، ان کی زبان اور کلچر سیکھی اور اس بنیاد پر ایک کتاب لکھی جو 1724 میں شائع ہوئی۔ کننگھم (1997) اریوکوئس پر کی گئی تحقیق کو پہلی جدید فیلڈ اتھنوگرافی کا درجہ دیتے ہیں۔ مزید کننگھم امیریکہ کے ایف۔ ایچ۔ کشنگ کو پہلا پارٹی سپنٹ آبزرور مانتے ہیں لیکن عام طور پر ماہرین کے درمیان ٹروبریئنڈ آئی لینڈر پر کی گئی مالینوسکی کے ریسرچ کو اس سے منسلک کیا جاتا ہے۔

کشنگ نے امیریکن انڈین گروپ پر ایک مطالعہ کیا اور ایک اہم کتاب شائع ہوئی۔ جیمس جارج فریزر نے بھی ایک اتھنوگرافک اسٹڈی کی ہے اور ایک معلوماتی کتاب بھی شائع ہوئی ہے، لیکن میلونسکی کی کتاب 'دی

آرگونٹس آف دی ویسٹرن پیسیفک' کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ سماجی علوم کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے محققین اور اسکالرز نے ایتھنوگرافی یا ایتھنوگرافک اسٹڈی کے اصطلاح کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے لیکن 'محققین کی ذمے داریوں' پر خاص زور دیا جاتا ہے کیونکہ 'پارٹی سپنٹ آبزرویشن کے ذریعے ڈیٹا اکٹھا کرنے میں سب سے اہم رول محقق کا ہوتا ہے'۔

ایتھنوگرافی ایک ایسا طریقہ کار ہے جس میں محقق ایک کمیونٹی پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور فیلڈ آبزرویشن کے ذریعے سماجی وثقافتی حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ والکوٹ نے اسے ایک سائنس سے تعبیر کیا ہے جس کے ذریعے تھیم ایٹک طور پر سماجی وثقافتی حقیقت بیان کیا جاتا ہے۔ گیٹز کے مطابق یہ ایک کوشش ہے جس میں محقق سماج کی فطری حقیقت اور گروپس کے درمیان انٹرایکشن کی تشریح اور مشاہدہ کرتا ہے۔ ایرکسن روایتی طور پر ایتھنوگرافی کو پوری کمیونٹی کے کلچر کی وضاحت کرنے کے طریقہ کار کے طور پر مانتے ہیں، مگر موجودہ دور میں یہ لوگوں کے کسی بھی گروپس کے درمیان سماجی انٹرایکشن کی وضاحت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکول اور کلاس رومس اور دیگر تعلیمی ترتیبات کو سمجھنے میں ایتھنوگرافک اسٹڈی کی جاتی ہے، اگرچہ دائرہ کار اور ترتیب میں فرق کرنے کے لیے مخصوص موافقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایمرزن، اگرا اور ڈیوس نے ایتھنوگرافی کو فیلڈ ورک پر مبنی تحقیقی عمل کے طور پر بیان کیا ہے جس میں مختلف قسم کی تحقیقی تکنیکس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے ریسرچ میں ایتھنوگرافر طویل عرصے تک فیلڈ کے تجربات سے ڈیٹا اکٹھا کرتا ہے اور عام طور پر وضاحتی تفصیلات پر زور دیتا ہے۔ مالینوسکی کا کہنا ہے کہ ایتھنوگرافک اسٹڈی ہمیں دنیا کو 'نیٹیو پوائنٹ آف ویو' یعنی آبائی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ کلیم کا ماننا ہے کہ ایتھنوگرافی وضاحتی اہداف کی فراہمی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے بنیادی طور پر 'فیلڈ ورک کنسیپٹ' کہا جاتا ہے جس کے ذریعے فیلڈ میں فطری طور پر ہونے والی ترتیبات کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایتھنوگرافک اسٹڈی میں استعمال ہونے والے طریقہ کار 'لوگوں سے سیکھنے' کے خیال کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں محقق کی ذاتی شمولیت ایک بنیادی شرط ہے۔ اس میں پارٹی سپنٹ ابزرویشن (شرکا کا مشاہدہ)، انڈیپتھ۔ انٹرویوز (تفصیلی انٹرویوز) اور آرٹی فیکٹس (دستاویز یا ریکارڈس) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ پارٹی سپنٹ ابزرویشن

انسان اور معاشرے کے درمیان ایک منفرد اور گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں: انفرادی اور سماجی۔ کسی سماج یا معاشرے میں موجود مختلف ادارے، وسائل کی موجودگی، معاشرے کو درپیش مسائل کی نوعیت، علاقائی پہلو، سماجی، ثقافت، مذہب اور ذات پات کا نظام یہ سب مل کر معاشرتی زندگی کو اور بھی پیچیدہ بناتے ہیں اور ان پیچیدگیوں کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ ان سماجی حقیقت جو کثیرالجہتی، ہمہ جہتی، متنوع اور گہری ہوتی ہے جسے سمجھنے کے لیے ایتھنوگرافی اپنی منفرد خصوصیات اور طریقہ کار کی وجہ سے ممکن بناتا ہے۔

ایڈورڈ لنڈ مین (1924) سے منسلک ہے جس کا مطلب 'فیلڈ میں محقق اور زیرِ تحقیق کمیونٹی کے لوگوں کے درمیان شدید تعامل ہے'۔ اس کے ذریعے کمیونٹی کی روزمرہ کی زندگی کے طرزِ عمل کی ٹھوس تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ گولڈ (1958) کے لیے یہ ایک 'مکمل مبصر' ہے اور ڈیٹا اکٹھا کرنے کے دوران اس کی 'مکمل شمولیت' کی ضرورت ہوتی ہے جسے ایتھنوگرافک ڈیٹا کا بنیادی طریقۂ کار سمجھا جاتا ہے۔ انٹرویو کا استعمال لوگوں کے لفظوں میں وضاحتی ڈیٹا اکٹھا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ لوگ کس طرح دنیا کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس طرح کی تحقیق میں انٹرویوز بنیادی طور پر 'اوپن اینڈڈ'، 'غیر ساختہ' اور 'غیر ہدایتی' ہوتے ہیں۔ اس میں منتخب یا فیلڈ ورک کے دوران پہچان کیے گئے' کی انفارمینٹس' سے سوالاتی گائیڈ کا استعمال کرتے ہوئے متعدد بار اچھی طرح سے انٹرویو کیا جاتا ہے جس میں روزمرہ کے واقعات اور مخصوص مواقع سے متعلق بہت سے سوالات ہوتے ہیں۔ آرٹی فیکٹس یا دستاویز جنھیں ہوڈر (1998) نے 'میوٹ اویڈینس' یعنی خاموش ثبوت کہا ہے۔ اس میں ذاتی ڈائریاں، سرکاری ریکارڈس، میمو، لوگوں یا مخصوص لوگوں کے درمیان گفتگو کی ریکارڈنگس وغیرہ شامل ہیں۔

نسلیاتی مطالعے میں ایتھنوگرافی کے عمل کو مطالعے کے نتیجے (پروڈکٹ) اور مطالعے کے سفر (پروسس) دونوں سمجھا جاتا ہے۔ ہر ایک ایتھنوگرافک اسٹڈی میں تحقیق کا عمل، مراحل، مواد، محقق کے تجربے، اس کے احساسات اور عزم مختلف ہوتا ہے۔ عالم (2021) کا یہ کہنا ہے کہ تحقیق کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب 'کسی کو تحقیق کرنے کا خیال آتا ہے'۔ ایتھنوگرافی کے پروسس میں تمام چھوٹی سے چھوٹی باریکی حقیقت کو بھی نوٹ کیا جاتا ہے۔ ایتھنوگرافک اسٹڈی کے نتائج کی اہمیت کا انحصار اس سائنسی پروسس پر ہوتا ہے جس میں محقق اس بات پر غور کرتا ہے کہ ہر اسٹیپ اپنے آپ میں ایک پروسس ہے۔ عام طور پر ایتھنوگرافی میں پروسس کی شروعات ڈیٹا اکٹھا کرنے سے ہوتی ہے لیکن اس کے پہلے کے مراحل اتنے ہی لازمی اور متعلقہ ہیں کیونکہ اس مرحلے میں بھی واقعات اور جزیات شامل ہوتی ہیں اور اسے بھی ایتھنوگرافک پروسس میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ڈیٹا اکٹھا کرنے کے پہلے کے مراحل یا فیلڈ ورک کے عمل کو مزید مختلف مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جیسے سائٹ یا فیلڈ کا انتخاب، تحقیقی فیلڈ میں داخل ہونے کی تیاری، فیلڈ میں داخل ہونا، کمیونٹی کے مختلف ممبران تک رسائی حاصل کرنا، ڈیٹا اکٹھا کرنا اور فیلڈ سے رخصت ہونا شامل ہے۔ یہ سبھی ذیلی مراحل اپنے آپ میں ایک مکمل پروسس ہیں۔

انسان اور معاشرے کے درمیان ایک منفرد اور گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں: انفرادی اور سماجی۔ کسی سماج یا معاشرے میں موجود مختلف ادارے، وسائل کی موجودگی، معاشرے کو درپیش مسائل کی نوعیت، علاقائی پہلو، سماجی، ثقافت، مذہب اور ذات پات کا نظام یہ سب مل کر معاشرتی زندگی کو اور بھی پیچیدہ بناتے ہیں اور ان پیچیدگیوں کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ ان سماجی حقیقت جو کثیرالجہتی، ہمہ جہتی، متنوع اور گہری ہوتی ہے جسے سمجھنے کے لیے ایتھنوگرافی اپنی منفرد خصوصیات اور طریقہ کار کی وجہ سے ممکن بناتا ہے۔ اس طریقہ کار کی کلیدی خصوصیت یہ ہے کہ جواب دہندگان یا خصوصی جواب دہندگان کی جانب سے غیر سیاسی جوابات ملنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں جس کی تصدیق کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔

■

Dr. Md. Aftab Alam
Asst Prof. Dept of Social Work
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.:9391478880
Email.: aftabmsw@gmail.com

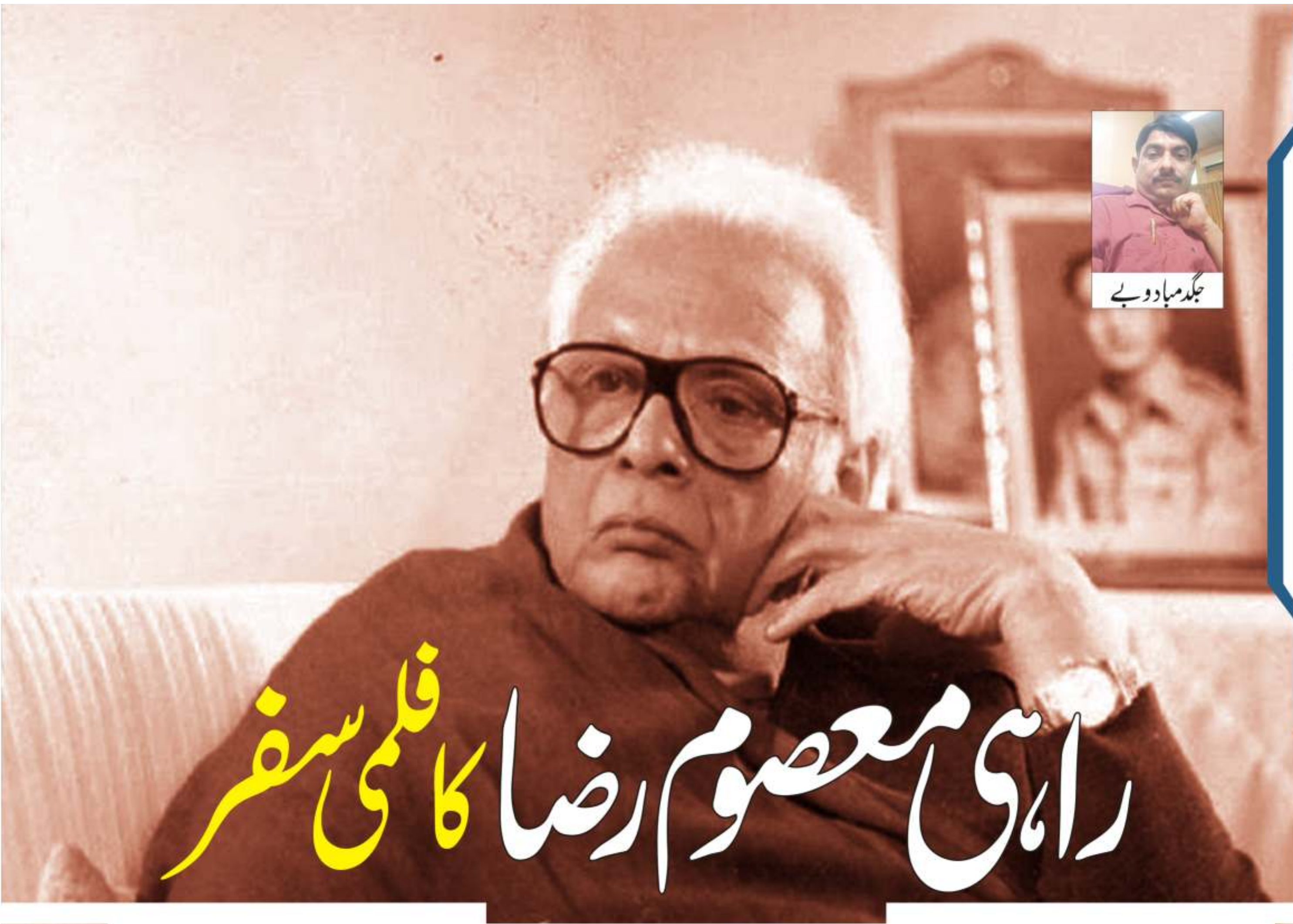

جگدمبا دوبے

فلم

راہی معصوم رضا کا فلمی سفر

کہا جاتا ہے کہ ادب کی دنیا سے آنے والے لوگ فلموں میں کامیاب نہیں ہو پاتے لیکن راہی معصوم رضا نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔انھوں نے عام کامرشیل فلموں میں رہ کر بھی بہترین کام کیا اور اپنا ایک مقام حاصل کیا۔ایسا بھی نہیں تھا کہ فلموں میں لکھنے کی وجہ سے ان کی ادبی تحریر پیچھے رہ گئی تھی۔راہی نے دونوں طرف اپنی سرگرمی برقرار رکھی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ہندی افسانوی ادب میں میلا آنچل، آدھا گاوں، تمس اور راگ درباری کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جب کہ ان سبھی ناول کا موضوع الگ الگ ہے پھر بھی ایک ساتھ مل کر ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔'آدھا گاؤں' کا شمار ہندی میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول میں کیا جاتا ہے۔ راہی معصوم رضا کا یہ ناول اپنے موضوع، مواد اور انسانی حساسیت کی پیشکش کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اپنی زبان کے لحاظ سے بھی بے مثال ہے۔مشرقی اتر پردیش کے بھوجپوری علاقے کی کہانی ہونے کے باوجود یہ علاقائی ناول نہیں ہے۔ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہونے اور فحاشی کے الزامات اور اس کے اخراج کی وجہ سے سرخیوں میں ضرور آیا تھا لیکن 1966 میں اس کی اشاعت کے بعد سے یہ آج تک ہندی کے مقبول ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ 1995 میں اس کا انگریزی ترجمہ The fuding families of village Gangoli کے نام سے آیا لیکن دوسرے ایڈیشن میں اس کا نام A village Divided کر دیا گیا۔

راہی معصوم رضا کے والد جناب بشیر حسن عابدی غازی پور ضلع کچہری کے مشہور وکیل تھے۔اس لیے پورا خاندان وہیں رہا اور وہیں پر تعلیم حاصل کی، لیکن محرم اور عید کے دوران عابدی خاندان کا تعلق گنگولی سے رہا کرتا تھا۔غازی پور میں ایک مشہور وکیل کے طور پر برسوں تک کام کرنے والے جناب بشیر حسن عابدی کی وجہ سے خاندان میں خوشحالی تھی اور کسی طرح کی کوئی کمی نہیں تھی۔اس لیے راہی معصوم رضا کا بچپن بغیر کسی پریشانی کے گزرا۔خاندان بھی مکمل تھا۔گھر میں بڑے بوڑھوں کی سرپرستی حاصل تھی۔گھوڑے کی سواری، کرکٹ کھیلنا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ حویلی کے لان میں پتنگ بازی، کھاتے پیتے گھرانے کے بچوں کی طرح معصوم رضا کا بچپن گزرا۔راہی معصوم رضا کے بچپن میں شوخی زیادہ تھی اس لیے گھر کے بڑے بوڑھوں کے ساتھ ساتھ بھائی بہنوں کو بھی اپنی شوخی سے تنگ کیا کرتے تھے۔اس سلسلے میں سید زہیر احمد زیدی لکھتے ہیں کہ:

''خاص طور سے چھوٹی بہن افسری بیگم کو راہی معصوم رضا 'سڑی بوٗ کہا کرتے تھے کیونکہ ان کے چہرے پر بہت زیادہ پھوڑے پھنسی ہوا کرتے تھے۔سڑی بو معصوم سے اکثر پٹ جاتیں اور معصوم پٹائی کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوتے۔''

(اپنیاس کار راہی معصوم رضا: سید زہیر احمد زیدی، ص 4)

ابھی راہی معصوم رضا کی تعلیم بھی اچھے سے شروع نہ ہوئی تھی کہ گھر والوں کو احساس ہوا کہ راہی معصوم رضا لنگڑا کر چل رہے ہیں۔شروع میں ان کی شوخی سمجھ کر نظر انداز کیا گیا لیکن کچھ دنوں بعد حالات کی سنگینی کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ٹیسٹ کرایا گیا تو پتہ چلا کہ راہی کو بون ٹی بی کا مرض ہے۔اس ٹی بی کے مرض نے راہی معصوم رضا کی زندگی میں نیا موڑ لا دیا اور مستقبل کے ادبی کیریئر کے پس منظر کے طور پر ایک اہم کردار ادا کیا۔شوخی ٹھہر سی گئی۔ ٹانگوں پر پلاسٹر لگنے کی وجہ سے زندگی میں پیدا ہونے والی خلا میں چنچل پن چھوٹ گیا۔وہ نہ اب گھوڑے پر سوار ہو سکتے تھے اور نہ ہی حویلی کے لان میں کرکٹ کھیل سکتے تھے۔ایک چھت سے دوسری چھت تک دوڑنا اور آسمان

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے راہی معصوم رضا نے کسی تعلیمی ادارے سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بیماری کی وجہ سے ٹانگیں پہلے ہی ٹیڑھی ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹروں نے مسلسل علاج کا مشورہ دیا تھا اس لیے پرائیویٹ امتحانات کے ذریعے رفتہ رفتہ تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ راہی معصوم رضا کی شادی کے ساتھ ہی زندگی میں اتار چڑھاؤ اور تبدیلیوں کا نیا دور شروع ہو گیا۔ ادب کا بیج راہی معصوم رضا کے ذہن میں اپنی جگہ پہلے ہی بنا چکا تھا لیکن شادی اور اس سے پیدا ہونے والے حالات ان کے نظریاتی عزم کو سمت فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے راہی معصوم رضا نے کسی تعلیمی ادارے سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بیماری کی وجہ سے ٹانگیں پہلے ہی ٹیڑھی ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹروں نے مسلسل علاج کا مشورہ دیا تھا اس لیے پرائیویٹ امتحانات کے ذریعے رفتہ رفتہ تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ راہی معصوم رضا کی شادی کے ساتھ ہی زندگی میں اتار چڑھاؤ اور تبدیلیوں کا نیا دور شروع ہوگیا۔ ادب کا بیج راہی معصوم رضا کے ذہن میں اپنی جگہ پہلے ہی بنا چکا تھا لیکن شادی اور اس سے پیدا ہونے والے حالات ان کے نظریاتی عزم کو سمت فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی شادی اتر پردیش، ضلع امبیڈکر نگر کی تحصیل ٹانڈہ میں واقع گاوں کلاپور میں مہربانو سے ہوئی تھی۔ مہربانو کا تعلق ایک روایتی قدامت پسند گھرانے سے تھا، جب کہ راہی معصوم رضا کا گھر مغربی تہذیب سے رابطے میں آنے کی وجہ سے زیادہ تر جدید سوچ کا حامل تھا۔

راہی کے دوستوں نے غازی پور کو بنیاد بنا کر ایک ناول لکھنے کا مشورہ دیا تھا اور راہی کی نظموں میں غازی پور بار بار دستک بھی دیتا ہے، اس لیے انھیں یہ مشورہ بے حد پسند آیا اور 'آدھا گاؤں' لکھنا شروع کر دیا۔ راہی اس وقت شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عارضی طور پہ لیکچرر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر میں شمار ہونے لگے تھے۔ 'چھوٹے آدمی کی بڑی کہانی' عنوان سے پرم ویر عبدالحمید کی حیات کے ساتھ ساتھ اردو میں ان کے سات شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے جس میں نیا سال، موج گل: موج صبا، رقص مہ، اور 'اجنبی شہر اجنبی راستے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علی گڑھ میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم قائم کی جس کا نام 'سنگم' رکھا، جس کے بینر تلے اردو اور ہندی ادب کے تمام پروگرام ہوتے تھے۔ 'آدھا گاؤں' سب سے پہلے فارسی رسم الخط میں لکھا گیا تھا بعد میں راہی نے اپنے دوست کنور پال کے ساتھ لمبے بحث مباحثے کے بعد اس کو دیوناگری میں کیا۔ راہی اردو میں الگ الگ نام سے رومانی ناول لکھتے تھے اور پوری سنجیدگی سے ہندی میں لکھنے کے خواہش مند تھے، ان کی یہ خواہش 'آدھا گاؤں' میں پوری ہوئی۔ اسی طرح ان کا ایک دوسرا ناول 'ٹوپی شکلا' (1968) بھی پہلے فارسی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں تھا بلکہ رسم الخط بدلا گیا تھا۔

فلموں کے جراثیم بچپن سے ہی راہی کے ذہن میں تھے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد وہ تحقیقی کام میں لگ گئے لیکن ان کی ہمہ گیر شخصیت متحرک رہی۔ راہی معصوم رضا ادبی سرگرمیوں کے علاوہ کچھ دنوں تک یونیورسٹی کے تھیٹر اسٹیج سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی ہدایت کاری میں 'گونگی زندگی' نامی ڈرامہ بھی پیش کیا گیا۔ راہی

راہی اردو میں الگ الگ نام سے رومانی ناول لکھتے تھے اور پوری سنجیدگی سے ہندی میں لکھنے کے خواہش مند تھے، ان کی یہ خواہش 'آدھا گاؤں' میں پوری ہوئی۔ اسی طرح ان کا ایک دوسرا ناول 'ٹوپی شکلا' (1968) بھی پہلے فارسی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں تھا بلکہ رسم الخط بدلا گیا تھا۔

میں پتنگیں اڑانا خوابوں کا سامان بن گیا۔ ان دنوں انہیں اپنی والدہ کی طرف سے جو خصوصی لاڈ پیار ملا اس نے راہی معصوم رضا میں اپنی والدہ سے ایک خاص لگاؤ پیدا کیا جس کا کمال بعد میں ان کے پورے ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بیماری کی وجہ سے انھیں فلمیں دیکھنے کا شوق بھی پورا کرنے کا موقع ملا۔ دوستوں اور ہم جولیوں کے ساتھ پالکی پر بیٹھ کر فلمیں دیکھنے جاتے تھے۔ شاید بیمار بچے کا ذہن فلموں سے بہل جائے شاید اسی لیے خاندان کے بزرگوں نے انھیں فلمیں دیکھنے سے روکنے کے بجائے حوصلہ دیا۔ ان کے فلمی کیرئیر کے لیے بچپن میں ان کے فلم دیکھنے کے شوق نے یقیناً کہیں نہ کہیں ایک پس منظر کے طور پر کام کیا ہے۔ اگر فلمیں ان کی اداسی اور تنہائی کو دور کرنے میں ناکام رہی ہوتیں تو انھیں اردو رسائل اور اخبارات کی پناہ لینی پڑتی۔ علی حسین صاحب جنھیں سب کالو کاکا کہتے تھے خاندان کے گھریلو اور دیگر کاموں کے علاوہ ان کا پسندیدہ کام قصہ سنانا تھا۔ کالو کاکا طلسم ہوش ربا سنانے بیٹھ جاتے۔ رفتہ رفتہ دوسرے بچے تھک جاتے لیکن راہی معصوم رضا کبھی نہیں تھکتے۔

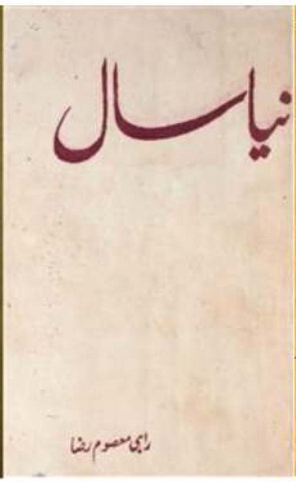

کا ڈرامہ 'ایک پیسے کا سوال ہے بابا' بھی اس وقت بہت مشہور ہوا تھا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران ان کا رابطہ مشہور اداکار بھارت بھوشن کے بھائی رمیش چندر سے ہوا۔ راہی معصوم رضا نے ان کے ساتھ 1963 میں ممبئی کا سفر کیا۔ ان کی تھیٹر کی سرگرمی، رمیش چند کے رابطے اور راہی کی فلموں سے محبت نے پس منظر کے طور پر کام کیا۔ دوسری طرف ان کی ذاتی زندگی کے ہنگاموں نے بھی انھیں فلموں کا رخ کرنے پر مجبور کیا۔

راہی معصوم رضا کی شناخت اردو میں ایک شاعر اور ہندی ادب میں خاص طور سے 'آدھا گاؤں' کے ناول نگار کے طور پر ہوتی ہے، لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ جس طرح 'آدھا گاؤں' صرف آدھے گاوں کی کہانی نہ ہو کر پورے ہندوستان کی کہانی ہے اسی طرح راہی کی مقبولیت شاعر اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا میں بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ راہی کے فلمی سفر کا آغاز ستر کی دہائی میں ہوا تھا اور فلمی دنیا میں وہ تقریباً دو دہائی سے زیادہ فعال رہے۔ اس دوران انھوں نے مختلف طرح کی فلمیں لکھیں۔ ان کے دل میں ایک بات صاف تھی کہ وہ فلمی دنیا میں پیشہ ور ادیب کی حیثیت سے آئے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے خود کو خاص طرح کی فلموں تک محدود نہیں رکھا۔ ستر کی دہائی میں مکل دت کی فلم 'راستے کا پتھر' لکھی جس میں امیتابھ بچن اور شتروگھن سنہا تھے۔ ان کی تمام فلمیں مار پیٹ اور فارمولے والی کامرشیل فلمیں تھیں۔ اس طرح راہی نے اس طرح کی ٹھیٹھ بمبیا فلمیں لکھنے میں کامیابی حاصل کی وہیں دوسری طرف انھوں نے کچھ سنجیدہ فلمیں لکھیں۔ اس طرح کی فلموں میں 'ملی' اور 'جھوٹی' شامل ہیں۔ یہاں ایک بات کا ذکر اور بھی ضروری ہے اور وہ ہے راہی کی شاعری کا۔ اسکول اور کالج کے زمانے سے ہی راہی کو شاعری کا شوق تھا۔ ان کا ایک شعر اس طرح ہے۔

سوچتا تھا کیسے کٹیں گی راتیں پردیسی کی
یہ ستارے تو وہی ہیں میرے آنگن والے

اس کے علاوہ راہی معصوم رضا کی کچھ غزلیں بھی دل پہ اثر کرتی رہیں۔ مثلاً اشوک کھوسلا کی گائی ہوئی غزل۔

اجنبی شہر کے اجنبی راستے ،میری تنہائی پر مسکراتے رہے
میں بہت دیر تک ساتھ چلتا رہا تم بہت دیر تک یاد آتے رہے

البم 'مسنگ یو' میں راہی کی کئی غزلیں شامل ہیں جس میں ان کی بہو پاروتی خان نے آواز دی ہے۔ پاروتی خان ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے بیٹے اور مشہور سنیمٹوگرافر ندیم خان کی ہم سفر ہیں۔ عام طور پر شاعری کا شوق رکھنے والے راہی صاحب کو رشی کیش مکھرجی کی فلم 'آلاپ' میں گانے لکھنے کا

راہی معصوم رضا کی صلاحیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب انہوں نے مہابھارت کے لیے لکھا۔اس کا ایک ایک ایپی سوڈ لوگوں نے بے حد غور سے دیکھا اور کئی مرتبہ دیکھا اور اس کی تعریف کی۔ مہابھارت کے راہی معصوم رضا کے لکھے ہوئے مکالمے اتنے اچھے ہیں کہ ان کی وجہ سے نہ صرف ملک بلکہ دوسرے ممالک میں بھی کافی مقبول ہوئے۔آج وہ ہمارے درمیاں نہیں ہیں لیکن وہ اپنے مکالموں، اپنی نظموں، اپنے نالوں کے ذریعے دنیا میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

موقع بھی ملا۔ اس فلم میں ان کا سب سے اچھا گیت تھا۔

زندگی کو سنوارنا ہوگا   دل میں سورج اتارنا ہوگا

اس گیت کے کچھ حصے غور کرنے لائق ہیں۔

زندگی دھوپ نہیں ،سایۂ دیوار بھی ہے
زندگی دھار نہیں، زندگی دلدار بھی ہے
زندگی پیار بھی ہے، پیار کا اقرار بھی ہے
زندگی کو ابھارنا ہوگا

اسی فلم میں راہی معصوم رضا نے 'چاند اکیلا جائے سکھی ری' جیسا عمدہ کلاسکل گیت بھی لکھا تھا۔ گیت تو راہی معصوم رضا نے کچھ ہی فلموں میں لکھے لیکن فلمی دنیا میں ان کا اہم کام رہا مکالمہ لکھنے کا۔ 1978 میں راج کھوسلا نے چندر کانت کاکوڈکر کے ناول پر اپنی فلم بنائی 'میں تلسی تیرے آنگن کی'۔ راہی نے اس فلم کے ڈائیلاگ تحریر کیے اور خوب داد بٹوری۔ اس فلم کے لیے انھیں بہترین مکالمہ نگار کا فلم فیئر ایوارڈ بھی حاصل ہوا۔ 1980 میں سبھاش گھئی نے اپنی پروڈکشن کمپنی مکتا آرٹس کے نام سے بنائی، جس کی پہلی فلم 'قرض' تھی جس کے ڈائیلاگ راہی معصوم رضا نے لکھے تھے۔ اسی سال انھوں نے 'ہم پانچ' جیسی خالص کامرشیل فلم کے ڈائیلاگ بھی لکھے۔ 1981 میں فلم 'راکی' سے سنجے دت کا فلمی سفر شروع ہوا، اس فلم کے ڈائیلاگ بھی راہی صاحب نے لکھے۔ 1983 میں سبھاش کی طوفانی فلم آئی تھی 'ڈسکو ڈانسر'۔ اس نے متھن چکرورتی کو فلمی دنیا کا چمکتا ستارہ بنا دیا تھا۔ اس کی فلم کی کہانی اور ڈائیلاگ دونوں ہی راہی معصوم رضا نے لکھے تھے۔ یہ فلم راہی کے لیے بے حد اہم تھی کیونکہ اس فلم کے سنیموٹوگرافر ان کے اپنے بیٹے ندیم خان تھے۔ آگے چل کر ایسا کئی فلموں میں ہوا۔ 1985 میں بی آر چوپڑا صاحب کی فلم 'طوائف' کی کہانی راہی صاحب اور علیم مسرور صاحب نے مل کر لکھی تھی۔

راہی معصوم رضا ہندی ادب کا ایک ایسا نام ہے جو صرف ادبی تحریر تک محدود نہیں ہے۔ یوں کہا جائے کہ ان کے ادبی کام کو نثر یا نظم کے کسی خاص فریم ورک میں یا اسے کسی ایک زبان ہندی یا اردو سے جوڑنا آسان نہیں ہے۔ جہاں انھوں نے ہندی میں ناول آدھا گاؤں، ٹوپی شکلا، ہمت جونپوری، اسنتوش کے دن، کٹرہ بی آرزو اور سین 75 لکھے وہیں 'محبت کے سوا' اردو میں بھی ایک ناول لکھا ہے۔ ان کا مشہور مہا کاویہ '1857' بھی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں ہے۔ ممبئی جا کر فلم لکھنے کی شروعات کے ساتھ 'نیم کا پیڑ' اور مشہور مہا کاویہ 'مہابھارت' کے مکالمے لکھ کر تاریخ رقم کرنے والے راہی معصوم رضا کی شخصیت کے بارے میں سب کو جاننا چاہیے۔ 'گنگا اور مہادیو' نظم یہاں آکر پوری ہوتی ہے۔

اپنی نظم وصیت میں لکھتے ہیں۔

مگر شاید وطن سے دور موت آئے بہت ہی دور
اتنی دور موت آئے کہ مجھ کو میری ماں کے پاس لے جانا نہ ممکن ہو تو میری یہ وصیت ہے۔
اگر اس شہر میں یا گاوں میں چھوٹی سی اک ندی بھی بہتی ہو
تو مجھ کو اس کی گودی میں سلا کر اس سے کہہ دینا
کہ وہ گنگا کا بیٹا آج سے تیرے حوالے ہے
وہ ندی بھی میری ماں ، میری گنگا کی طرح ، میرے بدن کا زہر پی لے گی
(نظم: وصیت)

راہی معصوم رضا کی صلاحیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب انھوں نے مہابھارت کے لیے لکھا۔ اس کا ایک ایک ایپی سوڈ لوگوں نے بے حد غور سے دیکھا اور کئی مرتبہ دیکھا اور اس کی تعریف کی۔ مہابھارت کے راہی معصوم رضا کے لکھے ہوئے مکالمے اتنے اچھے ہیں کہ ان کی وجہ سے نہ صرف ملک بلکہ دوسرے ممالک میں بھی کافی مقبول ہوئے۔ آج وہ ہمارے درمیاں نہیں ہیں لیکن وہ اپنے مکالموں، اپنی نظموں، اپنے ناولوں کے ذریعے دنیا میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

■

Dr. Jagdamba Dubey
Asst. Prof., Deptt. of Urdu
Halim Muslim P.G.College
Kanpur- 208001 (UP)
Mob.: 9415280915

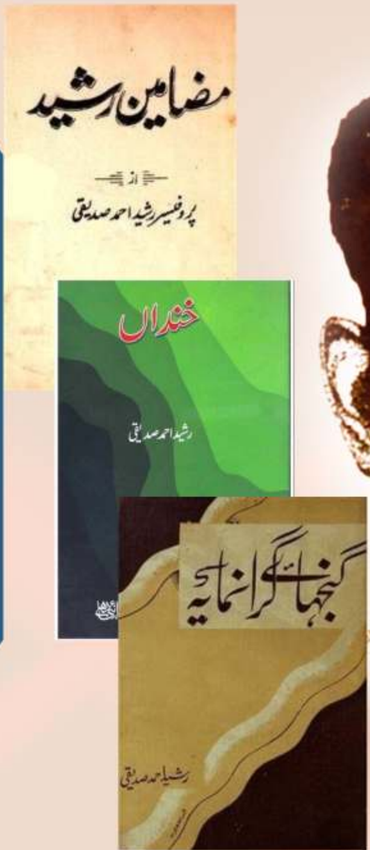

محمد امام الدین

رشید احمد صدیقی

بحیثیت مکتوب نگار

رشید احمد صدیقی اردو ادب کی تاریخ میں ایک ایسا نام ہے کہ ان کا ذکر آتے ہی ایک ہرفن مولا ادیب کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ سنجیدہ مضامین، مزاحیہ مضامین، طنز وظرافت نگاری، انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری، خطوط نگاری، خطبات نگاری یا تنقید نگاری وغیرہ اِن تمام اقسام نثر پر رشید احمد صدیقی نے اپنے جادوئی قلم سے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں جب بھی ان اقسامِ نثر کی بات ہوگی تو رشید احمد صدیقی کے ذکر کے بغیر اردو نثر کی وہ تاریخ نامکمل اور ادھوری رہے گی۔ رشید احمد صدیقی یوں تو تمام غیر افسانوی نثر کے میدان کے شہ سوار ہیں لیکن خاکہ نگاری اور طنز ومزاح نگاری میں ان کے بلند مقام ومرتبے کا ناقدین نے اعتراف کیا ہے۔ طنز ومزاح نگاری کے بعد ان کی جس نثر نگاری کو ناقدین نے اہم اور قابل تحقیق وتنقید بتایا ہے وہ ان کی خطوط نگاری ہے۔ حالی نے غالب کے بارے میں کہا تھا کہ خطوط نگاری میں ان کا ہم مثل نہ ان سے پہلے کوئی تھا نہ ان کے بعد کسی سے ان کی تقلید ہوسکی۔ گویا وہ اپنی خطوط نگاری کے میدان میں یکتا تھے۔ حالی کی بات من وجہ درست ہوسکتی ہے۔ لیکن غالب نے خطوط نگاری میں جس طُرح کی بنیاد ڈالی تھی اسی پر تقلیدی یا تعمیری عمارت کھڑی کرنے والوں میں رشید احمد صدیقی اپنے ہم عصروں میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا اسلوب بھی اپنے ہم عصروں سے کچھ کم منفرد نہیں ہے۔ منفرد، دلچسپ، دلکش اور ناقابل تقلید۔ جس طرح انشائیہ نگاری میں وہ معمولی باتوں میں غیر معمولی شگفتگی اور معمولی مزاح میں گہرا طنز پیدا کردینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ویسے ہی خطوط نگاری میں بھی عام اور معمولی گفتگو میں وہ ایسی معنویت اور گہرائی پیدا کردیتے ہیں کہ قاری غور وفکر کرنے پر مجبور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ ان کے بیان کی گہرائی اور معنویت پر قاری جس قدر غور کرتا ہے اسی قدر حظ اٹھاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے خطوط کے وہ اسرار پنہاں جو ان کی عبارتوں کی تہوں میں لپٹے ہوئے ہیں ابھی طشت از بام نہیں ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ان کے ایک شاگرد رشید پروفیسر عبدالقادر میسوری نے ان کے خطوط کے بارے میں اس وقت لکھا تھا جب ان کے خطوط شائع ہوکر منظر عام پر نہیں آئے تھے:

''ان مضامین کے علاوہ ان کا ایک سب سے بڑا ادبی کارنامہ جو صفحۂ قرطاس پر تو آ گیا ہے لیکن منظر عام پر ابھی نہیں آیا یہ ان کے خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے بے تکلف دوستوں کے نام لکھے ہیں ان کو شائع ہونے دیجیے۔ وہ دن دور نہیں جب کہ بابائے اردو بھی ان کے بارے میں کہہ اٹھیں گے۔ ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاک ستر میں تھی۔''

(پروفیسر محمد عبدالقادر، حنائے علی گڑھ، صف4، سالار پبلی کیشنز، بنگلور، 1986)

اب رشید احمد صدیقی کے خطوط کافی حد تک شائع ہوکر منظر عام پر تو آچکے ہیں لیکن ان کے خطوط کے حسن وقبح، اسرار ورموز اور اسلوبیات پر محققین اور تنقید نگاروں نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔

خطوط کے بارے میں خود رشید احمد صدیقی کا اپنا ایک نقطہ نظر تھا۔ غالب نے خطوط کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کردیا تھا کہ خطوط غائبانہ گفتگو اور مکالمہ بازی ہے۔ رشید احمد صدیقی کا بھی خطوط کے تعلق سے یہ نظریہ تھا کہ خطوط نثری غزل گوئی ہے۔ انھوں نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید رشید احمد صدیقی کے خیالات کے سہارے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھوں نے غزل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے کم وبیش وہ سب خیالات اچھے مکتوبات کے بارے میں بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مشاہیر کے مکاتیب ادب لطیف کی آبرو ہیں۔ اختصار غزل کی طرح مکاتیب کا بھی حسن ہے اور طویل غزل کی طرح طویل مکتوب اپنا حسن کھودیتا ہے۔ غزل کا شاعر بے ربط خیالات کا ترتیب وار اظہار کرتا ہے تو خطوط میں بھی ربط وتسلسلِ خیالات کی تلاش فضول ہے۔ رشید احمد صدیقی نے خطوط کو عشق ومحبت سے تشبیہ دی ہے۔ وجہ شبہ یہ ہے کہ اچھے خطوط بھی عشق ومحبت کی طرح منہ زور اور روانی میں مانندِ سیلاب ہوتے ہیں۔ اچھے خطوط لکھے نہیں جاتے بلکہ عشق کی طرح ازخود لکھ جاتے ہیں۔ موضوعات وعنوانات کی ضرورت مضامین ومقالات کے لیے ہوتی ہے۔ خط بغیر کسی موضوع اور عنوان کے غیر ارادی طور پر لکھا چلا جاتا ہے۔ یعنی خطوط نگاری غائبانہ گفتگو اور آدھی ملاقات ہے جس میں مکتوب نگار مکتوب الیہ سے نیم ملاقات

کرتا ہے اور غیر ارادی طور پر مخاطب سے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ اسے اپنی بات کہنے کے لیے نہ کچھ سوچنا پڑتا ہے نہ احتیاط برتنا پڑتا ہے بس وہ اپنی بات کہتا چلا جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اپنے ایک خطبے میں خطوط کے تعلق سے اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''خطوط کو نہ پکا گانا ہونا چاہیے، نہ فلمی قوالی۔ خط لکھنا دراصل اتنا خطبۂ صدارت تصنیف کرنے کا فن نہیں ہے جتنا گفتگو کرنے کا سلیقہ ہے اور گفتگو کرنا گفتگو ہی کرنے کا نہیں خاموش رہنے کا بھی فن ہے اس اعتبار سے بڑا سخت گیر فن ہے..... اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔ شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئے گا۔''

(غالب کی شخصیت اور شاعری، ص 32، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، 1976)

رشید احمد صدیقی کے خیال میں خطوط نگاری میں خطوط نگار اپنی شخصیت کو چاہے جتنے پردوں میں چھپا دے اس کی شخصیت از خود ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ بلکہ صرف شخصیت ہی نہیں اس کے جذبات و احساسات، اس کا زاویۂ فکر و نظر سب کچھ اس کی تحریر کے پردے میں منعکس ہو کر رہتے ہیں۔ گویا خط شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ بے تکلف احباب کو لکھے جانے والے خطوط میں انسان سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ اپنا آپ اس طرح ظاہر کرنے لگتا ہے کہ دوئی کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔ اور بسا اوقات اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی خطوط کی اشاعت کے سخت خلاف تھے۔ خطوط نگار خطوط لکھنے میں ذاتی اور عمومی کا فرق ملحوظ نہیں رکھ پاتا لہٰذا کسی قاری کے لیے بھی یہ امتیاز کر پانا بے حد مشکل ہے کہ کسی کے کون سے خطوط ذاتی ہیں اور کون سے عمومی۔ پھر بھلا جو چیز جرم کے دائرے میں آتی ہو وہ کسی خوبصورت عنوان سے جواز کے خانے میں کیسے آسکتی ہے؟ رشید احمد صدیقی مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھے گئے 26 جون 1963 کے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''نجی خطوط شائع نہ کرنے کے جواز میں دوستوں سے گفتگو اور بحث کے دوران میں مثال بجنسہٖ وہی دیتا تھا جو آپ نے دی ہے یعنی غسل خانے میں تاک جھانک کس صیغۂ اخلاق میں روا ہے؟''

رشید احمد صدیقی اپنے خطوط کی اشاعت کے اس قدر خلاف تھے کہ اگر کوئی ان کے خطوط شائع کرنے کا ارادہ کرتا تو اسے روکنے کے لیے سخت ناراضگی تک کا اظہار کرتے۔ اور یوں گویا ہوتے کہ میرے روکنے کے باوجود اگر کوئی نہ رکے تو میں بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا ہوں یا کوئی اور کیا بگاڑ سکتا ہے۔ لیکن ایسی حرکت کر کے وہ مجھے سخت تکلیف اور اذیت پہنچائے گا۔ وہ اپنے اکثر خطوط میں مکتوب الیہ کو تاکید کرتے کہ میرا خط پڑھ کر تلف کر دیا جائے۔ اپنی بیٹی سلمیٰ کو 21 اگست 1972 کے ایک خط میں سخت تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں اور اکثر لکھتا بھی رہا ہوں کہ میرے خطوط پڑھ کر فوراً تلف کر دیا کرو۔ مجھے اس خیال سے بڑی تشویش رہتی ہے کہ میرے خطوط میرے بعد شائع کیے جائیں گے۔ اوروں سے تو کچھ کہہ نہیں سکتا اور ان پر اختیار بھی نہیں ہے۔ لیکن اپنے بچوں سے تو اس کی امید کر سکتا ہوں۔ ایسے خطوط اپنے بچوں کو لکھتا ہوں جو پرسنل اور پرائیویٹ ہوتے ہیں تو ان کو شائع کرنا بڑی نازیبا بات ہے۔''

اسی طرح کی ہدایت جزوی تبدیلی و تخفیف کے ساتھ ان کے اکثر خطوط میں موجود دیکھی جا سکتی ہے۔

''اس خط کو پڑھنے کے بعد بالضرور تلف کر دینا۔ اس میں بعض باتیں ایسی لکھ گیا ہوں جن کے عام ہونے سے فتنے کھڑے ہو جائیں تو عجب نہیں۔''

''پچھلے خط کو تلف کر دیجیے گا۔''

''بقول غالب ..... یہ عریضہ چھاپنے کے لیے نہیں چھپانے کے لیے ہے۔''

''امید ہے آپ میرے سارے خطوط ملاحظہ فرمانے کے بعد بالضرور تلف فرما دیتے ہوں گے۔''

''میرے خط پڑھ کر ہمیشہ تلف کر دیا کرو۔ تاکید جانو۔''

ایسے لاتعداد فقرے ان کے خطوط کے اختتام پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ خطوط کی اشاعت کے سلسلے میں ان کے رویے میں آخری عمر تک کوئی تغیر یا لچک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ سلیمان اطہر جاوید نے ان کے خطوط جمع کر کے شائع کرنے کے قصد سے رسالہ ہماری زبان کے توسط سے اہل ادب سے درخواست کی کہ جن کے پاس رشید احمد صدیقی کے خطوط ہوں وہ فراہم کریں۔ رشید احمد صدیقی کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے اس رسالے کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر بے حد لجاجت سے اس سے باز رہنے کی درخواست کی اور ایڈیٹر کے توسط سے سلیمان اطہر جاوید کو بھی اس سے باز رہنے کی تاکید کی۔ ان کی اس کوشش اور ممانعت کا لحاظ کر کے ان کی زندگی میں بہت سے محققین نے ان کے خطوط شائع کرنے کے خیال کو ترک کر دیا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اس کافری سے کوئی باز نہ رہ سکا۔ سلیمان اطہر جاوید نے اچھے خطوط کے شائع نہ کرنے یا تلف کر دینے کو کفر اور قتل سے تشبیہ دی ہے۔ وہ رشید احمد صدیقی کے اس نظریے کے سخت خلاف تھے۔ رشید احمد صدیقی کا قول ہے کہ اچھے خطوط وہ ہوتے ہیں جنھیں پڑھ کر تلف کر دیا جائے۔ سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''رشید صدیقی کی اس منطق کو کون تسلیم کرے گا؟ اور اگر کچھ دیر کے لیے کوئی تسلیم کر بھی لے تو کیا عجب کوئی دل جلا کہہ بیٹھے کہ اچھے انسان کی پہچان یہ ہے کہ گفت وشنید کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے۔ رشید صدیقی نے اصغر گونڈوی مرحوم کے موسومہ ڈھیر سارے مکاتیب لکھے ہوں گے۔ اصغر کی وفات کے بعد مرحوم کی اہلیہ سے انھوں نے سارے مکاتیب حاصل کیے اور اپنے ہی ہاتھوں تلف کر دیا۔ یوں کون جانے کتنے گوہر یکتا تہہ خاک ہو گئے۔ رشید صدیقی نے اپنے مکاتیب کو تلف کر دیا ہو لیکن کسی اور سے یہ کفر ممکن نہیں۔ یہ ادبی قتل کون کرے گا؟''

(سلیمان اطہر جاوید، مکاتیب رشید، صفحہ 16، نیشنل بک ڈپو حیدرآباد، 1980)

ایسا نہیں ہے کہ رشید احمد صدیقی صرف اپنے خطوط کی اشاعت کے خلاف تھے بلکہ وہ اپنے نام لکھے گئے دوسروں کے نجی خطوط کے تحفظ کا بھی خیال رکھتے تھے اور انھیں یا تو تلف کر دیتے تھے یا مکتوب نگار کو واپس کر دیتے تھے۔ ان کے نام بہت سے مشاہیر کے خطوط آتے رہتے تھے جن میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، پطرس بخاری، جگر مرادآبادی، مولانا سہیل، سجاد انصاری، سلطان حیدر جوش، فانی بدایونی، سرتیج بہادر سپرو، آل احمد سرور، مسعود حسین خان، ڈاکٹر محمد حسن، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین وغیرہ شامل ہیں۔ وہ ان سب کے خطوط کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے گھر سے کسی طرح کے کوئی خطوط برآمد نہ ہو سکے۔ خط محفوظ نہ رکھنے کے بارے میں محمد طفیل مدیر رسالہ نقوش کے موسومہ مکتوب مورخہ 13 اکتوبر 1956 میں اپنی اس عادت کا ذکر مزاحیہ اسلوب میں اس طرح کرتے ہیں:

''میرے پاس مشاہر کی خطوط تو آتے ہیں لیکن میں جواب دے کر ان کو تلف کر دیتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ جہاں تک مشاہیر کا تعلق ہے میں خود کو ان سے زیادہ مشاہیر سمجھتا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ مجھ سے پہلے اس جہاں سے گزر گئے اصلی مشاہیر وہی تھے۔ صرف مجھے خط نہ لکھ سکتے تھے۔''

رشید احمد صدیقی کا خیال تھا کہ خطوط میں مکتوب نگار کی جو نجی باتیں ہوتی ہیں ان کے طشت از بام ہو جانے

اگر آپ نے رشیدصدیقی سے ملاقات کی ہو، تبادلۂ خیال کیا ہو، ان کو دیکھا ہی نہیں ان کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہو اور سمجھا بھی ہو تو ان کے مکاتیب میں آپ ان کو بولتا ہوا پائیں گے۔ یہ ان کے مکاتیب کی بہت بڑی خوبی ہے اور پھر ان کے اسلوب کی طرفگی، شائستگی، شگفتگی، بات کو دھیمے دھیمے کہنے کا انداز اور کیف میں ڈوبا ہوا لب و لہجہ۔ لگتا ہے پیاری سی موسیقی کے ریکارڈ ہیں جو آپ ہی آپ بجتے جا رہے ہیں مدھم سروں میں۔

سے مکتوب نگار کو کوئی فرق پڑتا ہو یا نہ لیکن اس کا امکان ضرور ہوتا ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں مکتوب الیہ ان نجی باتوں سے کوئی ایسا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے جس سے مکتوب نگار کو شرمندگی اٹھانی پڑے۔ چنانچہ وہ خلیل الرحمٰن اعظمی کو لکھے گئے اپنے 5 جنوری 1952 کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''اس خط کو آپ ہی رکھ لیں۔ میں ایسے خطوط کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا جس میں لکھنے والے نے نجی باتیں لکھی ہوں اور اس کا امکان ہو کہ جس کو لکھا گیا ہے وہ کبھی اس سے اس طور پر فائدہ اٹھائے کہ لکھنے والے کو شرمساری ہو۔''

خطوط نگاری کو جو ادیب اپنی عادت بنا لیتے ہیں خطوط نگاری ان کی صرف ضرورت نہ ہو کر وقت گزاری کا مشغلہ بن جاتی ہے۔ غالب کی دیگر خصوصیتوں میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بلا ضرورت اور بغیر کسی بات کے محض دل لگی اور وقت گزاری کے لیے بھی خطوط لکھتے تھے۔ یہی حال رشید احمد صدیقی کا بھی تھا۔ انھوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ بے تکلف دوستوں کو خطوط لکھنا لطف و تفریح کا ذریعہ ہے۔ اور انھیں اچھا لکھنے پر جو قدرت حاصل تھی اس کی سچی خوشی تب حاصل ہوتی تھی جب وہ بے تکلف احباب اور عزیز دوستوں کو خطوط لکھنے بیٹھتے تھے۔ بے تکلف دوستوں کو خطوط لکھتے وقت اپنی شخصیت کے تہوں کو کھولنے اور اپنا آپ ظاہر کرنے میں کوئی باک نہ ہوتا۔ بلکہ فطری طور پر مکتوب نگار اپنی خوبیوں و خامیوں سمیت اپنے خطوط میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے رشید احمد صدیقی اکثر اس بات کے اندیشے میں مبتلا رہتے تھے کہ کہیں ان کے خطوط منظر عام پر نہ آ جائیں۔ انھوں نے اس تمنا کا اظہار بھی کیا ہے کہ خدا کرے میرے اس قسم کے خطوط جن بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے پاس ہوں وہ ان کو تلف کر چکے ہوں۔

رشید احمد صدیقی کی روش خطوط نگاری کے سلسلے میں یہ تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بڑے اعزہ اقارب، دوست احباب اور بزرگوں و شاگردوں کو خطوط لکھنے میں پہل کرتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے منتسبین کے بارے میں بعض ناقدین نے لکھا ہے کہ وہاں کے لوگ خطوط نگاری تو دور خطوط کے جوابات لکھنے میں بھی تساہل برتتے ہیں۔ آپ کسی علیگ کو دس خط لکھیے تو جواب مشکل سے ایک کا آئے گا۔ یہ وہاں کی عام روایت بیان کی جاتی ہے۔ استثنا ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اسی استثنا میں رشید احمد صدیقی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ کسی بھی چھوٹے بڑے کو یہ تاثر دینا نہیں چاہتے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں ہر کس و ناکس کے خط کا جواب دینا کسر شان سمجھتا ہوں۔ یا میں بڑا مصروف آدمی ہوں ہر طرح کے خطوط کا جواب دینا میری مصروفیت میں خلل کا باعث ہے۔ بلکہ وہ اپنے شاگردوں کے خطوط کا بھی پابندی سے جواب لکھتے تھے۔ ان کے بعض شاگردوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے جن میں پروفیسر عبدالقادر میسوری بھی تھے۔ رشید احمد صدیقی نے انھیں جو خطوط لکھے تھے انھوں نے ان کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے روزمرہ کے معمولات میں خطوط نگاری بھی شامل تھی۔ آنے والے ڈاک پڑھنے اور خطوط کے جوابات لکھنے کے لیے ان کا وقت مختص تھا۔ وہ سفر میں ہوتے تب بھی خطوط لکھنے کا معمول برقرار رکھتے۔ ان کے بہت سے خطوط حیدرآباد اور مسوری وغیرہ کے سفر کے دوران لکھے ہوئے ہیں۔ 1955 میں جس روز وہ دل کے دورہ سے متاثر ہوئے اس دن انھوں نے ایک درجن کے قریب خطوط لکھ دیے تھے۔ خطوط لکھنے اور جواب ارسال کرنے کی یہ پابندی اور عادت تادم آخر یں قائم رہی۔ زندگی کے آخری چند برسوں میں ان کی بینائی کمزور ہوگئی تھی اور ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا لیکن وہ پابندی سے خط لکھتے رہے۔ ان کا آخری خط وفات سے دو دن پہلے کا لکھا ہوا ہے جو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ وہ خط لکھنے کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے اور اگر کوئی خط کا جواب لکھنے میں کاہلی یا کسالت کا مظاہرہ کرتا تو وہ اسے پسند نہ کرتے تھے۔ اپنے بیٹے احسان رشید کے بارے میں مسعود حسین خان کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''وہ ان لوگوں میں ہیں جو خط کا جواب دینے میں کسر شان سمجھتے ہیں یا کاہلی کو سند جواز مانتے ہیں حالانکہ یہ دونوں باتیں نالائقی کی دلیل ہیں۔''

رشید احمد صدیقی کا خیال تھا کہ انسان کی اصل سیرت کی عکاسی اکثر دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ اگر وہ سامنے موجود ہو تو اس کے ساتھ کھلیے وہ کھل جائے گا اور نظروں سے اوجھل ہو تو اس کے نجی خطوط پڑھیے وہ پہچانا جائے گا۔ اس کلیے کے مطابق رشید احمد صدیقی کے خطوط پڑھیے تو وہ ان میں چلتے پھرتے بولتے چالتے نظر آئیں گے۔ ان کے خطوط میں ان کی شخصیت، ان کا اسلوب، ان کے افکار و نظریات، مختلف مشاہیر کے بارے میں ان کے خیالات کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ مکتوبات کے بارے میں مشہور ہے کہ اس سے مکتوب نگار کی زندگی کا سوانحی خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے خوشہ چینوں نے ان کے خطوط کی مدد سے نہ جانے ان کی زندگی کے کون کون سے گوشوں کے بخیے ادھیڑ ڈالے۔ لیکن رشید احمد صدیقی کا اپنے خطوط میں محتاط انداز رہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے ان کے چاہنے والے ان کے رقعے پرزے تک سے محبت کرتے ہیں لہٰذا بہت بعید ہے کہ وہ ان کی تشہیر سے باز آئیں گے۔ لہٰذا رشید احمد صدیقی کے خطوط غالب کے خطوط کی طرح ان کی زندگی کی مکمل کتاب تو نہیں البتہ ان کی شخصیت کی معرفت کے لیے ناکافی بھی نہیں ہیں۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''اگر آپ نے رشید صدیقی سے ملاقات کی ہو، تبادلۂ خیال کیا ہو، ان کو دیکھا ہی نہیں ان کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہو اور سمجھا بھی ہو تو ان کے مکاتیب میں آپ ان کو بولتا ہوا پائیں گے۔ یہ ان کے مکاتیب کی بہت بڑی خوبی ہے اور پھر ان کے اسلوب کی طرفگی، شائستگی، شگفتگی، بات کو دھیمے دھیمے کہنے کا انداز اور کیف میں ڈوبا ہوا لب و لہجہ۔ لگتا ہے پیاری سی موسیقی کے ریکارڈ ہیں جو آپ ہی آپ بجتے جا رہے ہیں مدھم سروں میں۔''

(سلیمان اطہر جاوید، مکاتیب رشید، صفحہ 20، نیشنل بک ڈپو حیدرآباد، 1980)

رشید احمد صدیقی اپنے خطوط میں مزید کئی رنگ و روپ میں نظر آتے ہیں۔ خطوط میں انھوں نے اپنی پسند ناپسند، اپنے ذاتی و خانگی مسائل، روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتیں مثلاً پاندان، سیوئیاں، گلاب وغیرہ کے علاوہ اپنی بیماریوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ان تمام کا تفصیلی مطالعے اور احاطے کا یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔ مکتوب نگار کی حیثیت سے رشید احمد صدیقی کا مطالعہ اہمیت، افادیت اور دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

■

Mohd Imamuddin
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi- 110007

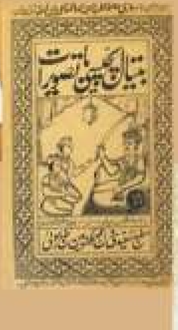

اردو ادب میں اساطیر

(داستان اور ناول کے حوالے سے)

طیبہ بانو

ادب میں اساطیر کی روایت اور دائرہ کار کے بارے میں گفتگو کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اساطیر نے تمام اصناف ادب پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اساطیری یا دیومالائی قصوں کا تعلق ماضی سے ہی ہے اور یہ کہانیاں قدیم ترین انسانوں کی الجھنوں اور پریشانیوں سے بھری ہوئی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ قدیم تہذیب اور رسم ورواج، ان کے جذبات واحساسات کا علم ان کہانیوں سے ہوتا ہے، جس طرح ادب ان کو پیش کرتا ہے وہ کوئی اور شعبۂ علم نہیں بیان کر سکتے۔ انھیں قصے کہانیوں کے ذریعے آج اس گلوبل ولیج نما دنیا نے قدیم انسانوں کے حالات وواقعات سے آشنائی ادب کے ذریعے حاصل کی اور قدیم وجدید زندگی کے مابین ایک ربط بنانے کی کوشش کی ہے۔ دنیا کی مختلف ثقافتوں میں سے اساطیر بھی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اسی لیے قدیم ترین لوگوں کی تہذیب، ان کا رہن سہن، ان کے حالات وواقعات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اساطیری مطالعہ ناگزیر ہے کیونکہ ہرنئی سے نئی تہذیب وثقافت کی بنیادی جڑیں اس کے قدیم نظام اساطیر میں پوشیدہ ہیں جو آج بھی زندگی کے تمام تر شعبوں میں موجود ہے اور موجودہ عہد کی حقیقتوں سے آشنا ہونے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔

قصے کہانیوں کے اساطیری جہان کا منبع اگرچہ زبانی بیانیہ ہے لیکن یہ سب اب تحریری شکل میں موجود ہے جس کے سبب اسے آفاقیت کا درجہ ملا۔ جب بات اساطیر کی تحریری شکل کی جائے تو سب سے پہلا نام اس حوالے سے ہومر کی رزمیہ نظم ایلیڈ کا آتا ہے۔ اس نظم میں یونانی اساطیر کے اولین نقوش ملتے ہیں اور اس کے ذریعے ہی یونانی اساطیر کا در وا ہوتا ہے۔ اس کی نظم ایلیڈ میں ٹرائے کی جنگ کا تفصیلی بیان ہے۔ ہومر کی رزمیہ نظمیں ایلیڈ اور اوڈیسی یونانی اساطیر کا مظہر ہونے کے ساتھ اساطیری ادب کا گراں قدر اثاثہ ہیں۔ ہومر کے بعد ہیسیاڈ (Hesiod) نے یونانی اساطیر پر قلم اٹھایا ہے اور اس کی دو تصنیفات قابل قدر ہیں، ان میں "Works and days" اور دوسری "Theogony" ہے۔ ان کے علاوہ یونانی صنمیات میں پنڈار Pindar، سوفوکلیز Sophocles، اسکلیس Diorus Siculus، یوری پڈیز Euripides، ارسٹوفینز Aristophanes وغیرہ یونانی اساطیر کے مشہور مصنف گزرے ہیں، جنھوں نے اساطیر کے در وا کیے اور اساطیر کے لیے راہیں ہموار کیں۔

ان کے علاوہ جن لوگوں نے اساطیری جہان میں گراں قدر اضافہ کیا، ان میں لوسیس اپولیوس Apulius اور لوسین قابل ذکر ہیں۔ لوسیس اپولیس کی تصانیف کیوپڈ اور سائیکی Cupid and Psychi مشہور زمانہ شاہکار ہیں۔ ان کے علاوہ رومی اور لاطینی دیومالائی ادب کی دریافت وبازیافت کرنے والوں میں ورجل Virgil اور اووڈ Ovid نے بھی گراں قدر کارنامے انجام دیے۔ رومن عہد کی مشہور ومعروف شاہکار نظم اینیڈ ورجل کی ہی تخلیق ہے اور اووڈ کی دیومالائی حوالے سے مشہور زمانہ نظم میٹامورفوسس Metamorphoses ہے۔ ورجل کی نظم Aineid کئی حصوں میں منقسم ہے اور اس میں دیومالائی عناصر ملتے ہیں اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اس نظم کے ذریعے سے دیومالائی جہان کے کردار وشخصیات کو حقیقی زندگی اور ہستیوں سے قریب تر کر کے دکھایا ہے۔

اردو ادب میں دیومالائی عناصر سے کوئی صنف اچھوتی نہیں ہے۔ تمام اصناف پر دیومالائی اثرات مرتب ہیں، ان میں ایک اہم صنف داستان ہے۔

جب ہم ان داستانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے واقعات وجذبات سے بحث کرتی ہیں لیکن اپنی رنگ آمیزی اور تخیلی فضا کی وجہ سے عام انسان کی زندگی سے حالات و واقعات سے مختلف لگتی ہیں۔ اسی لیے جب ہم داستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تمام داستانوں پر دیومالائی اثرات موجود ہیں چاہے وہ پہلی نثری داستان سب رس ہو یا پھر فسانۂ عجائب یا باغ وبہار اور دیگر داستانیں، ان تمام میں اساطیری عناصر پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے دیومالائی عناصر اور داستان کو لازم وملزوم کہنا بجا ہوگا۔

یعنی دنیا کی تمام داستانوں کا سرا کہیں نہ کہیں جا کر دیومالائی عناصر سے ضرور ملتا ہے۔ داستانوں میں توہمات وعقائد، انسانی کرداروں کے ساتھ بھوت جن دیو عفریت یا جانوروں کے سر والے کردار یا پرندے اور جانور وغیرہ ان تمام کا تعلق دنیا کی قدیم مختلف اقوام کی اساطیر بھی ہے۔ اس لیے داستان کے ذکر کے ساتھ اساطیر کا ذکر لازم وملزوم ہے کیونکہ اس کا پایا جانا ناگزیر ہے۔

اردو میں سب سے پہلی باضابطہ طور پر نثری داستان 'سب رس' ہے۔ اس میں ملا وجہی نے کرداروں کو جس

طرح تشکیل دیا ہے وہ غیر مجسم جذبوں کی شکل ہے۔ ان کرداروں کے نام عقل، حسن، عشق، توبہ، خضر، غمزہ، وہم، زلف، وفا، نظر، زہد وغیرہ ہیں۔ ان کرداروں کے نام اور ان کی پیشکش سے یہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس داستان میں اسلامی اساطیر کا تانا بانا بُنا گیا ہے اور پوری داستان میں آغاز تا اختتام اسطوری فضا چھائی ہوئی ہے۔

’باغ و بہار‘ کا جب مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان میں بھی جس طرح سے قصہ در قصہ بیان کیا گیا ہے اور تحیر خیز فضا پیدا کی گئی ہے، تمام تر قصے ماورائیت پر مبنی نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے داستان کا شمار دیومالائی ادب میں ہوتا ہے۔

> ”اردو ادب میں دیومالائی عناصر سے کوئی صنف اچھوتی نہیں ہے۔ تمام اصناف پر دیومالائی اثرات مرتب ہیں۔“

دیومالائی عناصر کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

’’......میں نے اس کے سرہانے ایک دیو دیکھا کہ کتاب لیے کھڑا ہے۔ چاہا کہ پکڑ کر خوب ماروں اور کتاب چھین لوں، اتنے میں اس کے ہاتھ سے کتاب دوسرا لے بھاگا۔ میں نے جو افسوں یاد کیے تھے، پڑھنے شروع کیے، وہ جن جو کھڑا تھا بیل بن گیا۔‘‘

(باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، 1992، ص 112)

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ منتر پڑھ کر جن پر پھونکنے کی روایت قدیم دور کی اساطیر کا حصہ ہے اور یہاں بھی جن کو بیل کی شکل میں دعا یا منتر کے ذریعے ہی ڈھال دیا گیا۔ یہ اساطیری تصور اس داستان میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح دیگر داستانیں خواہ وہ ’آرائش محفل‘ ہو یا ’مذہب عشق‘ تمام داستانوں میں دیومالائی اثرات پائے جاتے ہیں۔ ’آرائش محفل‘ میں جس طرح حاتم طائی کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے پوری داستان میں دیو، جن، پری، جادو، سحر سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ واقعات کے ان تصادم سے پوری داستان میں دیومالائی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ’مذہب عشق‘ کے قصے میں دلبر بیسوا کی پالتو بلی، چوہا اس کے علاوہ ممالہ دیوی کی مدد سے تاج الملوک کا بکاولی کے پھول تک پہنچنا اور اس سے اپنے والد کی بینائی کا واپس لانا، بچھو، سانپ اور پری کے کردار کا ہونا یہ سب اساطیر ہیں۔

’داستان امیر حمزہ‘ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا تانا بانا اسلامی اساطیر کے اردگرد بنا گیا ہے۔ پوری داستان میں آغاز تا اختتام طلسماتی فضا چھائی رہتی ہے، جس کی بنیاد میں اسلامی اساطیر پنہاں ہیں۔ اس کے بعد ’قصہ مہر افروز دلبر‘ میں بھی دیومالائی عناصر ملتے ہیں۔

داستان ’نوآئین ہندی‘ ’المعروف ملک محمد گیتی افروز‘ میں بھی اساطیری عناصر موجود ہیں، اس میں ملک محمد کا کئی بار تبدیلیِ قالب کا عمل اساطیر کے زمرے میں ہی شامل ہوتا ہے۔

داستان ’رانی کیتکی کی کہانی‘ میں ہندوستانی دیومالائی عناصر واضح طور پر موجود ہیں۔ اس میں ایک کردار ’اندر‘ بذات خود دیومالائی کردار کے نام پر ہے، اس کے علاوہ سورج بھان اس کی بیوی اور ادے بھان کو ہرن کے روپ میں ڈھال دینا دیگر کرداروں کا بھبھوت لگا کر اوجھل ہو جانا، گٹکے کھا کر ہوا میں اڑ جانا یہ سب ہندو دیومالا کے واضح نقوش ہیں۔ داستان رانی کیتکی کی کہانی میں ہندو اساطیر کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اور یہ داستان ہندوستانی دیومالا کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔

مذکورہ بالا داستانوں کے علاوہ اور بھی داستانیں مثلاً بوستانِ خیال، الف لیلیٰ، فسانۂ عجائب، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، شکنتلا اور قصہ مادھونل کام کنڈلا قابل ذکر ہیں۔ الف لیلیٰ میں تبدیلیِ قالب کا قصہ، سندباد جہازی، کرداروں کو آدھا پتھر اور آدھا کسی جانور کا کر دینا، دیونما انسان، آدم خور، سفید انڈا، الہ دین کا چراغ وغیرہ اساطیری جہت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد ’فسانۂ عجائب‘ کا اثر اسطوری پہلو سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی اساطیر ساحرہ کا پایا جانا، جانوروں کا انسانوں کی طرح بولنا، اسم اعظم، جادو سے انسانوں کا پتھر کر دینا، شہزادی کے خون سے دریا کا لعل موتی میں تبدیل ہو جانا اور ہیرو کا ہرنیوں کے پیچھے اپنے گھوڑے ڈال دینا جب کہ وہ ہرن نہیں جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔ یہ بھی اساطیری زمرے میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تبدیلیِ قالب کا واقعہ بھی اساطیری عمل ہے۔ اس طرح یہ داستان بھی ہمیں اساطیر سے لبریز نظر آتی ہے۔

’بیتال پچیسی‘ اپنے موضوع سے ہی اساطیری عناصر لیے ہوئے ہے۔ بیتال ایک قسم کے بھوت ہوتے ہیں جو انسانوں کی لاشوں کے درمیان رہتے ہیں۔ اس میں پچیس کہانیاں ہیں اور ان تمام کہانیوں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ ہندو دیومالا اساطیر کے زمرے میں آتے ہیں، جیسے اس میں ایک کہانی بنارس کے راجہ پرتاپ مکٹ کی کہانی ہو یا مدھومالتی کی کہانی، مہادیو کا واقعہ ہو یا برہمن کے لڑکے کی کہانی سب میں اساطیری عناصر ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ’سنگھاسن بتیسی‘ کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند مزید لکھتے ہیں کہ:

’’ان کہانیوں میں دیومالا کا گہرا اثر ہے۔ بیتال پچیسی سے زیادہ پاتال، اندرلوک، اندر، سمندر، دیوتا، چاند دیوتا، شیر، شیش ناگ، جم کے دوت، دیوی، گندھرو یہ سب بار بار رونما ہوتے ہیں...... ایسی تھیلی کہ اس میں کھانے کی جو چیز چاہو نکال لو، ایسی چھڑی جسے لینے والا سب کو دیکھے اور اسے کوئی نہ دیکھے، ایسا لعل جس سے جتنی دولت چاہو مل جائے۔‘‘

(اردو کی نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند جین، 1978، میسرس نشاط آفسٹ پرنٹرس ٹانڈہ، ص 397)

مذکورہ بالا اقتباس سے بیان کردہ تمام کردار اور نشانیاں ہندو اساطیر کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس پوری داستان میں حیرت واستعجاب کے ذریعے دیومالائی عناصر کی فضا واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد شکنتلا داستان کا ذکر کریں تو اس داستان میں ایک کردار کا نام اندر ہندو اساطیر کی علامت ہے اور خود شکنتلا نام بھی ہندو اساطیر کا کردار ہے۔ جس کا ذکر مہابھارت میں کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا داستانوں میں اساطیر کے اس مختصراً جائزے سے اس بات کی توضیح ہوتی ہے کہ داستان اور اساطیر دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور بسا اوقات ان میں فرق واضح کرنا مشکل امر بھی ہوتا ہے لیکن دیومالائی عناصر ہر داستان کا ناگزیر حصہ ہے۔ اساطیر کے تخلیقی استعمال سے داستانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی معنویت کو اجاگر کیا گیا ہے اور اساطیر کے ذریعے کائنات اور اس کے اسرار کو سمجھنے کے لیے اس سے کام لیا جاتا رہا ہے اور اس کے ذریعے کائنات کی تشریح کی کوشش دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔

داستانوں کے علاوہ اساطیر نے اپنے اثرات ناول پر بھی مرتب کیے ہیں۔ ناول جو کہ زندگی کا عکاس ہے، اس میں مافوق الفطری عناصر کا ہی نام نہیں بلکہ موت کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز بھی شامل ہیں۔ اس لیے زندگی کے حقائق کی عکاسی کرنے والی صنف ناول میں

بھی اساطیر کی چھاپ پائی جاتی ہے۔اس سلسلے میں اردو ادب میں اگر دیکھا جائے تو سب سے پہلے ناول نگار نذیر احمد کے پہلے ناول 'مراۃ العروس' میں بھی اساطیری عناصر کی جھلک مل جاتی ہے لیکن ان کے ناول 'رویائے صادقہ' میں زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کیونکہ یہ ناول ایسے کردار کی کہانی ہے جو اپنی آنکھوں میں خواب سجانے کا عادی ہوتا ہے اور اپنے شوہر کی تمام ترباتوں کا جواب اپنے سچے خوابوں کی روشنی میں دیتی ہے۔اس لیے یہ طرز بیان خواب دیکھنا اور خواب کی رہنمائی میں جواب دینا اساطیری اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔نذیر احمد کے بعد اردو ناول میں واضح طور پر اساطیری عناصر پریم چند کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں،ان میں بیوہ، پردۂ مجاز اور گئودان شامل ہیں۔ان کا ناول 'بیوہ' میں بیوہ عورت کی زندگی کے بارے میں جس طرح اس کے احساسات و جذبات کا بیان کیا گیا اس کی خواہشات کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس سے ناول کی فضا میں ہندو اساطیر کے رمز پیدا ہوتے ہیں۔'پردۂ مجاز' کے ذریعے ہندو مذہب میں مروج عقیدہ جنم کا سات بار ہونے کو آشکار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہندو مذہب میں یہ ایک راسخ عقیدہ ہے کہ ہر انسان سات بار جنم لیتا ہے اور اپنے ہر نئے جنم میں پچھلے جنم کی کمیوں اور نامکمل کام کو پورا کرتا ہے۔اس ناول میں اس کے کردار چکر دھر اور مہندر کمار اور دیگر کردار ہیں اور ان کا مختلف جگہ اور موقع پر الگ الگ جنم ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس عقیدے کے مطابق 'پردۂ مجاز' بھی ہندو اساطیر کے زمرے میں شامل ہے۔

ان کا تیسرا ناول 'گئودان' جو کہ اپنے نام سے ہی ہندو دیومالا کی عکاسی کرتا ہے۔

ناولوں میں اساطیری عناصر کا پایا جانا ابھی ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھتا جاتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ غضنفر بھی اپنے ناول 'کینچلی' کے ذریعے دروپدی کے تناظر میں یہی موضوع قلمبند کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں بھی اساطیری علامتیں پائی جاتی ہیں۔ان میں سب سے پہلے ان کا شاہکار ناول 'آگ کا دریا' قابل ذکر ہے۔آگ کا دریا یہ موضوع بہت وسیع معنویت کا حامل ہے، بڑے بڑے فلسفی، ادیب اور دانشور جس عمل کو زندگی سے موت تک کا سفر کہتے ہیں اس کو قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا کہا ہے۔اس ناول میں بھی اساطیر پائی جاتی ہیں۔ اس ناول کے بارے میں ایک رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ اس میں ایک ہی کردار کے جو مختلف روپ پائے جاتے ہیں وہ ہندو اساطیر کے

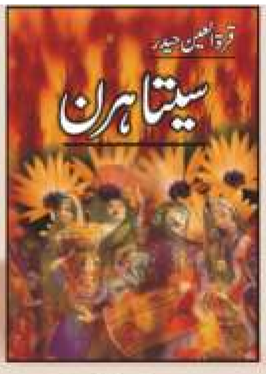

قرۃ العین حیدر کا ایک ناولٹ 'سیتاہرن' رامائن سے ماخوذ ہے جو کہ ہندو دیومالا کا شاہکار ہے۔اس ناولٹ میں سیتا کے کردار کے ذریعے جدید عہد کی عورت کی زندگی کو رامائن کی سیتا کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

آواگون یا عقیدۂ تناسخ کا حصہ ہیں،جب کہ قراۃ العین حیدر نے ان کرداروں کو مختصر تبدیلی کے ساتھ اس لیے پیش کیا ہے کیونکہ وہ بدلتے ہوئے ہر عہد کی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔اسی لیے کرداروں کی ان تبدیلی کو آواگون کی اساطیر نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ کردار موت سے دوچار ہوکر دوبارہ جنم نہیں لیتے ہیں، بلکہ وقت کے ساتھ تبدیلی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ناول میں مشترکہ تہذیب کی بہترین مثال قراۃ العین حیدر نے جس طرح مختلف تہذیب کے اساطیری نقوش کو جمع کرکے پیش کی ہے وہ قابل غور ہے،کہ کس طرح انھوں نے اپنی تحریر میں معنویت اور گہرائی پیدا کرنے کے لیے اساطیر کا استعمال کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے جس خوبصورتی سے مشترکہ اساطیر کو بیان کیا ہے اس کی مثال خال ہی ملتی ہے۔

'آگ کا دریا' کے بعد ان کے دوسرے ناول 'آخر شب کے ہمسفر' میں بھی دیومالائی عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ ناول تمام فنی لوازمات پر پورا اترنے کے ساتھ ساتھ اساطیری تخلیقات کا بھی حامل ناول ہے،جس سے اس ناول کی معنویت اور وسعت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ایک ناولٹ 'سیتاہرن' رامائن سے ماخوذ ہے جو کہ ہندو دیومالا کا شاہکار ہے۔ اس ناولٹ میں سیتا کے کردار کے ذریعے جدید عہد کی عورت کی زندگی کو رامائن کی سیتا کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

اس پورے ناولٹ کو ہندوستانی اساطیر کا ناولٹ کہا جاسکتا ہے کیونکہ کردار کے ساتھ ساتھ پوری کہانی اسی طرز پر لکھی گئی ہے اس لیے اس کو ہندوستانی اساطیر کا بہترین عکاس کہا جاسکتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے ناول 'ایک چادر میلی سی' کا شمار بھی ہندو دیومالائی عناصر میں ہوتا ہے۔اس ناول میں اساطیر کی بڑی واضح مثالیں پائی جاتی ہیں،اس ناول میں انھوں نے اساطیر کے ذریعے ہی کردار کی نفسیات او رتہذیب واقدار کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ناول کے آغاز سے ہی ہمیں دیومالائی فضا ملتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''آج شام سورج کی ٹکیا بہت لال تھی۔ آج آسمان کے کوٹلہ میں کسی بے گناہ کا قتل ہوگیا تھا۔''

(ایک چادر میلی سی،راجندر سنگھ بیدی، 1964، پربھات آفسیٹ پریس،دہلی،ص13)

اس اقتباس سے ہی ایسی فضا کا تصور ہوتا ہے جس میں قتل وخون کا احساس روح کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور سورج کا بیان ایک استعارہ ہونے کے ساتھ ہندو دیومالا میں دیوتا اور طاقت کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا لال ہونا اس کے غیظ وغضب کا اشارہ ہے۔ناول میں جگہ جگہ واقعات کے بیان میں دیومالا کا سہارا لیا گیا ہے جیسے ترشول، دھرم شالہ، بھیرو، بھبھوکا، کرشن، کالی، شیو، پاروتی، دیوی ماں وشنو یہ سارے کردار و علامات ہندوستانی اساطیر کا ناگزیر حصہ ہیں،جس کو بیدی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے ناول میں شامل کیا ہے۔

ان ناولوں کے علاوہ بہت سے ناول ایسے ہیں جن میں اساطیری عناصر موجود ہیں لیکن تمام کا ذکر بغرض طوالت نہیں کیا جاسکتا۔ان کا محض ذکر کرنا ہی مناسب ہوگا۔ان ناولوں میں جیلانی بانو کا 'ایوان غزل' ہے۔اس میں بھی ہندوستانی اساطیر کی کارفرمائی ہے۔اس کے علاوہ 'ٹیڑھی لکیر' اور اس سے آگے بڑھیں تو خدیجہ مستور کے 'آنگن' کے چوکھٹوں میں بھی اساطیر مل جاتی ہیں۔کرشن چندر کے ناول 'دل کی وادیاں سو گئیں' اور 'شکست' کا بیان ہو ان تمام ناولوں میں اساطیری عناصر کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔

جدید دور کے ناول نگاروں میں صلاح الدین پرویز کا ناول 'نمرتا' بھی اساطیری ناول ہے۔اس کے علاوہ شموئل احمد کا ناول 'اے دل آوارہ'، سید محمد اشرف کا 'آخری سواریاں'، 'نمبردار کا نیلا'، پیغام آفاقی کا ناول 'مکان'، عبدالصمد کا 'دوگز زمین'، کوثر مظہری کا 'آنکھ جو سوچتی ہے' اور خالد جاوید کا 'موت کی کتاب' اور 'نعمت خانہ' یہ وہ ناول ہیں جن میں اساطیری عناصر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

■

Tayyaba Bano
Research Scholar, Dept of Urdu,
Aligarh Muslim Univrsity
Aligarh- 201001 (UP)
Email.: tayyababano5@gmail.com

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے، املا، جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

طبی اخلاقیات

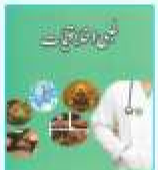

مصنف: حکیم فخر عالم
صفحات: 240، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: محمد فیصل خان
A-46 کرسچن کالونی پٹیل چیسٹ پوسٹ ملکا گنج، دہلی

حکیم فخر عالم صاحب ایک باکمال، متحرک اور فعال شخصیت کے مالک ہیں، طبی ادب پر ان کی گرفت مضبوط و مستحکم ہے۔ انھوں نے بہت سی کتابوں کی تصنیف وتالیف، ترجمے اور ترتیب وغیرہ کا کام انجام دیا ہے۔ ان کی اہم کتابوں میں 'طبی درسگاہیں'، 'اردو مترجمین' اور 'رازی ہند۔ پروفیسر حکیم محمد طیب' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے انوکھی، نادر اور اچھوتی نوعیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی ڈگر پر چلتے ہوئے ان کی نئی کتاب 'طبی اخلاقیات' بھی منظرِ عام پر آچکی ہے یہ کتاب اردو زبان میں اپنے موضوع پر پہلا نایاب کارنامہ ہے جو عام روش سے ہٹ کر اپنی الگ راہ بناتی نظر آرہی ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'طبی اخلاقیات' نو ابواب پر مشتمل ہے کہنے کی ضرورت نہیں کہ علم طب کی ایک قدیم روایت ہے اور ہر عہد میں اس کا بول بالا رہا ہے۔ طبی درسیات کے نظام میں ہر زمانے کے اندر اخلاقیات کو نصاب میں بطور جزو شامل رکھا گیا ہے۔ مگر اس کی طرف خصوصی توجہ مرکوز نہیں رکھی جاسکی اور اخلاقی تعلیم کا معاملہ سرسری ہی رہا۔ چنانچہ فخر عالم صاحب نے مذکورہ کتاب کے پہلے باب کی سرخی 'پس منظر' میں چھ ذیلی عنوانات قائم کرکے اخلاق کا درس دینے کی کوشش کی ہے اس باب میں ہمیں اچھے اخلاق کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور اخلاقیات کی تاریخ کی سیر کرائی جاتی ہے تاکہ روحانی طور پر ہماری طبیعت اس طرف مائل ہوسکے۔ آگے چل کر علم الاخلاق کو اسلامی نقطۂ نظر کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جس کی ضرورت بنی نوع کے ہر انسان کو ہے۔ اس کے بعد خاص پیشے طبیب کی طرف رجوع کرتے ہوئے فنِ طب کے فضائل، طبیب کی اخلاقی قدروں کی اہمیت اور معاشرے وسماج میں اس کے مقام ومرتبے کا تعین کرایا گیا ہے۔

باب دوم 'قدیم تہذیبوں میں طبی اخلاقیات کا تصور' کے عنوان سے ہے اس باب میں چار ذیلی عناوین ہیں جن کے ذریعے ہمیں قدیم تہذیب وتمدن کے اخلاقی رویے جاننے کو ملتے ہیں۔ مثلاً بابل کے حکمراں حمورابی کا ہر شعبۂ حیات کے لیے قوانین تیار کروانا جہاں طبی قوانین کی نشاندہی بھی ملتی ہے، طبیب کے لیے سقراط کا وصیت نامہ تاکہ وہ اپنے اوصاف میں گراں قدر بہتری لاسکیں، قدیم ہندوستان میں طبی اخلاقیات کے تصور سے آگہی اور بطور خاص چینی طب میں اخلاقی قدروں کا جو احترام والتزام رہا ہے ان تمام کا بیان کتاب کے اس حصے میں موجود ہے۔

باب سوم 'طبیب کے اوصاف وخصائل' کے سرنامے کے ساتھ سات ذیلی سُرخی بھی رکھتا ہے۔ اس باب میں ایک عمدہ طبیب کے لیے جن اوصاف کی طرف اشارے کیے گئے ہیں وہ اس طرح ہیں مثلاً اطبّاء اعلیٰ ذہنی صلاحیت رکھتے ہوں اور یونانی طبیبوں کی طرح مخصوص خوبیوں کے مالک ہوں، مطالعے میں وسعت پیدا کریں اور گہرائی وگیرائی کے ساتھ کائنات کے طول وعرض سے کسی نہ کسی حد تک آشنائی رکھتے ہوں، قدیم اطبّا نے علاج ومعالجے کے سرمایے میں تحقیق کے بعد معلومات کے جو خزانے جمع کیے تھے ان سے واقفیت رکھتے ہوں، طبابت کی اس لائن میں تجربے کی اہمیت اور طبّی اخلاقیات میں اس کی ناگزیر حیثیت کا بخوبی علم رکھتے ہوں اور رازداری، دین داری اور اطبّا کے باہمی رشتے پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کی گئی ہے۔ ان تمام کا تعلق اخلاقیات سے ہے اور ان کا سرا کہیں نہ کہیں اخلاقی اصولوں سے جا ملتا ہے، لہٰذا ان تمام گوشوں کا احاطہ اس باب میں کیا گیا ہے۔

باب چہارم 'حاملینِ طب کے غیر مطلوب رویے' ہیں۔ اس باب میں چار ذیلی

عنوانات ہیں جس کے تحت اس بات کا پیغام دیا جارہا ہے کہ ہر طبیب فنِ طب کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے اپنے اندر سے جذبۂ عصبیت کو پاک وصاف کرے، علمی سرقے سے خود کو دور رکھے، کمیشن خوری کی گندگی سے خود کو بچائے بطورخاص طبابت کے پیشے کو اس سے پاک کرے اور سستی شہرت وتشہیر پسندی کی بیماری کا عام رجحان جو ہمارے معاشرے میں جڑ پکڑ چکا ہے طبی پیشہ وارانہ زندگی گزارنے والے اطبّا بطورخاص اس سے پرہیز کریں۔

باب پنجم 'ادبیات اور صیدلاتی امور' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ہمارے اطبا کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ جو طبیب اپنی مرضی سے دیسی طبّوں کی تعلیمی سند حاصل کرتے ہیں پھر وہ انگریزی دواؤں کی پریکٹس نہ کریں۔ حکیمی نصاب پرمبنی کتابوں میں انگریزی ادویات کی شمولیت کو ناپسندیدگی کی نظر دیکھتے ہوئے اسے غیر اخلاقی طریقۂ کار قرار دیا گیا ہے۔ WHO نے ایک عمدہ دوا کی تیاری کے لیے جو ٹکنیکل گائڈ لائن جاری کی ہے ساری دوائیں انھیں اصولوں کی روشنی میں تیار کرائی جائیں تاکہ دوائیں زیادہ مؤثر اور بے خطر بنائی جاسکیں۔ ساتھ ہی اس باب میں دواساز اور دواسازی کی اخلاقیات کو واضح کرنے کے لیے یونانی طِب کے سب سے ممتاز نام 'منہاج الدکان' کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔

باب ششم 'ماحولیات' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اخلاقیات کے ان تقاضوں پر گفتگو کی گئی ہے جن کی ضرورت آج ماحولیات کے حوالے سے سب سے زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔

باب ہفتم 'متفرقات' کے عنوان سے ہے۔ اس کے تین ذیلی عناوین کے تحت ازالۂ مرض کی مجموعی کوشش ایوتھنیز یا یعنی 'اچھی موت' کا طبی تصور اور شفا خانوں کے معالجاتی نظام میں طبی عملے کی اخلاقیات پر گفتگو دیکھنے کو ملتی ہے۔

باب ہشتم 'منقولات' کے سرنامے کو لیے ہوئے اپنے اندر چھ ذیلی سرخی بھی رکھتا ہے جس میں ابوالحسن احمد محمد طبری کی تصنیف 'معالجات بقراطیہ' میں اخلاقیات کا جو بیان ہے اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر اخلاقی واقعات، نظامی عروضی سمرقندی کی 'چہار مقالہ' کی اخلاقی حکایتیں، طبیب کے لیے اخلاقی پابندیوں کے دائرے اور طبیب کی طبّی صلاحیتوں کا معیار جیسے موضوعات پر گفتگو ملتی ہے۔

باب نہم 'اصول وضوابط' کے عنوان سے ہے اس میں بھی چار ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں اس باب میں سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کا ضابطۂ اخلاق، ہمدردانہ حیوانی تحقیق، جدید طبی تحقیق کا اولین ضابطۂ اخلاق اور ہلسنکی اعلامیہ جیسے دورِ حاضر کے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں ماخذ ومنبع کا ذکر کیا گیا ہے جس سے مصنف کی تحقیقی جدوجہد کے بعد قائم کیے گئے نظریات کو تقویت ملتی ہے۔

'تقریظ' کے عنوان سے 'حکیم وسیم احمد اعظمی' صاحب کی تحریر ہے جس کے مطالعے سے ہمیں مصنف کا تعارف اور پیشِ نظر کتاب کے بارے میں بڑی حد تک واقفیت ہوجاتی ہے۔

حکیم فخر عالم صاحب کی کتاب کے بارے میں یہ بات یقین کی حد تک کہی جاسکتی ہے کہ طبی دنیا کے علاوہ عام قاری بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے کیوں کہ اس میں ایسی اخلاقی قدریں موجود ہیں جن کی ضرورت ہر بنی آدم محسوس کرتا ہے۔ امید ہے کہ ہر ذی شعور احبابِ نظر اس سے بھرپور استفادہ کریں گے اور یہ کتاب اپنی گوناگوں خصوصیات کی بناپر مقبولِ عام کی سند حاصل کرے گی۔

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

مونوگراف

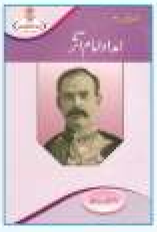

امداد امام اثر (فردنامہ)

مصنف: ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی

صفحات: 133

ناشر: اُردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

مبصر: امام الدین امام، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

امداد امام اثر کا شمار اُردو تنقید کے معماروں میں ہوتا ہے۔ امداد امام اثر کی کتاب 'کاشف الحقائق' سے پہلے اُردو میں تنقید پر جو باضابطہ کتاب تسلیم کی جاتی ہے، وہ حالی کی 'مقدمۂ شعروشاعری' ہے۔ مگر اہل علم کا یہ ماننا ہے کہ یہ کوئی باضابطہ تنقیدی کتاب نہیں بلکہ حالی کے دیوان کا مقدمہ ہے۔ اس لیے وہ اس کو پہلی تنقیدی کتاب ماننے سے احتراز کرتے ہیں۔ اُردو میں باضابطہ تنقیدی کتاب اگر کوئی ہے تو وہ اثر کی 'کاشف الحقائق' ہے۔ اس کتاب میں تنقید کے اصول وضوابط اور عالمی ادب کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ مصر، یونان، عرب، ایران، مغرب اور ہندوستان کی کلاسیکی تمام ادبیات پر اس کتاب میں اثر نے روشنی ڈالی ہے۔ ادبیات عالم کے ساتھ ساتھ انھوں نے فن مصوری اور موسیقی جیسے فنون لطیفہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اسی ادیب شہیر کی شخصیت اور خدمات پر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کا یہ فردنامہ زیر بحث ہے۔

اس کے بعد مصنف کا لکھا ہوا ابتدائیہ ہے جو تقریباً ڈھائی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ابتدائیے میں مصنف یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''حالی اور امداد امام اثر تک اُردو میں تنقیدی اصطلاح کی کوئی باضابطہ روایت نہیں ملتی۔'' (ص 7) اس کے بعد 12 ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ جو اس طرح ہیں: ''امداد امام اثر: ایک نظر میں، مختصر حالات زندگی، امداد امام اثر کا تصور نقد، امداد امام اثر سے قبل بہار میں تنقید کے نقوش، کاشف الحقائق کا تنقیدی مطالعہ، کاشف الحقائق: نوآبادیاتی تناظر، امداد امام اثر کی نثری تصانیف، امداد امام اثر بحیثیت شاعر، نمونۂ نثر، نمونۂ اشعار، اختتامیہ اور 'کتابیات' ہے۔

'امداد امام اثر کا تصور نقد' اس باب میں مصنف نے اثر کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اثر شاعری کی دو قسمیں مانتے ہیں۔ ایک داخلی اور دوسری قسم خارجی، آگے لکھتے ہیں کہ اثر ''اپنی عملی تنقید میں ان اصولوں کو ضرور پیش نظر رکھتے ہیں جو ان کے خیالات کی حمایت کرتے ہیں اور بعض جگہ ان کا اظہار بھی کرتے جاتے ہیں۔'' (ص 29) اگلے باب 'امداد امام اثر سے قبل بہار میں تنقید کے نقوش' اس کے شروع میں مصنف نے صرف تذکروں کی اہمیت پر ڈھائی صفحے صرف کیے ہیں۔ اس کے بعد وہ بہار کے تذکروں کا ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے بعد والے باب 'کاشف الحقائق کا تنقیدی مطالعہ' میں انھوں نے کاشف الحقائق کی دونوں جلدوں میں موجود ادبیات عالم اور ادب کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ پر تنقیدی نگاہ ڈالتے نظر آتے ہیں۔ اس باب میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ امداد امام اثر کو جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا۔ اُردو میں تنقید کے لیے Criticism لفظ کا استعمال سب سے پہلے امداد امام اثر نے ہی کیا ہے۔ اثر مغربی ادبیات کے عالم ضرور ہیں لیکن اندھے مقلد بالکل بھی نہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر آفتاب احمد آفاقی لکھتے ہیں: ''اثر ان ادیبوں سے مطمئن نہیں جنھوں نے انگریزی فن تنقید کی بنیاد پر مشرقی شعروادب کی جانچ پرکھ کی ہے۔'' (ص 49) مصنف لکھتے ہیں کہ جلد اوّل میں اثر نے روم، مصر، فارس، اٹلی اور عرب کے شاعروں کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ بقول آفاقی صاحب اثر Subjective داخلی شاعری سے انسان کے قوائے داخلیہ اور واردات قلبیہ کی مصوری مانتے ہیں اور اس زمرے کے شاعروں میں وہ ہیومرس، ورجل، فردوسی، شیکسپیئر، گوئٹے، میر انیس، بالمیکی، ویاس اور کالی داس کو اسی سلسلے کی کڑی مانتے ہیں۔ اثر کا ماننا ہے کہ موسیقی ایک ایسا فن ہے جس سے انسان، حیوان اور چرند پرند بھی متأثر ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے جو نکات اثر نے پیش کیے ہیں آفتاب آفاقی صاحب نے ان کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اثر کا ماننا ہے کہ ''موسیقی کا تعلق سفلی جذبات کے بجائے ہماری اخلاقیات سے ہے۔'' (ص 53) کاشف الحقائق کا دوسرا حصہ فارسی شاعری سے شروع ہوتا ہے جس میں اثر نے غزل کے شعرا کے تحت سعدی، جامی، فغانی، خسرو، شیرازی، علی قلی خاں آملی، ابوطالب کلیم، شیخ علی حزیں، صائب وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور قصیدہ نگاروں میں رودکی، فردوسی، سنائی، انوری، خاقانی، سعدی، عرفی شیرازی، اور فارسی قطعہ نگاروں کے ذیل میں ابن ایمن، سعدی، فردوسی، نظامی، سنائی اور غالب، رباعی کے ذیل میں فردوسی، رومی، خاقانی، انوری، عمر خیام، سعدی، اور فارسی مثنوی نگاری میں شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، اور سعدی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

اردو کے مختلف صنف شاعری کے شعرا میں اثر نے ولی، سودا، درد، میر، مومن، آتش، ذوق، غالب، ناسخ اور رند وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اسی مونوگراف کے صفحہ 62 پر مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالی اور شبلی کی طرح اثر بھی سرسیّد تحریک اور نیچرل شاعری کے نظریے کے حامل تھے۔ اثر کی نظر ادبیات عالم پر تھی اور وہ ان کو سامنے رکھ کر ڈرامہ کے بارے میں مانتے ہیں کہ ہندوستانی سنسکرت ڈرامہ یونان سے کسی درجہ کم نہ تھا۔ (ص 68) یہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری کی تمام کلاسیکل اصناف فارسی شاعری کی مرہون منت ہے۔ چنانچہ اثر کا بھی یہی ماننا ہے کہ دونوں زبانوں (اردو، فارسی) کی شاعری کا ایک ہی انداز ہے۔ باب 'کاشف الحقائق: نوآبادیاتی تناظر' میں مصنف لکھتے ہیں کہ امداد امام اثر بھی مغربی رنگ میں رنگ کر کہیں کہیں مغربیت کو غالب کرتے ہیں۔ دیکھیے ''ایک جگہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اہل ہند کو مصوری کا مذاق بہت کم ہے جن لوگوں کو ہے وہ بھی تو انہیں اہل یورپ کی بدولت ہے۔'' (ص 86) 'امداد امام اثر کی نثری تصانیف' کے تحت ان کی نثری کتب کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ 'امداد امام اثر بحیثیت شاعر' کے تحت ان کے اشعار پیش کیے گئے ہیں اور اس کے رنگ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ساتھ ہی بڑے شاعروں کے رنگ کے کلام کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ اثر کی شاعری اپنی خصوصیات کی بنا پر ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب امداد امام اثر کے حالات زندگی اور تنقیدی و ادبی خدمات کا مختصر مگر جامع پتہ دیتی ہے۔ یہ کتاب ہر ادب کے طالب علم کے مطالعے کی میز پر ہونی چاہیے۔

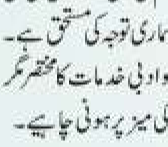

احمد جمال پاشا (مونوگراف)

مصنف ڈاکٹر ظفر کمالی

صفحات: 136

ناشر: اردو ڈائریکٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

مبصر: حرا قمر، ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی

'احمد جمال پاشا' ڈاکٹر ظفر کمالی کا تحریر کردہ مونوگراف ہے۔ مونوگراف کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس میں پہلا باب احمد جمال پاشا: ایک نظر میں، دوسرا باب شخصی تعارف، تیسرا باب تصنیفات وتالیفات، چوتھا باب ادبی خدمات، پانچواں باب احمد جمال پاشا کی مزاحیہ صحافت 'اودھ پنچ' کے حوالے سے اور چھٹا باب انتخاب نگارشات ہے۔

زیرِ تبصرہ مونوگراف میں ڈاکٹر ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کی شخصیت اور فکر و فن پہ مختصر لفظوں میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ احمد جمال پاشا بے حد فعال ادیب تھے وہ بنیادی طور پر ظرافت نگار تھے ان کا شمار بہار کے منفرد ادیبوں میں ہوتا ہے۔ احمد جمال پاشا علم و ادب کی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ مضمون نگار، تحریف نگار، خاکہ نگار، کالم نگار اور تنقید نگار تھے۔ انھوں نے اپنے علمی ادبی کارناموں سے نہ صرف معاصرین کو متاثر کیا بلکہ طنز و مزاح کے میدان میں اپنی انفرادیت بھی قائم کی۔

پہلے باب میں احوال و آثار کے تحت ان کے حالات زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ان کی پیدائش سے لے کر تعلیم و تربیت، اساتذہ کرام سے ان کی قربت، دوست احباب اور معاصرین سے ان کے تعلقات، علی گڑھ میگزین اور اخبار ’قومی آواز‘ سے ان کی وابستگی، سیوان بہار کے اسلامیہ کالج میں استاد کی حیثیت سے تقرری، ادبی زندگی کا آغاز، پہلا اور آخری مضمون، اور حوصلہ افزائی کرنے والے اساتذہ کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں احمد جمال پاشا کا شخصی تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفر کمالی نے ان کے عادات و اخلاق، نرم مزاجی، اعلیٰ ذہانت، جمالیاتی ذوق پر بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’احمد جمال پاشا نے بھرپور زندگی گزاری۔ وہ مسرت اور محبت کے خزانے جھولیاں بھر بھر کر لٹاتے رہے۔ دوسروں کی مدد اپنی بساط سے بڑھ کر کی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت کم لوگ ان کو پہچان سکے۔ انھوں نے ظرافت کا ایسا لبادہ اوڑھ رکھا تھا کہ عام لوگ تو درکنار، ان سے قریب رہنے والے لوگ بھی ان کی اصل شخصیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔‘‘ (ص 23)

تیسرے باب میں احمد جمال پاشا کی تمام تصنیفات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے ظریفانہ مضامین کے مجموعوں میں اندیشۂ شہر، ستم ایجاد، لذت آزار، مضامین پاشا، چشم حیراں، پتیوں پر چھڑکاؤ وغیرہ ہیں اور تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت، ظرافت اور تنقید مقبول ہیں۔ احمد جمال پاشا کی ان تنقیدی کتابوں کے بارے میں ڈاکٹر ظفر کمالی کا یہ دعویٰ درست ہے کہ ادب میں یہ پہلا مجموعہ ہے جس میں صرف ظرافت اور ظریفوں کو کھنگالا گیا ہے۔ ان کی مرتب کردہ کتابوں میں مجاز کے لطیفے، غالب سے معذرت کے ساتھ کافی مشہور ہیں۔ احمد جمال پاشا نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھیں جن میں بہادر ٹمبا، دنیا کی لوک کہانیاں، بالیشیتے کی گھنٹی، آسمانی یاقوت وغیرہ ہیں۔

چوتھے باب میں احمد جمال پاشا کی ادبی خدمات کا ذکر ہے۔ جس میں مضمون نگاری، تحریف نگاری، خاکہ نگاری، کالم نگاری، تنقید نگاری پر بات کی گئی ہے۔ احمد جمال پاشا کے مزاحیہ مضامین جو خاصے مشہور ہیں مقدمے کا مقدمہ، چارہ، شکر کا چکر، ادب میں مارشل لا ہیں۔ ادب میں مارشل لا ان کا شاہکار مضمون ہے۔

احمد جمال پاشا نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ پیروڈی پر بھی توجہ صرف کی۔ ڈاکٹر ظفر کمالی نے ان کی پیروڈیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک ایسی پیروڈیاں جن میں کسی مصنف کے طرز و اسلوب کا خاکہ اڑا کر اس کی خامیاں اجاگر کی گئی ہوں۔ دوسرا وہ پیروڈیاں جن میں طرز تحریر کی تقلید کے علاوہ معاشرے کی خامیوں کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے۔ جیسے طرز نگارش میری، کپور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ کپور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعے میں کنہیا لال کپور کو ظریفانہ انداز میں بہترین خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ جسے کنہیا لال کپور نے خود بھی طنز و مزاح کا شاہکار قرار دیا ہے۔ خاکوں کے مجموعے ’آئینے‘ جو انھوں نے خود مرتب کیا تھا کتابی صورت میں منظر عام پر نہ آسکا۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کی شخصیت پر بھی ایک خاکہ لکھا۔ خاکہ نگاری میں احمد جمال پاشا کا کمال یہ ہے کہ وہ زیادہ تر موثر اور دل پذیر لکھتے ہیں۔ جب ماضی کا ذکر کرتے ہیں تو اسے حال بنا دیتے ہیں۔ احمد جمال پاشا نے کالم نگاری میں بھی طبع آزمائی کی، وہ قومی آواز میں ملازمت کے دوران مزاحیہ کالم ’گلوریاں‘ لکھا کرتے تھے۔ قومی آواز کے علاوہ ہندی روزنامہ ’نوجیون‘ میں ’پھلجھڑی‘ کے عنوان سے ایک کالم شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے چوراسی کالموں کی فہرست تیار کی جس کا عنوان ’خاصدان‘ رکھا۔

پانچویں باب میں اخبار ’اودھ پنچ‘ سے ان کی وابستگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں معاون کے طور پر احمد جمال پاشا نے اخبار کا معیار بلند کرنے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ چھٹے باب میں احمد جمال پاشا کی کچھ منتخب نگارشات پیش کی گئی ہیں۔ جس میں ’گلی ڈنڈے پر سیمینار (مزاحیہ مضمون)، کپور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (پیروڈی)، کلیم الدین احمد (خاکہ)، فن لطیفہ گوئی (تنقید) شامل ہے۔ ان چاروں تحریروں کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی شاہکار تحریریں ہیں۔

مجموعی طور پر یہ مونوگراف احمد جمال پاشا کی شخصیت اور ان کی زندگی کی مختصر روداد ہے۔ جس کے ذریعے ظفر احمد کمالی نے احمد جمال پاشا کی مختصر سوانح مرتب کردی ہے۔

ترتیب

افسانچے کی ادبی حیثیت (مباحثہ)

مؤلف: تنویر اختر رومانی
صفحات: 112 / قیمت: 200 روپے
ملنے کا پتہ: تنویر کتاب کونا، 59، چونا شاہ کالونی، مانگو، جمشید پور
مبصر: عشرت ظہیر، مکان نمبر 370-A، فورتھ فلور، گلی نمبر 6-A، ذاکر نگر جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

رواں صدی گویا حیران کن صورت حال کی صدی ہے۔ اس ترقی پذیر ڈیجیٹل عہد میں انسان مصروفیت کا رونا روتا نظر آرہا ہے۔ ڈیجیٹل ذرائع نے انسان کے کام کو مختصر اور آسان تو کیا ہے، لیکن پھر بھی وہ مصروف زندگی جی رہا ہے۔ غالباً اسی مصروفیت نے افسانچے کے فروغ کے لیے ذہن ہموار کیا ہے۔

حیرت یہ ہے کہ اس صدی میں افسانے کی کلیات اور ناول کی تخلیق و اشاعت کا رجحان بھی پروان چڑھ رہا ہے۔

میرے پیش نظر تنویر اختر رومانی کی مرتب کردہ کتاب ’افسانچے کی ادبی حیثیت‘ (مباحثہ) ہے۔ متعدد کتابوں کے خالق، افسانہ نگار، افسانچہ نگار، مترجم اور مسائل ادب و شعر سے متعلق مباحثوں کے محرک کے طور پر تنویر اختر رومانی اپنی نمایاں پہچان رکھتے ہیں۔

افسانچے کی ادبی حیثیت کے تعین کے تعلق سے تنویر اختر رومانی کی مرتب کردہ کتاب ’افسانچے کی ادبی حیثیت‘ میں 67 مقتدر و معروف قلم کاروں کی اس صنف کے فنی نکات و رموز کی توضیح میں، اظہار خیال شامل ہیں۔ سید احمد شمیم، غضنفر علی، نعیمہ جعفری پاشا، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر اختر آزاد، ڈاکٹر پرویز شہریار، رفیع حیدر انجم، راجہ یوسف، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر یاسمین اختر، ڈاکٹر ریاض توحیدی، اسلم جاوداں، غالب نشتر، بلراج بخشی، عارف اقبال، انور امام، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں وغیرہ نے صنف مذکورہ کی ادبی حیثیت سے متعلق اہم اور لطیف نکتوں کی وضاحت کی ہے۔ مختصراً رائے دہندگان کے طور پر 12 مزید قلمکاروں کی آرا بھی شامل اشاعت ہیں۔ خود مؤلف کا ’کلیدی رائے‘

کے زیرِ عنوان کہنا ہے:

"... افسانچے میں دو خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو مختصر افسانے کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہیں اور افسانچے کی ادبی حیثیت کی بھی ضامن ہیں۔ اولاً وحدت تاثر، ثانیاً کفایت لفظی..."

یوں تو اس مباحثے میں شامل فنکاروں، قلمکاروں نے اپنی باتوں اور فنی نکتوں کو مختصر محض ایک سے ڈیڑھ صفحے میں سمیٹ لیا ہے، لیکن غضنفر علی اور قیوم اثر نے پانچ پانچ صفحات میں اپنے نقطۂ نظر کی توضیح میں گویا مستقل مضمون ہی رقم کیا ہے۔

دلچسپ اور حیران کن بات یہ ہے کہ دونوں اصحاب کی باتوں کا بنیادی عنصر یا نقطۂ پیرایۂ اظہار ایک جیسا ہے۔ حالانکہ تاویلات، دلائل اور اسٹائل میں بُعد اور اختلاف نمایاں ہیں۔ غضنفر علی کا پہلا جملہ ہے:

یہ 'ۂ' اور 'چ' سے بنا لاحقہ 'چہ'، جس شے سے بھی ملتا ہے اسے چھوٹا کر دیتا ہے، اس کی حیثیت، جسامت، قدر و قیمت سبھی کو گھٹا دیتا ہے..."

مزید وضاحتوں میں غضنفر علی نے صندوق اور کتاب کے حوالے دیے ہیں جن سے صندوقچہ اور کتابچہ بنائے جاتے ہیں۔

قیوم اثر نے یوں تو اپنی بات منٹو کے 'سیاہ حاشیے' سے شروع کی ہے لیکن وضاحتوں اور استدلالی وسعتِ اظہار میں وہ رقمطراز ہیں:

"... اردو اور فارسی صرف و نحو کے اعتبار سے کسی اسم کو لاحقہ 'چہ' لگانے سے اسے چھوٹا گردانا جاتا ہے۔ جیسے: طاق + چہ = طاقچہ، نہال + چہ = نہال چہ، کتاب + چہ = کتاب چہ

یہ حقیقت ہے کہ افسانے کے ساتھ افسانچہ ایک ایسا ترکیبی لفظ ہے جو افسانہ کے مقابلے میں اسے بذات خود بظاہر کمتر ٹھہراتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس مخصوص صنف کا وجود طبعی انسانی الجھنوں اور پریشانیوں کو ہنگامی طور پر تسکین فراہم کرتا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ غضنفر علی نے افسانہ اور افسانچہ کے فنی حدِ امتیاز کی وضاحت میں دس نکتے درج کیے ہیں اور افسانچہ کو سنوارنے سجانے اور مقام اعتبار پر متمکن کیے جانے کے لیے سات نکتے سجھائے ہیں۔ وہ اس چیلنج کو سر کرنے کے لیے رقم طراز ہیں:

"اس کے لیے چنتن کرنا ہوگا، مراقبے میں بیٹھنا ہوگا، تپ جپ کرنا ہوگا، بحر کائنات میں ڈوب کر زندگی کا منتھن کرنا ہوگا، فسوں سازی کے عمل سے گزرنا ہوگا..."

قیوم اثر بھی اپنی باتوں کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بہر حال افسانچہ ثمر بار ہے... افسانچہ کو لاوارث سمجھ کر چھوڑ دینا بُرا ہے۔ اردو ادب میں اس کی شمولیت تنقیدی اجتہاد چاہتی ہے۔"

بہر حال دونوں مضمون قابل اعتنا اور اہم ہیں۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ مختلف و متضاد اظہار خیال کے اس ہجوم میں انتشار و پیچیدگی سے پرے ایک مثبت، مستقیم اور خوش آئند صورت حال کی راہ اجاگر ہوئی ہے۔

حالانکہ کسی بھی صنف ادب کے تعلق سے قطعی اور مکمل تعریف کا تعین غیر ممکن ہے، لیکن پھر بھی فن کا اعجاز اور فراز تو بہر حال فنی پہلوؤں کا ہی مرہون منت ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ فن کے نشیب و فراز کی پیمائش اور اس کے پوشیدہ اور ظاہر نکتوں کے تعلق سے فکر و تدبر کے سلسلے دراز ہوا کرتے ہیں۔

'افسانچے کی ادبی حیثیت' کی اشاعت اور اس مباحثے میں شامل فنکاروں اور قلمکاروں کے اظہار خیال سے مزین یہ کتاب یقیناً افسانچہ نگاروں کے لیے بروقت بھی ہے اور راہ نما بھی، نیز افسانچے سے متعلق مختلف اظہار رائے کے باوجود ایک مثبت اور مستقیم نکتے پر مرتکز ہے۔ اس کے مطالعے سے اس صنف کی فنی باریکیاں نمایاں ہیں۔

احمد صغیر کے افسانوں میں دلت کلامیہ

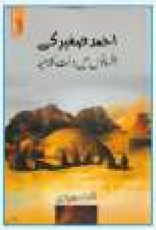

مرتبہ: ڈاکٹر نزہت پروین

صفحات: 272، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی 110002

مبصر: ڈاکٹر ثروت ناز، ترار، داؤد نگر 824143 اورنگ آباد (بہار)

زیر تبصرہ کتاب میں احمد صغیر کے دلت افسانوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پریم چند سے لے کر موجودہ دور تک تقریباً سبھی افسانہ نگاروں نے دلت افسانے لکھے ہیں لیکن کسی کے پاس ایک یا دو سے زیادہ افسانے نہیں ہیں البتہ پریم چند کے یہاں پانچ افسانے ملتے ہیں احمد صغیر نے پہلی بار تقریباً پچیس افسانے دلت موضوع کو سامنے رکھ کر لکھے ہیں، چودہ افسانے تو ان کے افسانوی مجموعہ 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے' میں شامل ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں انھیں چودہ افسانوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نزہت پروین نے تقریباً چالیس صفحے کا مقدمہ لکھا ہے اور ان کے سبھی افسانوں کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔

اس کتاب میں پہلا مضمون پروفیسر افصح ظفر کا ہے۔ پروفیسر افصح ظفر نے اپنے مضمون 'طبقاتی رشتوں کا نیا انداز بیانیہ' میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ احمد صغیر نے نچلے طبقے کے ان انسانوں پر قلم اٹھایا ہے جنھیں ہمارا سماج، ہمارا معاشرہ اور ہماری تاریخ حاشیے پر رکھتی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون 'انحراف اور احتجاج کے افسانے' میں یہ بتایا ہے کہ احمد صغیر کی کہانیاں حقیقت سے زیادہ قریب ہیں۔ خالص دلتوں اور غریبوں کے خشک و غیر دلچسپ مسائل پر لکھے گئے احمد صغیر کے یہ افسانے احتجاجی تو ہیں ہی انحرافی بھی ہیں اور یہی کیفیت اور خاصیت احمد صغیر کی کہانیوں کو پڑھوائے گی۔ پروفیسر محفوظ الحسن نے بھی احمد صغیر کے افسانوں کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے احمد صغیر کو ارضی حقائق اور طبقاتی کشاکش کا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر متھن کمار احمد صغیر کا افسانہ 'آگ ابھی باقی ہے' اور 'اوور ٹائم' اور 'فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی' کو بہترین افسانہ تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو میں ابھی تو دلت ادب کے متعلق بحث شروع ہوئی ہے، لہٰذا بہت سے نکات واضح نہیں ہو پائے ہیں مگر توقع ہے کہ آئندہ احمد صغیر مزید دلت افسانے لکھ کر اردو ادب میں دلت افسانوں کی کمی کو دور کریں گے۔

نور الحسنین نے اپنے مضمون میں افسانہ 'سوانگ' کو بہترین افسانہ تسلیم کیا ہے فاروق ارگلی نے افسانہ 'پیاسی ہے زمین پیاسا آسمان' اور 'تعفن' کو بہترین افسانہ گردانا ہے۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے دلت افسانے اور ناول کے حوالے سے بہت سارے مضامین لکھے ہیں۔ اس کتاب میں بھی ان کا ایک مضمون بعنوان 'احمد صغیر کے افسانوں میں دلت ڈسکورس' شامل ہے، اس مضمون میں انھوں نے احمد صغیر کے دلت افسانوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ احمد صغیر دلت مسائل پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مسائل سے احتجاج کے شعلے بھڑکیں۔

معصوم عزیز کاظمی نے احمد صغیر کو ایک حقیقت پسند افسانہ نگار تسلیم کیا ہے تو ڈاکٹر اشہد کریم الفت نے احمد صغیر کے افسانوں میں احتجاج و مزاحمت کو تلاش کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال واجد نے احمد صغیر کے افسانوں کے حاشیائی کرداروں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ محمد غالب نشتر نے احمد صغیر کی کہانیوں میں دلت ڈسکورس تلاش کیا ہے۔

ڈاکٹر نسیم ابن صمد کا مضمون سب سے طویل ہے جس میں انھوں نے احمد صغیر کے افسانوں کا فنی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر اما پتی، بشریٰ چشتی، شبنم بانو، طیبہ خاتون اور عزہ معین کے مضامین بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب ان معنوں میں اہم ہے کہ ہم جب بھی احمد صغیر کے دلت افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہیں گے ہمیں بھرپور مواد مل جائے گا، ویسے بھی اردو میں دلت افسانوں پر کام بہت کم ہوا ہے۔ اب تک دو دلت افسانوں کا انتخاب اور دلت افسانوں پر تین تنقیدی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر نزہت پروین قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس اہم موضوع پر کتاب شائع کی ہے۔

فکشن

چیونٹیوں کے درمیان

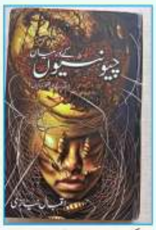

مصنف: اقبال نیازی

ضخامت: 192 صفحات، قیمت: 200 روپے

مبصر: محمد علیم اسماعیل، اسسٹنٹ ٹیچر، عثمانیہ چوک، نزد بینک آف انڈیا شیو نمکین کے پیچھے نندورہ۔ 443404

اقبال نیازی کے افسانچے اور مختصر کہانیوں کا مجموعہ 'چیونٹیوں کے درمیان' 2024 میں منظر عام پر آیا۔ اقبال نیازی مشہور ڈراما نویس ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے بچوں کے ادب میں بھی کام کیا ہے۔ کتاب میں مصنف کے اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ پروفیسر اسلم جمشید پوری، عذرا علیم، ڈاکٹر یاسمین اختر، ڈاکٹر محمد حسین پالوجی شارب اور ڈاکٹر رقیہ جمال کے مضامین شامل ہیں۔ جو اقبال نیازی کے فکر و فن پر تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

اس کتاب میں کل 102 کہانیاں شامل ہیں اور سبھی کہانیاں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کتاب میں کہانیوں سے مناسبت رکھتی ہوئی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ چونکہ اقبال نیازی ایک ڈراما نگار ہیں اس لیے ان کے افسانچوں میں ڈرامائی عناصر در آئے ہیں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری لکھتے ہیں:

افسانچے میں نیا پن لانا، مشکل ترین عمل ہے۔ یہاں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ افسانچے کی روح بھی متاثر نہ ہو اور کوئی نیا پہلو بھی سامنے آئے۔ اقبال نیازی کے کئی افسانچوں میں ڈرامائی عناصر ملتے ہیں۔ یہ ایسے افسانچے ہوتے ہیں کہ افسانچے کا قصہ مکالموں سے آگے بڑھتا ہے اور پورے افسانچے میں ہمیں مناظر نظر آتے ہیں۔ اقبال نیازی خود بھی ایک ماہر ڈراما نگار ہیں اور ہر وقت ڈرامے کے نئے نئے پہلو سوچتے ہیں۔ ایسا فنکار جب افسانچے قلم بند کرتا ہے تو افسانچوں میں ڈرامے کے رنگ و آہنگ کا در آنا بالکل فطری ہے۔ (چیونٹیوں کے درمیاں، ص 13)

اقبال نیازی کی کہانیاں اپنے پیغام کی واضح ترسیل کرتی نظر آتی ہیں، جو اختصار کو برقرار رکھتے ہوئے نپے تلے الفاظ میں منظر کشی اور جذبات نگاری کا حق بھی ادا کرتی ہیں، اور قارئین میں ہمدردی کا جذبہ اور خود شناسی کا احساس بھی پیدا کرتی ہے۔ اقبال نیازی کی بہت سی کہانیوں کے اختتام قاری کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ زیادہ تر کہانیاں حقیقی تجربے کی عکاسی معلوم ہوتی ہیں۔ کچھ کہانیاں اخلاقی درس کی ترسیل کرتی نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں یہ کہانیاں ہماری ثقافت اور روایت کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔

اس کتاب میں، ایک دشواری یہ ہے کہ مختصر کہانیوں اور افسانچوں کو واضح طور پر الگ نہیں کیا گیا ہے۔ افسانچے کا قاری دونوں کے درمیان امتیاز کر سکتا ہے لیکن ایک عام قاری کے لیے یہ الجھن کا باعث ہو سکتا ہے، وہ مختصر کہانی کو بھی افسانچہ سمجھ سکتا ہے۔

آیئے چند افسانچوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

افسانچہ 'روزی روٹی' میں غربت اور استحصال کی ایک تلخ حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانچے میں ایک ماں اور اس کے بچوں کی پریشانیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

روزی اپنے بچوں اور اپنی ماں کا پیٹ پالنے کے لیے اتنی مجبور ہے کہ ایک کمپنی کے اعلیٰ افسر کے ذریعے، معمولی سے روپیوں کے بدلے ذلت اور بدسلوکی برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ اس کہانی میں روزی جیسے کمزور افراد کے استحصال کو بخوبی دکھایا گیا ہے۔ یہ کہانی معاشی عدم مساوات، طاقت کا غلط استعمال، اور غربت کے غیر انسانی اثرات کے موضوعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ روزی کی صورت حال ان لوگوں کی عکاسی کرتی ہے جو بعض اوقات زندہ رہنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ افسر کی طرف سے روزی کے وقار کو نظر انداز کرنا اور اس کی مجبوری کا غلط فائدہ اٹھانا، صنفی عدم مساوات جیسے اہم معاشرتی مسئلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مزید برآں، کہانی کا اختتام قاری کو سوچ کی گہرائیوں میں غرق کر دیتا ہے۔ روزی کے ساتھ روٹی کا لفظ ایک تاثیر پیدا کر رہا ہے۔ مجموعی طور پر، یہ کہانی معاشرے میں پسماندہ افراد کو درپیش چیلنجوں کی نشاندہی کرتی ہے، جو قارئین کو ناانصافیوں اور عدم مساوات جیسے مسائل کا مقابلہ کرنے اور ان سے نمٹنے کا پیغام دیتی ہے۔

اسی طرح، گرہستی کی سلوٹیں، سیڑھیاں اور شانے، وہ مسبب الاسباب ہے!، ایش ٹرے میں سلگتی سگریٹ، اور دیگر افسانچوں کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نیازی کی کہانیاں متاثر کن ہیں، جو پڑھنے کے بعد قاری پر دیرپا تاثر چھوڑتی ہیں۔

شاعری

سمندر سے خفا موج

شاعر: ڈاکٹر نثار راہی

صفحات: 146 قیمت: 250 روپے سنہ اشاعت: 2023

پبلشر: وَنسل پرکاشن، بیکانیر 334003

مبصر: حبیب کیفی، 72، لالہ لاجپت رائے کالونی پانچویں چوپاسنی روڈ عیدگاہ، جودھپور۔ 342003 (راجستھان)

یہ ایک حقیقت ہے کہ دورِ حاضر میں اردو میں شائع ہونے والی کتب میں ہر دوسری کتاب شعری مجموعہ یا پھر شاعری سے تعلق رکھنے والی کتاب ہی ہوا کرتی ہے۔ ذرا ٹھہر کر غور کریں تو یہ ایک حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ ایسا تو ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ یعنی نظم کو ہمیشہ ہی نثر پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اس کی اصل وجہ ہمیشہ ہی شاعروں کی کثیر تعداد رہی ہے اور اسی نسبت سے شعری تخلیقات بھی بڑی تعداد میں شائع ہو کر کتابی شکل میں سامنے آتی رہی ہیں۔

شاعری کی بے شمار کتب کے ضمن میں جب معیار و مرتبے کی بات چلتی ہے تو اکثر ہی خاموش رہ جانا پڑتا ہے۔ لیکن ایسے میں بھی شاعری کے کچھ مجموعے اپنی جانب توجہ مبذول کرا لیتے ہیں اور اس تیز گام یا کہنا چاہیے کہ برق رفتار دور میں بھی ٹھہر کر نہ صرف غور و فکر پر آمادہ کر لیتے ہیں بلکہ اچھی شاعری اور اس کے روشن امکانات کی نشاندہی بھی کر دیا کرتے ہیں۔ ایسی ہی شاعری کی چند مثالیں اشعار اور نظموں کی شکل میں ڈاکٹر نثار راہی کی حالیہ شعری کتاب 'سمندر سے خفا موج' میں دیکھنے کو ملیں۔

کوئی سترہ برس پہلے ڈاکٹر نثار راہی کا اولین شعری مجموعہ بہ عنوان 'روشنی کے دروازے' منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد اردو شاعری پر ہی مشتمل ان کا ایک مجموعہ دیونا گری میں 2013 میں آیا۔

ڈاکٹر نثار راہی کی شاعری کے ضمن میں صبر و تحمل کی بات میں نے کہی تو اس لیے کہ اٹھارہ برس کی لمبی مدت کے بعد اردو میں ان کا یہ دوسرا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ اس اثنا میں شاعر نے تقریباً ان دو دہوں میں جو بھی دیکھا اور اپنے تئیں محسوس کیا، اسے

شعر کے قالب میں ڈھال دینے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ ان کے بیشتر اشعار اور کچھ نظمیں اس بات کے شاہد ہیں۔ نثار بڑی ہنرمندی کے ساتھ واردات قلبی کو ذہنی سطح پر خوب اچھی طرح سے جانچ پرکھ کر شاعری کے سفر پر گامزن ہیں۔ ان سے مزید بہتر اور بہترین شاعری کی توقع اس لیے بھی کی جاسکتی ہے کہ فہم و ادراک میں پختگی آرہی ہے۔ اپنی بات کی تصدیق کی غرض سے میں نثار راہی کی شاعری کی زیر تبصرہ کتاب سے چند اشعار اور نظمیں یہاں پیش کرتا ہوں۔

یہ اور بات کہ رستے بھی ہوگئے روشن
دیے تو ہم نے ترے واسطے جلائے تھے
کہیں سراب کہیں آب ہی سے نکلی ہے
یہ کائنات کسی خواب ہی سے نکلی ہے
جس سے جتنا مطلب اتنی یاری ہے
سب کہتے ہیں یہی تو دنیاداری ہے
تمھیں دماغ نے سر پر بٹھا دیا ورنہ
ہمارا دل تو کسی اور کا ہی طالب ہے
جسموں کے درمیان تو دوری قبول ہے
لیکن دلوں کے بیچ کبھی فاصلہ نہ ہو

یاد — ایک

یادوں میں موجود/ تمھارے حصے کو ہی/ یاد رکھنا چاہتا ہوں/ میں/ وہی تو/ زندہ ہے/ اب تک/ مجھ میں/ اور مجھے/ یاد ہونے سے بچاتا ہے

راستہ تو ہوتا ہے

ہوسکتا ہے/ دکھائی نہیں دے/ آنکھوں کے آگے/ پردہ، دھند یا اندھیرا آنے سے/ ہوسکتا ہے/ ذرا دیر کو/ گم ہوجائے/ کسی غبار یا کوہرے میں/ ہوسکتا ہے/ بنا پڑ جائے/ خود کو/ مگر/ اتنا طے ہے/ کہ راستہ تو ہوتا ہے

ایک ساتھ

لکھنے بیٹھا/ تو لکھتا ہی چلا گیا/ پڑھنے کی طرف/ گیا ہی نہیں/ دھیان/ پڑھنے بیٹھا/ تو پڑھتا ہی رہا/ جانے کیا کیا کچھ/ بھول گیا لکھنا/ کتنا مشکل ہوتا ہے/ لکھتے ہوئے پڑھنا/ پڑھتے ہوئے لکھنا

منظر منظر زندگی (شاعری)

شاعر: شارق عدیل
صفحات: 248، قیمت: ندارد
مطبع: مسکان پرنٹرس علی گڑھ
مبصر: آفاق عالم صدیقی، زبیدہ ڈگری کالج، جے نگر، شکاری پور شیموگا-577427 (کرناٹک)

شارق عدیل آج کے باکمال شعرا میں سے ایک ہیں جنھیں فن شاعری کی باریکیوں اور نزاکتوں کا خوب خوب علم ہے۔ اسی لیے وہ تخلیقی سطح پر نت نئے تجربے کرنے سے کبھی نہیں گھبراتے ہیں۔

'منظر منظر زندگی' شارق عدیل کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے 'فصیل' کے نام سے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ مجموعہ کلام بھی فصیل ہی کی طرز کا مجموعہ کلام ہے۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر باب کا انتساب الگ الگ شخصیات کے نام ہے۔ ویسے کتاب کے آٹھ ابواب پر مشتمل ہونے سے بعض لوگوں کو گمان ہوسکتا ہے کہ شاید یہ کوئی تحقیقی کتاب ہوگی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ خالص نظموں کا مجموعہ ہے اور اس کتاب کو نظموں کی ہیئت کے اعتبار سے مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کو 'خماسی' کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس باب میں شامل ساری نظمیں پانچ مصرعی ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ شارق عدیل نے ہر باب کا آغاز حمد و نعت سے کیا ہے۔

دوسرا باب پابند نظموں پر مشتمل ہے۔ اس باب کا آغاز بھی حمد و نعت سے ہوا ہے۔ نعت ملاحظہ فرمایئے تاکہ شاعری کے ذائقے کا اندازہ لگانے میں دقت نہ ہو۔

کیا سوغاتیں ہیں/ صبح فروزاں سی روشن
آپ کی باتیں ہیں/ آؤ ہم اک کام کریں
ذکر نبیؐ میں نام کریں

تیسرا باب 'معریٰ نظموں' کے لیے مختص ہے، اس باب میں شامل نظمیں واقعیت سے بھرپور ہیں۔ زندگی کے چہرے کی بعض شکنوں کو اس باب کی نظمیں روشن کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

چوتھا باب آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ اس باب کی بیشتر نظمیں شعریت کی بہ نسبت نثریت سے زیادہ قریب ہیں۔ نثریت آمیز یہ نظمیں اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے قاری کا دامن دل تھامنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

آزاد نظموں کی تعداد بقیہ نظموں سے زیادہ ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ شارق عدیل کو بھی اظہار خیال کے لیے آزادی زیادہ پسند ہے۔

پانچواں باب نثری نظموں کے لیے مختص ہے۔ نثری نظموں کے لیے جو یہ کہا جاتا ہے کہ خیال بہت انوکھا اور چونکا دینے والا ہونا چاہیے تو اس کسوٹی پر اس باب کی نظمیں کم کم ہی کھری اترتی ہیں۔ مگر حقائق کو پیش کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتی ہیں۔ نثری نظموں کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے۔

چھٹا باب تضمینی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان دنوں تضمینی نظموں پر لوگ زیادہ توجہ کرنے لگے ہیں۔ شارق عدیل نے تضمینی نظموں کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں اور کلاسک اور نو کلاسک شعرا کی بہ نسبت عمومی شعرا کے اشعار پر تضمینی نظمیں لکھ کر انہیں توجہ کا مرکز بنانے کی اچھی کوششیں کی ہیں۔

ساتواں باب سہ مصرعی نظموں کے لیے مختص ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض لوگ شاعری میں نت نئے تجربوں کو اپنا وطیرہ سمجھتے ہیں، شارق عدیل اس طرح کے شعرا میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ بعض لوگوں نے ایک مصرعی نظموں کے بھی تجربے کیے ہیں۔ اردو شاعری میں جب بھی تجربوں کے حوالے سے گفتگو ہوگی تو اس میں شارق عدیل کا ذکر ضرور کیا جائے گا کیونکہ وہ علم عروض پر دسترس رکھنے والے ایسے شاعر ہیں جس کی مثال خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

آٹھواں باب 'شارق عدیل کی کتاب 'فصیل' پر اہل فکر و نظر کی رایوں پر مشتمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کو کتاب کے آٹھویں باب کے طور پر پیش کر کے شارق عدیل نے اہل الرائے حضرات کی رائے کو ایک مقام عطا کر دیا ہے۔ جو بہت اہم بات ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی قابل مطالعہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی نظموں کی خوبیوں اور ان کی فنی باریکیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شارق عدیل کو نظم و نثر دونوں سے دلچسپی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں نثر کی تاثیر اور نثر میں شعریت کی لطافت کا پایا جانا حیرت انگیز نہیں ہے۔ امید ہے کہ ان کی اس کتاب کی بھی ادبی دنیا پذیرائی کرے گی۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

ڈاکٹر شمس اقبال نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا چارج سنبھالا

رخصت پذیر ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ نے انھیں چارج سونپتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار کیا

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے ڈائرکٹر کے طور پر آج ڈاکٹر شمس اقبال نے چارج سنبھال لیا۔ اس موقعے پر ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں رخصت پذیر ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ نے ڈاکٹر شمس اقبال کو چارج سونپتے

ہوئے گلدستہ پیش کر کے ان کا استقبال کیا اور اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ کونسل کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے میرے سات آٹھ مہینے بہت یادگار تھے، نئے ڈائرکٹر کے طور پر ڈاکٹر شمس اقبال کا میں تہہ دل سے استقبال کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ کونسل جیسے اردو کے مرکزی ادارے کے لیے شمس اقبال صاحب سے بہتر انتخاب نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ برسوں سے حکومتِ ہند کے اہم ترین ادارے این بی ٹی میں ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں اور اس عرصے میں انھوں نے اردو زبان کے فروغ اور اردو کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی سربراہی میں کونسل ترقیات کی نئی منزلیں طے کرے گی۔

ڈاکٹر شمس اقبال نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں حکومتِ ہند اور وزارتِ تعلیم کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے قومی اردو کونسل جیسے اردو کے اہم ادارے کی ذمے داری مجھے سونپی۔ انھوں نے کہا کہ کونسل محض ایک ادارہ نہیں ہے، بلکہ قومی سطح پر شرحِ خواندگی کو بڑھانے اور کتاب کلچر کے فروغ میں کونسل کا اہم کردار ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری کوشش ہوگی کہ کونسل کی باوقار شناخت کو مزید مستحکم کیا جائے اور اس کے ذریعے چلائی جارہی فروغِ اردو کی اسکیموں کو دور دراز تک پہنچایا جائے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر شمس اقبال اس سے قبل این بی ٹی میں ایڈیٹر رہ چکے ہیں، قومی اردو کونسل میں بحیثیت پرنسپل پبلیکیشن آفیسر بھی اپنی ذمہ داریاں نبھا چکے ہیں اور طویل انتظامی تجربات رکھتے ہیں۔

اس موقعے پر کونسل کا تمام اسٹاف موجود رہا اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب محمد احمد کے اظہارِ تشکر کے ساتھ استقبالیہ تقریب کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 مارچ 2024

نئے مسودات کی اشاعت کے حوالے سے میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں آج ایک میٹنگ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں کونسل کو موصول ہونے والے مختلف مسودات/ تراجم کی اشاعت کے سلسلے میں غور وخوض کیا گیا اور میٹنگ میں شریک ماہرین کی رائے لے کر اس حوالے سے حتمی فیصلے کیے گئے۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کی اور کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر

انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل ایک معیاری ادارہ ہے، اس لیے ہمیں یہاں سے معیاری کتابیں ہی شائع کرنی چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت کئی ایسے اہم موضوعات ہیں، جن پر اردو میں بہت کم مواد دستیاب ہے، اس لیے ادب کی اشاعت کے علاوہ ہمیں اس پہلو پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل سے عصری موضوعات پر دوسری زبانوں میں شائع شدہ اہم کتابوں کے اردو تراجم کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔ میٹنگ کی چیئر پرسن پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کونسل کے نومنتخب ڈائرکٹر کو مبارکباد پیش کی اور کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں نئے موضوعات، خصوصاً سائنس، ماحولیات اور لائف سائنس کے دوسرے گوشوں پر آسان زبان میں کتابیں مہیا کروانا ضروری ہے، تاکہ نئی نسل ان سے بخوبی استفادہ کرسکے۔

میٹنگ کے دیگر ممبران میں پروفیسر عارفہ بشریٰ (ڈین اسکول آف آرٹس وصدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر سید مشیر عالم (سکریٹری اوڈیشا اردو اکیڈمی) اور جناب پی وی سوریہ نارائن مورتی (مہک حیدرآبادی، ڈپٹی نیوز ایڈیٹر روزنامہ آندھرا جیوتی) آن لائن شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ) اور جاوید عالم (ٹیکنکل اسسٹنٹ) بھی موجود رہے۔ افروز عالم نے تکنیکی سپورٹ فراہم کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 مارچ 2023

بھارتیہ نیائے سنہتا 2023 کے تئیں بیداری پیدا کرنے کے لیے قومی اردو کونسل میں پروفیسر نزہت پروین کا لیکچر

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں بھارتیہ نیائے سنہتا 2023 کے تعلق سے واقفیت اور بیداری پیدا کرنے کے مقصد سے ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس اہم موضوع پر لیکچر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی فیکلٹی آف لا کی

سابق ڈین پروفیسر نزہت پروین نے دیا۔ اپنے لیکچر میں انھوں نے بھارتیہ نیائے سنہتا 2023 کے تینوں پہلوؤں، بھارتیہ نیائے سنہتا 2023، بھارتیہ ناگرک سرکشا سنہتا 2023 اور بھارتیہ ساکشیہ سنہتا 2023 پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ ان سے واقفیت تمام شہریوں کے لیے ضروری ہے، اس لیے کہ بھارتیہ نیائے سنہتا 2023 میں جرم وسزا سے متعلق بہت سے قوانین سرے سے تبدیل ہوگئے ہیں، ان کی دفعات میں بھی ترمیم ہوئی ہے اور ان کی تعریف وتوضیح بھی نئے سرے سے کی گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ تبدیلیاں اس لیے کی گئی ہیں کہ انڈین پینل کوڈ 1860 میں عمل میں آیا تھا اور تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانا تھا، اس کے بعد حالات بھی بہت بدل گئے ہیں، جرائم کی نوعیت اور طریقے بھی نئے نئے سامنے آرہے ہیں، اسی طرح پرانے کریمنل لا میں بہت سی دفعات ایسی بھی تھیں، جن پر عمل نہیں ہورہا تھا، اس لیے انھیں سرے سے ختم کردیا گیا ہے۔ انڈین پینل کوڈ کا نام اب بھارتیہ نیائے سنہتا 2023، کریمنل پروسیجر کوڈ کا نام بھارتیہ ناگرک سرکشا سنہتا 2023 اور انڈین ایویڈنس کا نام بھارتیہ ساکشیہ سنہتا 2023 ہوگا، پہلے انڈین پینل کوڈ کی کل دفعات 511 تھیں، جن کی تعداد حذف وترمیم کے بعد اب 356 ہوگئی ہے۔

پروفیسر پروین نے کہا کہ پچھلے کریمنل لا میں بہت ساری سزائیں ایسی تھیں، جو اب نہیں دی جاتیں، نئے قانون میں انھیں حذف کردیا گیا ہے، اسی طرح اس میں جرم کی سنگینی کے اعتبار سے سزاؤں میں بدلاؤ کیا گیا ہے۔ کچھ بڑی قانونی تبدیلیوں کے بارے میں باخبر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اب تک عمر قید کی مدت چودہ سال تھی، مگر نئے قانون کے تحت اس کی مدت پوری زندگی ہوگی۔ بھارتیہ نیائے سنہتا 2023 میں بچوں سے متعلق جرائم پر بھی خصوصی قوانین بنائے گئے ہیں، ماب لنچنگ، منظم جرائم، قومی سلامتی، خودکشی کی کوشش اور چوری کی مختلف قسموں سے متعلق بھی نئے قوانین بنائے گئے ہیں۔ پروفیسر نزہت پروین نے کہا کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور جمہوریتوں میں حالات کے تقاضوں کے مطابق قوانین میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، تعزیرات ہند سے متعلق قوانین میں یہ تبدیلی دراصل ایک ترقی پسندانہ بدلاؤ ہے، جسے ہم سب کو قبول کرنا چاہیے، ابھی یہ اپنی ابتدائی شکل میں ہے، اس لیے کچھ کمیاں بھی ہوں گی، جنھیں آئندہ مزید غور وخوض کے بعد یقیناً درست کیا جائے گا۔ لیکچر کے اختتام پر سوال جواب کا سلسلہ بھی رہا۔ آخر میں محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمک) نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کے علاوہ جناب محمد احمد (اسسٹنٹ ڈائرکٹر ایڈمن)، ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، جناب شاہنواز محمد خرم (ریسرچ آفیسر) اور کونسل کے تمام اسٹاف موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 مارچ 2024

اردو کتابوں کی اشاعت وفروخت کے ممکنہ طریقوں پر غور وخوض کے لیے جامعات کے شعبہ ہائے اردو کے صدور کی اہم میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں اردو کتابوں کی اشاعت وفروخت کی صورت حال کو بہتر کرنے اور اس حوالے سے نئے امکانات پر غور وخوض کے لیے

ایک اہم میٹنگ کا انعقاد کیا گیا، جس میں ہندوستان بھر سے مرکزی وریاستی جامعات کے شعبہ ہائے اردو کے صدور نے شرکت کی اور انھوں نے اپنی قیمتی رائیں اور تجاویز پیش کیں۔ اس میٹنگ کی صدارت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، شعبۂ اردو کے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اس میٹنگ کی غرض وغایت بیان کی اور کہا کہ قومی اردو کونسل سے ادب کے علاوہ تاریخ، سماجیات، سائنس، طب وغیرہ پر اب تک 1433 کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں عام دلچسپی کے علاوہ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کی حیثیت حوالہ جاتی اور نصابی کتب کی ہے، جن کی ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کو ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ آج کی میٹنگ کا مقصد یہ ہے کہ ان کتابوں کو اردو اساتذہ، اسکالرز اور باذوق قارئین تک پہنچانے کے ممکنہ طریقوں پر غور کیا جائے اور ان کی فروخت کے نئے امکانات تلاش کیے جائیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ مجھے امید ہے کہ جامعات کے اساتذہ اس حوالے سے ہمارا خصوصی تعاون کریں گے۔ انھوں نے بتایا کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے مختلف سطح کے تعلیمی اداروں، تنظیموں اور قارئین کے ساتھ اس طرح کی میٹنگ آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔

اس میٹنگ کے شرکا ومقررین کا متفقہ خیال تھا کہ جدید ٹکنالوجی کے دور میں بھلے ہی ایک بڑا طبقہ آن لائن فارمیٹ میں کتابوں کے مطالعے کی طرف منتقل ہوا ہے، مگر مطبوعہ کتابوں کی اہمیت اب بھی برقرار ہے اور قومی اردو کونسل سے مختلف موضوعات پر ایسی کتابیں شائع ہوتی ہیں، جو اساتذہ اور اسکالرز دونوں کے لیے نہایت مفید ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ نئی کتابوں کی اشاعت تبھی ممکن ہے، جب پہلے سے چھپی ہوئی کتابوں کی نکاسی ہو اور اس میں اردو اساتذہ وطلبہ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ شرکا نے کہا کہ اردو کتابوں کی اشاعت اور خریداری کو بڑھانے کے لیے یونیورسٹی کے ریسرچ سکالرز کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے تعلیمی وظائف کا ایک حصہ کتابوں کے لیے ضرور مختص کریں۔ چوں کہ نئی نسل کا ایک بڑا طبقہ ٹکنالوجی سے مربوط ہے، اس لیے یہ رائے بھی سامنے آئی کہ کتابوں کے ڈیجیٹائزیشن پر توجہ دی جائے اور مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ان کی سافٹ کاپی کی فروخت کے لیے بھی ایک میکانزم تیار کیا جائے، اسی طرح قارئین تک پہنچنے کے لیے جدید تکنیکی ذرائع مثلاً سوشل میڈیا کا بھی سہارا لیا جائے۔ مقررین نے اس پر بھی زور دیا کہ کتاب کلچر کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ کلاس روم لیکچرز میں طلبہ کو مطالعے کی طرف راغب کیا جائے اور نصابی کتابوں کو عصری انداز میں شائع کیا جائے۔ شرکا نے اس بات پر بھی زور دیا کہ طلبہ کے ساتھ اساتذہ کے درمیان بھی کتابیں خریدنے کا عام رجحان فروغ پانا چاہیے، تاکہ طلبہ ان سے تحریک لیں۔ میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے تمام جامعات کے شعبہ ہائے اردو کو اس تعلق سے ایک خط بھیجا جائے جس پر شعبوں کے صدر اپنے رفقا اور اسکالرز کے ساتھ تبادلۂ خیال کر کے لائحہ عمل بنائیں گے۔

میٹنگ کے صدر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنی صدارتی گفتگو میں کہا کہ تمام شرکا ومقررین کی تجاویز اور مشورے اہمیت کے حامل تھے، اب ان پر عملی اقدامات کیے جانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی یہ میٹنگ لوگوں میں کتابوں سے قربت ودلچسپی پیدا کرنے کی تحریک کا آغاز ہے، امید ہے کہ آپ حضرات کے تعاون سے یہ تحریک کامیابی سے بھی ہم کنار ہوگی۔ انھوں نے اس کامیاب میٹنگ کے انعقاد کے لیے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، کونسل کے شعبہ خرید وفروخت کے انچارج جناب اجمل سعید اور متعلقہ اسٹاف کو مبارکباد پیش کی۔ میٹنگ کے شرکا واظہار خیال کرنے والوں میں پروفیسر احمد محفوظ (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، پروفیسر نجمہ رحمانی (دہلی یونیورسٹی، دہلی)، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، پروفیسر عارفہ بشریٰ (کشمیر یونیورسٹی)، پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد)، پروفیسر شبنم حمید (الہ آباد یونیورسٹی)، پروفیسر شائستہ انجم نوری (پاٹلی پترا یونیورسٹی)، پروفیسر رضوان علی (رانچی یونیورسٹی)، پروفیسر سورج دیوسنگھ (پٹنہ یونیورسٹی)، پروفیسر اسلم جمشید پوری (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)، پروفیسر سید فضل اللہ مکرم (سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد)، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز (ممبئی یونیورسٹی)، ڈاکٹر جاوید رحمانی (آسام یونیورسٹی، سلچر)، ڈاکٹر زرنگار یاسمین (مولانا مظہرالحق عربی فارسی یونیورسٹی، پٹنہ)، ڈاکٹر شاہد رزمی (مونگیر یونیورسٹی، بہار) اور ڈاکٹر خان محمد آصف (گوتم بدھ یونیورسٹی، نوئیڈا) شامل تھے۔

محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک) کے اظہار تشکر کے ساتھ میٹنگ کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 مارچ 2024

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی حیات وخدمات

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'جشن ادب 2022' میں ممتاز نقاد، دانشور، محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ کی حیات و خدمات پر یک روزہ قومی سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں مہمانِ خصوصی گلزار نے پروفیسر نارنگ کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب بھی یقین نہیں ہو رہا ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ اردو کی ہر محفل میں ہماری آنکھیں ان کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔ انھوں نے پروفیسر نارنگ پر لکھی اپنی پورٹریٹ بھی سامعین کے سامنے پیش کی۔ پروگرام کے آغاز میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی، ساتھ ہی انھوں نے پروفیسر نارنگ سے اپنے ذاتی تعلقات کے بارے میں کہا کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں اس میں پروفیسر نارنگ کا بہت اہم رول ہے۔ پروگرام میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اہلیہ منورما نارنگ نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ مہمانِ اعزازی پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ پروفیسر نارنگ صرف اردو ہی نہیں، ہندوستان کی ہر زبان کے ادیبوں کے درمیان مقبول تھے۔ نظام صدیقی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں جب پروفیسر نارنگ سے مصافحہ کرتا تو محسوس ہوتا کہ ہندوستان کی روح سے مصافحہ کر رہا ہوں۔

اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے صدر مادھو کوشک نے کہا کہ جب کوئی ادیب 'اسکول آف تھاٹ' بن جائے تو وہ ایک ادارہ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ پروفیسر نارنگ کی حیثیت ہندوستانی ادب میں ایک ادارے کی ہے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد پہلے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ پروفیسر نارنگ نے فکشن تنقید پر جو کام کیا ہے، اس کا اثر تادیر قائم رہے گا۔ اس سیشن میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے مقالے میں کہا کہ 'ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات' پروفیسر نارنگ کی سب سے اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے بعد ہی ایک نظریہ ساز کی حیثیت سے ان کی شخصیت سامنے آتی ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر احمد صغیر نے پروفیسر نارنگ کی فکشن تنقید کے حوالے سے اپنے مقالے پیش کیے جب کہ ڈاکٹر دانش الہ آبادی نے پروفیسر نارنگ کی شخصیت پر بھرپور مقالہ پڑھا۔ دوسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت شین کاف نظام نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر اسد رضا، ڈاکٹر شاہینہ تبسم اور پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ آخری اجلاس کی صدارت شمیم طارق نے کی اور اس اجلاس میں حقانی القاسمی، ف س اعجاز، ڈاکٹر قاسم خورشید اور پروفیسر محمد زماں آزردہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام میں کافی تعداد میں شرکا کی موجودگی رہی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 مارچ 2024

دھلی

محفل افسانہ

نئی دھلی: سخن سرائے ادبی فورم کے زیر اہتمام یوم خواتین کے موقعے پر غالب اکادمی، نظام الدین، نئی دہلی میں محفل افسانہ منعقد کی گئی جس میں اردو اور ہندی کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے پڑھے، مہمان خصوصی کے طور پر عصر حاضر کی معروف شاعرہ و افسانہ نگار محترمہ رینو حسین شامل ہوئیں، مہمان ذی وقار کے طور پر شعبہ ہندی، آرٹس فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر الپنا مشرا، سینئر صحافی ہما رضوی، شعبۂ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج سے پروفیسر شاہینہ تبسم، آجکل رسالہ سے محترمہ نرگس سلطانہ، بندھتو وا فاؤنڈیشن سے نریندر کمار پانڈے شامل رہے۔ پروفیسر الپنا مشرا نے ایک کہانی 'نیڑ' کے عنوان سے پڑھی اور کہا کہ اردو اور ہندی میرے نزدیک ایک ہی ہیں بس رسم الخط الگ الگ ہے، منتظمین کے طور پر ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا صاحبہ اور ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کا نام بہت اہم ہے ڈاکٹر رخشندہ روحی نے سخن سرائے ادبی فورم کیسے وجود میں آیا۔ اس کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور مدیرہ بیسویں صدی شمع افروز زیدی نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ اس محفل میں شمع افروز زیدی، خورشید حیات، ترنم جہاں شبنم، ڈاکٹر پرویز شہریار، ڈاکٹر ذاکر فیضی، سعدیہ رحمٰن، ڈاکٹر سفینہ بیگم، اسد رضا، سہیل انجم، نشاں زیدی وغیرہ نے افسانہ خوانی کی، زیادہ تر افسانے خواتین کے مسائل پر پڑھے گئے، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ذبیح اللہ نے نظامت کی۔ ڈاکٹر حدیثہ افضل، مدھو نے یوم خواتین کیوں منایا جاتا ہے اس پر اپنی بات رکھی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 مارچ 2024

داستان میر

نئی دھلی: بزم جامعہ، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے دیرینہ روایت کے مطابق مختلف ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کیا۔ اس مرتبہ بزم جامعہ نے ثقافتی پروگراموں کو یادگار بنانے کے لیے شہرت یافتہ فنکار جناب محمود فاروقی

کی خدمات حاصل کیں۔ جناب محمود فاروقی نے طلبا کی خواہش کو شرف قبولیت بخشا اور جناب دارین شاہدی کے علاوہ 'داستان کلیکٹیو' کی پوری ٹیم کے ساتھ تشریف لائے۔ داستان میر، خدائے سخن میر تقی میر کی زندگی کے محض نشیب وفراز کی کہانی نہیں بلکہ شہر دہلی کے علاوہ مختلف تہذیبی مراکز اور ان کے امرا و روسا کی تباہی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی شکستگی کا مرثیہ بھی ہے۔ یہ اس مشترکہ ہندوستانی ثقافت کی داستان ہے، جو کبھی حقیقت تھی، آج زمانہ اس کے خواب دیکھتا ہے، جو آج تعبیر کے انتظار میں ہے۔ محمود فاروقی اور دارین شاہدی نے اس داستان کو محض سنایا نہیں بلکہ داستان کی شعریات کو بخوبی نبھایا۔ بزم جامعہ، شعبۂ اردو کی جانب سے منعقد داستان گوئی کی یہ بزم ایک کارنامہ تھی جسے شرکا نے خوب سراہا۔ پروفیسر زویا حسن نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کئی بڑی جگہوں پر داستان سنی، لیکن جو لطف یہاں آیا وہ کہیں اور نہیں۔ طلبا کی شمولیت نے داستان گویوں اور سامعین کو یک جان کر دیا، داستان سننے کا یہ تجربہ نہایت انوکھا معلوم ہوا۔ جناب روی کانت نے محمود فاروقی اور دارین شاہدی کی داستان گوئی کی ستائش کی اور کہا کہ جامعہ میں ان کا مظاہرہ بہترین تھا، جس کا سبب موضوع، داستان گویوں اور سامعین کا سحر انگیز تفاعل ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد محفوظ نے داستان گویوں اور ان کی پوری ٹیم کے علاوہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ داستان گوئی کے انعقاد کے لیے طلبا کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں صدر شعبہ، پروفیسر احمد محفوظ اور بزم جامعہ کے ایڈوائزر ڈاکٹر شاہ عالم کا کردار خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ اس یادگار موقعے پر ملک کی کئی معزز اور نامور ہستیوں کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ وطالبات اور بہت سی باوقار ہستیاں بھی موجود تھیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 9 مارچ 2024

اردو میں حاشیائی ادب

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی اور اردو اکادمی کے اشتراک سے آرٹس فیکلٹی کے کمرہ نمبر 22 میں یک روزہ قومی سمینار 'اردو میں حاشیائی ادب' کا انعقاد عمل میں آیا۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر الہدی فریدی نے کی۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر نجمہ رحمانی نے مہمانوں اور شعبۂ اردو کے علاوہ دیگر شعبے کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات کا استقبال کرتے ہوئے حاشیائی ادب کے بارے میں کہا کہ اس سمینار سے جہاں ذہن کے جالے صاف ہوں گے وہیں نئے جالے بھی بنے جائیں گے۔ کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ 'حاشیہ' عزت دار نوکر کو کہتے ہیں اور یہ لفظ ایک زمانے میں جتنا باوقار تھا آج اتنا ہی بدنام ہے۔

مہمان خصوصی پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ حاشیائی ادب کی اہم ترین مثال راہی معصوم رضا کا ناول 'آدھا گاؤں' ہے۔ جو اردو میں چھپ نہیں سکا بلکہ ہندی میں شائع ہوا اس سے بڑی حاشیائی ادب کی مثال کیا ہوسکتی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر قمر الہدی فریدی نے کہا کہ حاشیائی ادب پر زیادہ کام نہیں ہوا ہے لیکن جتنا ہوا ہے اس کی ہمیں قدر کرنی چاہیے، جب لفظ تجربہ احساسات وجذبات میں ڈھل جاتے ہیں تو وہ ہر زمانے کا انمول رتن بن جاتے ہیں۔ مہمان اعزازی پروفیسر ابیتابھ چکرورتی نے حاشیائی ادب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ آئیڈیا نیا نہیں ہے بلکہ پرانا ہے لیکن اسے نئے زاویے سے دیکھا اور پرکھا جارہا ہے تاکہ نئی جہت متعارف ہوسکے۔ سمینار کی نظامت کرتے ہوئے پروفیسر ابوبکر عبادنے کہا کہ حاشیے کے لیے مرکز کا ہونا ضروری ہے، حاشیہ اور مرکز کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

پہلے اجلاس میں اظہار تشکر کرتے ہوئے پروفیسر ارشاد نیازی نے کہا کہ حاشیے سے جو لوگ مرکز میں آتے ہیں اس میں ان کے علم کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر سراج اجملی نے کی، اور اس میں کل چھ مقالات پیش کیے گئے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس اجلاس میں جتنے مقالات پڑھے گئے سب عمدہ تھے۔ اس اجلاس کی نظامت شعبۂ اردو کی ریسرچ اسکالر دبیر سیدہ نے کی۔ اس اجلاس میں نورین علی حق، عارف اشتیاق، عمیر منظر، سنجے کمار، شہناز رحمٰن اور سفینہ بیگم نے مقالات پڑھے۔ تیسرے اجلاس میں صدارت کے فرائض پروفیسر مظہر احمد نے انجام دیے اور انھوں نے کہا کہ سب کے مقالات بہت عمدہ تھے لیکن جامعیت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں متن کے علاوہ حاشیے کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ تیسرے اجلاس میں اعجاز احمد، ذبیح اللہ، فیصل، زاہد ندیم احسن، شاذیہ عمیر اور راکیش کمار نے مقالات پڑھے۔ اس اجلاس کی نظامت شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 مارچ 2024

امیر خسرو اور میرزا بیدل: فارسی شعری روایات کی روشنی میں

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اکیسواں 'پروفیسر ہادی حسن' یادگاری خطبہ منعقد ہوا جس کا موضوع 'امیر خسرو اور میرزا بیدل: فارسی شعری روایات کی روشنی میں' تھا۔ خطبہ کے مقرر خاص پروفیسر اخلاق احمد آہن صدر شعبہ فارسی جواہر لعل نہرو یونیوسٹی تھے جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اقتدار محمد خان ڈین فیکلٹی علوم انسانی ولسانیات جامعہ ملیہ نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض پروفیسر سید کلیم اصغر صدر شعبہ فارسی نے انجام دیے۔ پروفیسر آہن نے امیر خسرو اور میرزا بیدل کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ دونوں فارسی روایات میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور خسرو اور سعدی وحافظ کے بیچ کی کڑی ہیں تو بیدل نے کلاسیکی روایات کو بلندی پر پہنچایا۔ امیر خسرو نے شاہانہ زندگی گزاری اور تقریباً ستر سال شاہی درباروں سے وابستہ رہے جب کہ بیدل نے درباری زندگی کو ناپسند کیا اور درویشانہ زندگی کو ترجیح دی۔ البتہ

دونوں شاعروں کی زندگی اور کلام میں صوفیانہ فلسفہ پایا جاتا ہے۔ بیدل کی مجلس خداشناسی میں علما وصوفیا شرکت کرتے اور تمام علوم پر بحث ومباحثہ ہوتا تھا۔ امیر خسرو کا کلام مختلف نسلوں اور پیشہ کے لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ صدر مجلس پروفیسر سید کلیم اصغر نے کہا کہ خسرو اور بیدل ایسے غیر ایرانی شاعر ہیں، جن کی عظمت و بلندی کا اعتراف ایرانیوں نے کیا ہے۔ خمسہ نظامی کی پیروی میں بہت سے شعرا نے خمسے لکھے مگر خسرو کا خمسہ سب سے کامیاب تصور کیا جاتا ہے۔ بیدل کی فکر و شخصیت کو سمجھنے کے لیے بندرابن داس خوشگو کو پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ مہمان خصوصی نے پروگرام کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ارشد القادری نے کی جب کہ مہمانوں کا تعارف ڈاکٹر زہرہ خاتون نے کرایا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 مارچ 2024

شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر

نئی دهلی: آج مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات، جے این یو کی طرف سے اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز کے کمیٹی روم میں سالانہ دسواں شاہ ولی اللہ لیکچر بعنوان 'روہیل کھنڈ: روایات اور تہذیب کا سنگم' کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں مہمان خصوصی کے طور پر صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر حسنین اختر شریک ہوئے، جب کہ صدارت مرکز برائے ہندوستانی زبان، جے این یو کے صدر پروفیسر ڈاکٹر انور پاشا نے کی، مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور اس سالانہ لیکچر کی اہمیت کو اجاگر کیا، پھر مہمان خصوصی کا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد مہمان خصوصی شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر حسنین اختر نے 'روہیل کھنڈ: روایات اور تہذیب کا سنگم' پر ایک نہایت عمدہ اور جامع خطاب پیش کیا ہے، جس میں انھوں نے روہیل کھنڈ اور اطراف کے علاقے کی علمی، ادبی اور تہذیبی اہمیت کو اجاگر کیا، انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس سرزمین نے ہزاروں صوفیا اور ادبا پیدا کیے ہیں۔ پروگرام کے صدر پروفیسر انور پاشا نے اپنے صدارتی کلمات میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں صوفیا، تصوف اور اردو ادب کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اخیر میں مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے سابق صدر پروفیسر رضوان الرحمٰن نے تمام مہمانان کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا، انھوں نے کہا کہ دس سال سے اس میموریل لیکچر کا انعقاد عمل میں آرہا ہے، لیکن آج کا پروگرام اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت مختلف تھا اور وقت اور حالات کے پیش نظر بہت ضروری بھی۔ اس پروگرام میں جے این یو کے علاوہ دیگر جامعات کے اساتذہ وطلبہ بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 مارچ 2024

میر کے سہ صد سالہ یوم پیدائش پر قومی سیمینار

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام میر تقی میر کے سہ صد سالہ یوم پیدائش کے موقعے پر دوروزہ قومی سیمینار کا

انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح مہمانوں کے ہاتھوں شمع افروزی سے ہوا۔ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سرینواس راؤ نے سبھی مندوبین و شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ہر زبان کا اپنا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے۔ اردو کا مقام ادبی دنیا میں ہمیشہ سے خاص رہا ہے۔ انھوں نے محفل میں موجود فلمی نغمہ نگار گلزار کو حال ہی میں گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر مبارکباد دی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت اکادمی کے صدر مادھو کوشک نے کی۔ انھوں نے کہا کہ آج عام ہندوستانی جس طرح سوچتا ہے یا یوں کہیں کہ ہم جس گنگا جمنی تہذیب کی بات کرتے ہیں وہ میر کی شاعری سے آئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آج ہندی شاعری میں جو بھی لکھا جارہا ہے وہ میر کی دین ہے۔ فلمی نغمہ نگار گلزار نے بحیثیت مہمان اعزازی شرکت کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا چسکا انھیں ایسے پروگراموں میں کھینچ لاتا ہے۔ میر کی خصوصیت اور لب و لہجے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میر عام زندگی کی حقیقت کو سامنے رکھ کر شعر کہتے تھے۔ دوسرے مہمان اعزازی سید شاہد مہدی نے کہا کہ میر کے کلام میں ان کی شخصیت جھلکتی ہے۔ میر کو اگر قبول کریں تو مکمل طور پر کریں۔ ان کی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ کریں۔ اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر سید احتشام حسنین نے میر کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مشہور انگریزی کتاب 'دی ہڈن گارڈن' کا حوالہ دیا اور کہا کہ میر کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت ضروری ہے۔ انھوں نے میر کے چند شعر پیش کرکے ان کی شاعری کے پوشیدہ نکات پر روشنی ڈالی۔ اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر ممتاز شاعر چندربھان خیال نے ابتدائی کلمات پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ میر تقی میر نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اصل میدان غزل ہے۔ کلیدی خطبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر احمد محفوظ نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ میر کی عظمت کا اعتراف غالب اور ان کے معاصرین نے بھی کیا ہے۔ سیمینار کے پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر شافع قدوائی نے کی جس میں ڈاکٹر ثروت خاں، حقانی القاسمی اور پروفیسر کوثر مظہری نے مقالے پیش کیے۔ آج کے دوسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت شین کاف نظام نے کی جس میں لیلا دھر منڈلوئی اور ڈاکٹر جانکی پرساد شرما نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار میں سامعین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

سیمینار کے آخری دن چار اجلاس منعقد ہوئے اور ہر اجلاس میں 3-3 مقالے پیش کیے گئے۔ آج کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے 'میر کا تصور عشق' عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ میر کا سب سے پسندیدہ موضوع 'عشق' رہا ہے لیکن انھوں نے اس کا بیان رسمی طور پر نہیں کیا ہے۔ احسن ایوبی نے اپنے مقالے 'میر کی راتیں' میں کہا کہ میر کے یہاں رات اذیتوں کی آماجگاہ ہے، ساتھ ہی استغراق اور مواخذات کا ذریعہ بھی ہے۔ ف س اعجاز نے اپنا مقالہ 'یہ میر ستم کشتہ' کے عنوان سے پیش کیا اور کہا کہ میر کے یہاں اندرونی جذب و تحلیل کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت شریف حسین قاسمی نے کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ میر کا دور ہندوستان میں ادبی تنقید کے آغاز کا دور تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میر قنوطی شاعر نہیں تھے، انھوں نے لطیفے بھی کہے ہیں۔ اس سیشن میں شمیم طارق نے اپنا مقالہ 'میر، میر کلچر اور غالب' کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ میر کو فارسی شاعر ہونے پر فخر تھا مگر وہ اردو شاعر کے

طور پر مشہور ہوئے۔ پروفیسر انتخاب حمید نے اپنے مقالے 'میر کا تصور بیگانگی' میں کہا کہ بیگانگی میر کے تخلیقی وژن و وجدان اوران کے شعری حسن و کمال میں نقطۂ ارتکاز کا حکم رکھتا ہے۔ ڈاکٹر ریشما پروین نے اپنا مقالہ 'تنقید میر کے مختلف ابعاد' کے عنوان سے پیش کیا اور کہا کہ میر تنقید کے سلسلے میں تذکروں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عزیز پریہار نے کی۔ یہ سیشن انگریزی مقالوں پر مخصوص رہا جس میں پروفیسر انیس الرحمٰن، پروفیسر محمد عاصم صدیقی اور ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے مقالے پیش کیے۔ آج کے چوتھے اور سمینار کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد حامد علی خاں نے 'میر کا نثری اختصاص' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ میر نے 'نکات الشعرا'، 'ذکر میر' اور 'فیض میر' یا نثری تمہید 'مثنوی دریائے عشق' کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر میں تحقیقی و تنقیدی بصیرت بدرجہ اتم موجود تھی۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے 'میر کی شاعری میں جنسی تلذذ' پر مقالہ پیش کیا اور کہا کہ میر کی جنسی شاعری کی کائنات بے حد وسیع اور متنوع ہے۔ پروفیسر عباس رضا نیر نے 'کلام میر کی نیرنگی' مقالے میں کہا کہ کلام میر کی نیرنگی اس قدر صدرنگ ہے کہ کسی رنگ کو مس کیا جائے تو اس کی نمی میں کوئی دوسرا رنگ ظاہر ہوجاتا ہے کیونکہ غزل کے ایمائی رنگ نے ان کے کلام کی موضوعاتی دنیا کو کافی وسیع کردیا ہے۔ آخر میں انوپم تیواری نے اظہارِ تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مارچ 2024 و روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 مارچ 2024

اردو افسانہ، فن اور تکنیک

نئی دهلی: بزم ادب شعبۂ اردو ذاکر حسین دہلی کالج مارننگ کی جانب سے ایک خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا، جس میں معروف فکشن نگار ڈاکٹر ذاکر فیضی نے شرکت کی۔ لیکچر کا موضوع اردو افسانہ فن اور تکنیک تھا۔ پروگرام کی ابتدا میں پروفیسر جعفر احراری نے مہمان کو ہدیۂ گل پیش کیا۔ پروگرام کی شروعات اور استقبال بزم ادب کے صدر ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ نے کی اور مہمان مقرر کا مفصل تعارف پیش کیا۔ مہمان مقرر ڈاکٹر ذاکر فیضی نے اردو افسانے کا فن اور تکنیک پر بے حد معلوماتی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ایک اچھی تخلیق کے لیے مطالعہ، مشاہدہ اور تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان تینوں چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک اچھے تخلیق کار کو چاہیے کہ موضوع پر فوکس کرے۔ محنت، جستجو اور ایمانداری کی شرط پر ہی ایک شاہکار تخلیق وجود میں آتی ہے۔ مہمان مقرر نے جوگیندر پال کا 'دو لائن کا افسانچہ' میں تمام عمر اس کا انتظار کرتا رہا اور مرتے وقت مجھے خیال آیا، ارے جانا تو مجھے تھا، پیش کیا۔ انھوں نے طلبہ و طالبات کو کتاب 'صوفی کی دنیا' ایک بار ضرور پڑھنے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر اعلم شمس صدر شعبۂ اردو نے صدارتی خطبہ پیش کیا اور طلبہ و طالبات کو یقین دلایا کہ آگے بھی شعبے کی سرگرمیوں میں 'ادیب سے ملاقات پروگرام اور ورکشاپ' ہم کرواتے رہیں گے۔ آخر میں ڈاکٹر سفینہ نے اظہار تشکر کیا اور کامیاب پروگرام منعقد کرنے کے لیے سبھی کو مبارکباد بھی دی۔ پروگرام میں موجود اساتذہ میں پروفیسر جعفر احراری، ڈاکٹر اعلم شمس، ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ، ڈاکٹر سفینہ بیگم، ڈاکٹر شاہانہ مریم شان، ڈاکٹر ابرار علی شاہ، ڈاکٹر محمد عامر اور طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد شامل تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 مارچ 2024

سجاد ظہیر یادگاری خطبہ

نئی دهلی: ہمارے نقادوں کا ایک بڑا حلقہ فروعی مسائل میں زیادہ الجھا ہوا ہے۔ تنقید میں گہری سنجیدگی، مطالعے کو ایک ڈسپلن کے ساتھ رقم کرنے کا طور، ادب کے بنیادی اور تازہ عاتی مسائل کی اہمیت اور کلاسیک کو ایک نیا نام دینے کی مساعی کا فقدان ہے۔ ہماری تنقید میں اس فلسفیانہ تفکر کی بھی زبردست کمی ہے جس سے معنی کی نئی راہیں وا ہوتی ہیں۔ فلسفیانہ ذہن خالص ادبی ذہن سے زیادہ بصیرت رکھتا ہے اور معنی نہیں، معنی کے جھرمٹ اس پر منکشف ہوتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام بین العلومی تنقید کے موضوع پر سولہویں سجاد ظہیر یادگاری خطبے میں پروفیسر عتیق اللہ نے کیا۔ انھوں نے بین العلومی تنقید کی ناگزیریت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ بین العلومی عمل کے تحت سماجیاتی تصورات اور مشتملات و مواد کا اطلاق اہم ہے۔ ادب کی تفہیم سماجیاتی معنی کے ساتھ مشروط ہے۔ ادب بنیادی طور پر لسانی، ساختی اور جمالیاتی حسیت کی تنظیم کا عمل ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے اس بلیغ اور پرمغز خطبے میں کہا کہ زبان اور ادب اپنی سرشت کے اعتبار سے بین العلومی آمیزہ ہے۔ مختلف علوم و نظریات کو مخلوط اور ہم آمیز کرکے ہی تنقید ایک بہتر کردار ادا کرسکتی ہے۔ چونکہ تخلیقی ادب کا کردار بھی بین العلومی ہوتا ہے، اس لیے محض کوئی ایک نظریہ، محض کوئی ایک تصور، محض کوئی ایک علم، کسی بھی تخلیقی فن پارے کے تقاضوں سے بخیر و خوبی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

شعبۂ تاریخ و ثقافت کے سمینار ہال میں منعقدہ سولہویں سجاد ظہیر یادگاری خطبے کے صدارتی کلمات میں صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ تنقید اور تخلیق کی زبان ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہونی چاہیے۔ تخلیق کی زبان میں ابہام، پیچیدگی اور کثیر معنوی جہات اس کی خوبیاں تسلیم کی جاتی ہیں، جب کہ تنقید میں یہی عناصر خامی تصور کیے جاتے ہیں۔ تنقید کی زبان کا معروضی، صریح اور قطعی ہونا لازمی ہے۔ اس سلسلے میں حالی، کلیم الدین احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کی زبان تنقید میں آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے۔ انھوں نے اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی کہ بین العلومی مطالعے کا انطباق لازمی صورت میں ہر فن پارے پر نہیں کیا جاسکتا۔

سولہویں سجاد ظہیر یادگاری خطبے کے کنوینر پروفیسر کوثر مظہری نے سجاد ظہیر کا مفصل تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ سجاد ظہیر ایک طرف ترقی پسند تحریک کے بانی ہیں تو دوسری طرف کلاسیکی ادب کے باذوق قاری بھی ہیں۔ ان کی انقلابیت، تجربہ پسندی اور تخلیقی ہمہ جہتی انھیں ادبی تاریخ میں ممتاز کرتی ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری نے پروفیسر عتیق اللہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا ادبی سفر نہایت فعال اور متنوع رہا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی عمر کی آٹھویں دہائی کی دہلیز پر بھی نئے سے نئے ادبی رجحانات و میلانات کا گہرا شعور اور آگہی رکھتے ہیں۔

پروگرام کا اختتام پروفیسر شہزاد انجم کے اظہار تشکر سے ہوا۔ اس پروگرام میں اساتذہ کے علاوہ شعبے کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 8 مارچ 2024

ریسرچ اسکالرز سمینار

نئی دهلی: غالب اکیڈمی میں یک روزہ ریسرچ اسکالر سمینار کا انعقاد ہوا جس میں دہلی یونیورسٹی کے اسکالرس نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پہلا مقالہ مصطفیٰ رضا نے عبدالصمد کی ناول نگاری پر پڑھا۔ ناہیدہ شفیع نے اکیسویں صدی کے اہم ناولوں کا بیانیہ، حنبل رضا نے اسداللہ کی انشائیہ نگاری، مہر فاطمہ نے قائم اور غالب ایک بین المتونی ڈسکورس، ہادیہ تبسم نے 1960 کے بعد اردو شاعری میں تانیثیت کی لے، شمائلہ ملک نے 1950 کے بعد اردو خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، اشتیاق احمد مصباح نے گوجری اور اردو کا لسانی رشتہ، ظفر اقبال نے پرتپال سنگھ بیتاب بحیثیت شاعر، ریاض احمد نے غضنفر کا ناول مانجھی ایک تجزیاتی مطالعہ، اعجاز احمد نے حامدی کاشمیری شخصیت وسوانح عنوانات کے تحت پرمغز مقالات پیش کیے۔ سمینار میں ریسرچ اسکالرز نے جدید تخلیق کاروں پر بھی اظہار خیال کیا۔ خاص طور سے زرینہ بانو نے مشرف عالم ذوقی اور میسرہ اختر نے ترنم ریاض کے افسانوں کا خصوصی مطالعہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے مقالہ نگاروں کو مفید مشوروں سے نوازا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شاہینہ تبسم نے سبھی مقالات پر بہت معروضی انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے مقالے کی خوبیوں اور خامیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے مقالہ نگاری کے اصول وضوابط پر بھی گفتگو کی۔ نظامت عزہ معین نے کی جب کہ سمینار کی کنوینر عقیلہ نے اساتذہ اور شرکا کا شکریہ ادا کیا

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 مارچ 2024

شوکت علی فہمی یادگاری لکچر

نئی دهلی: پرانی دہلی کے جامع مسجد علاقے میں دین دنیا پبلشنگ کی جانب سے مفتی شوکت علی فہمی کی یاد میں آج 'ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم' کے عنوان سے لکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ تقریب کی نظامت کے فرائض شیبا اسلم فہمی نے انجام دیے۔ مفتی شوکت علی فہمی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مفتی شوکت علی فہمی کی شخصیت سے آپ سبھی شناسا ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مفتی شوکت علی فہمی کی ولادت 24 دسمبر 1901 کو اتر پردیش کے میرٹھ میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی صحافت کا سفر 1923 سے شروع کیا اور تبھی سے وہ دین دنیا سے جڑے۔ انھیں خواجہ حسن نظامی کی سرپرستی ملی۔ ان کا بہت لمبا صحافت کا سفر رہا، وہ 1923 سے 1984 تک دین دنیا کے پرنٹر پبلشر رہے اور 1993 میں ان کی وفات ہوگئی۔ انگریزی دور میں بھی مفتی شوکت علی فہمی نے اپنے اخبار کے ذریعے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ انھوں نے انگریزی حکومت کی سختیوں کو بھی برداشت کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ خوش نصیب ہیں مفتی شوکت علی فہمی جو آج ان کی اولاد انھیں یاد کر رہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنھوں نے مفتی شوکت علی فہمی کو دیکھا بھی اور پڑھا بھی ہے وہ مورخ بھی تھے اور مفسر بھی تھے، وہ جنگ آزادی کے مجاہد بھی تھے اور صحافی بھی تھے۔ وہ میرٹھ کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جس کا علمی مشغلہ تو تھا ہی بلکہ جدوجہد آزادی میں بھی اس کا ایک شاندار رول رہا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے مولانا محمد قاسم نانوتوی اس ادارے اور خاندان سے براہ راست منسلک تھے اور کہا جاتا ہے کہ 1857 میں جس جنگ آزادی کی شروعات میرٹھ سے ہوئی تھی اس کے محرک مفتی شوکت علی فہمی کے آباو اجداد ہی تھے۔ مسجد فتح پوری کے شاہی امام مولانا ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب میں سماجی، سیاسی اور سرکردہ شخصیات کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علاقہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 مارچ 2024

اترپردیش

فونیٹک اینڈ فونولوجی

میرٹھ: اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج کے شعبۂ اردو میں

ایڈ آن / ویلیو ایڈڈ کورس Phonetics and Phonology کے عنوان سے چل رہے کورس کا اختتام کالج کی پرنسپل پروفیسر انیتا راٹھی کی صدارت میں عمل میں آیا۔ پروگرام کے افتتاح پر شعبہ کی استاد فاکہہ نے مہمانوں کی خدمت میں گلدستے پیش کیے۔ کورس کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر عفت ذکیہ نے پروگرام کی نظامت کے ساتھ مہمانوں کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے ایڈ آن کورس کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے یہ کورس زبان سے متعلق طالبات کی بنیادی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کرایا ہے۔ حروف کی پہچان ان کے فرق اور ان کو بنانے کے طریقے کی جانکاری کے ساتھ ساتھ ان کے صوتیاتی نظام کی جانکاری بھی فراہم کی ہے۔

صدر شعبۂ ہندی ڈاکٹر دیپا تیاگی نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں بہنیں ہیں، دونوں زبانوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہندی میں بھی اردو حروف کے صحیح تلفظ کے لیے حرف کے نیچے نقطہ لگا کر اردو حروف تہجی کی آواز نکالی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ہما مسعود نے کہا کہ اگر زندگی میں کامیاب ہونا ہے تو پہلے خود کو بدلنا ہوگا، خود پر یقین رکھنا ہوگا۔ شعبہ انگریزی کے سربراہ ڈاکٹر سورنا نے طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے اس کورس کے ذریعے بہت کچھ سیکھا ہے تو ہمیں یہ کورس آئندہ بھی کراتے رہنا چاہیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر آصف علی اسسٹنٹ پروفیسر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ نے کہا کہ زبان انسانی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی زبان، بڑی یا چھوٹی نہیں ہوتی۔ ہمارے پاس جتنے زیادہ الفاظ ہیں، بات کے اظہار میں ہم اتنے ہی کامیاب ہیں۔ اس موقعے پر طالبات نے کورس سے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں کالج کی پرنسپل پروفیسر انیتا راٹھی نے کورس سے مستفیض ہونے والی طالبات میں اسناد تقسیم کیں۔ شعبے کی استاد فرح ناز نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 مارچ 2024

غالب کی شاعری کی عصری معنویت

امروهه: جے ایس ہندو پی جی کالج امروہہ کے شعبۂ اردو میں ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کا موضوع 'غالب کی شاعری کی عصری معنویت' تھا۔ سمینار میں شعبہ کے بہت سے طلبہ نے حصہ لیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سمینار میں کالج کے پرنسپل پروفیسر (ڈاکٹر) ویروبندر سنگھ نے طلبہ کو غالب کی شاعری کی اہمیت کے بارے میں بتایا اور سمینار میں طلبہ کی کثیر تعداد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام منعقد کرنے سے طلبہ کے لیے مستقبل میں ترقی کی راہیں آسان ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ پرنسپل صاحب نے اس کامیاب پروگرام کے انعقاد کے لیے شعبۂ اردو کو مبارکباد پیش کی۔ چیف پروکٹر ڈاکٹر نونیت بشنوئی نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں اسٹیج تک آنے اور طلبہ کو ہمیشہ ایسے پروگرام میں حصہ لینے کے لیے ترغیب دی۔ شعبۂ ہندی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر جاوید نے اپنے کلیدی خطبے میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب کی شاعری نہ صرف اردو زبان کے بلکہ دوسری زبانوں کے شعرا کے لیے بھی مشعل راہ ہے۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر سعید الحسن نے کی۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد موسیٰ نے سبھی کا شکریہ ادا کیا اور طلبہ کو اس طرح کے سمینار اور دیگر پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تلقین کی۔ سمینار میں سمرہ معراج، محمد نبیل، الشفا نور، منت زہرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 مارچ 2024

بیت بازی مقابلہ

وارانسی: بنارس ہندو یونیورسٹی کے مہیلا مہاودیالیہ میں 'منتھن' کے بینر تلے 'اردو بیت بازی' کا انعقاد کیا گیا جس میں بی اے فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ ایئر کی طالبات نے حصہ لیا۔ یہ مقابلہ تین گروپ میر، غالب اور فراق پر مشتمل تھا۔ پروگرام کا آغاز مدن موہن مالویہ کے مجسمہ پر گل پوشی کے ساتھ ہوا۔ مہیلا مہاودھیالیہ کی پرنسپل پروفیسر ریتا سنگھ نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ سبھی زبانیں ہماری تہذیب و ثقافت کا حصہ ہیں۔ ان زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس موقعے پر اردو سیکشن کے انچارج ڈاکٹر افضل مصباحی نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے داغ کا مشہور شعر 'اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ - ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے' سے مقابلے کا باضابطہ آغاز کیا۔ اس مقابلے میں فراق گروپ نے پہلا جب کہ میر گروپ نے دوسرا مقام حاصل کیا۔ انفرادی طور پر ستاکشی نے پہلا، چترالی سریواستو نے دوسرا اور چنچل کماری نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالسمیع نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چند طالبات نے ایسے خوبصورت انداز میں اشعار پیش کیے کہ اگر یہ مشاعرے میں جائیں تو مشاعرہ لوٹ لیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مشرف علی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بیت بازی مقابلے میں حصہ لینے والی بیشتر طالبات کا تعلق اردو سے نہیں ہے، اس کے باوجود انھوں نے اردو کے بہترین اشعار پیش کیے جس کے لیے وہ سب مبارکباد کی مستحق ہیں۔ پروگرام کے آخر میں مہیلا مہاودھیالیہ کے اساتذہ اور جج نے طالبات کے درمیان انعامات تقسیم کیے۔ شعبہ موسیقی سے تشریف لائے پروفیسر رچا کمار کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مارچ 2024

کرشنا سوبتی کی تخلیقی جہات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ہندی کے زیر اہتمام مشہور ادیبہ کرشنا سوبتی کے صد سالہ جشن کے موقعے پر ان کی تخلیقی جہات پر منعقدہ دو روزہ سمینار میں اپنے افتتاحی خطاب میں اردو کے افسانہ نگار سید محمد اشرف نے کہا کہ کرشنا سوبتی کی تحریر داستانی طرزِ بیان کی ایک مثال ہے۔ سید محمد اشرف نے کہا کہ جب وہ کرشنا سوبتی کو پڑھتے ہیں تو انھیں اردو کی ادیبہ واجدہ تبسم، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی کی یاد آتی ہے۔ انھوں نے کرشنا سوبتی سے اپنی ملاقات کا بھی ذکر کیا۔ کاشی ہندو یونیورسٹی وارانسی کے شعبہ ہندی کے سابق استاد پروفیسر کمار پنکج نے کہا کہ کرشنا سوبتی پر لکھنا بہت چیلنجنگ ہے۔ افتتاحی سیشن میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر عارف نذیر نے کہا کہ کرشنا سوبتی کا ثقافتی پس منظر بہت وسیع ہے۔ انھوں نے کرشنا سوبتی کے ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ حاضرین کا خیر مقدم ہندی شعبہ کے چیئرمین پروفیسر عاشق علی نے کیا۔ اس موقعے پر شعبہ ہندی کے دو اساتذہ ڈاکٹر غلام فرید صابری اور ڈاکٹر نیلوفر عثمانی کی کتاب اور کرشنا سوبتی پر مرکوز، ہندی شعبہ کی میگزین ابھینو بھارتی کے تازہ شمارے کا اجرا کیا گیا۔ پروفیسر تسنیم سہیل نے سمینار کا خاکہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر سمبھو ناتھ تیواری نے انجام دیے اور پروفیسر عفت اصغر نے شکریہ ادا کیا۔

پہلے اکادمک سیشن میں پروفیسر معراج احمد نے تقسیم ہند کے تناظر میں کرشنا سوبتی کے ادب کا جائزہ پیش کیا اور ان کے ناولوں کے ساتھ ساتھ ان کی کہانیوں میں دکھائی گئی لوک زندگی کا بھی تجزیہ کیا جب کہ ڈاکٹر پنکج پراشر نے 'زندگی نامہ' کے ساتھ ساتھ کرشنا سوبتی کے تخلیقی سفر پر تفصیل سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ کرشنا سوبتی کی ذہنی ساخت میں تنگ نظری یا کسی بھی قسم کی فرقہ پرستی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس سیشن میں ویمنس کالج کی ڈاکٹر شگفتہ نیاز، ڈاکٹر نازش بیگم اور ڈاکٹر ثنا فاطمہ نے مقالے پیش کیے۔ ہندی شعبہ کے سابق چیئرمین ڈاکٹر رمیش چند نے سیشن کی صدارت کی اور پروفیسر دیویندر کمار گپتا نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ دوسرے اکادمک سیشن کی صدارت پروفیسر پردیپ کمار سکسینہ اور راجیو لوچن ناتھ شکلا نے کی۔ انگریزی شعبہ کے چیئرمین پروفیسر عاصم صدیقی مقرر خاص اور دھرم سماج کالج، علی گڑھ سے سبکدوش پروفیسر پریم کمار مقرر خصوصی تھے۔ نظامت ڈاکٹر سمینہ بانو نے کی۔ سمینار کے دوسرے دن چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پروفیسر نوین چندر لوہانی نے کرشنا سوبتی کی تحریروں پر گفتگو کی، جب کہ پروفیسر سمبھو ناتھ تیواری نے کہا کہ کرشنا سوبتی اپنے وقت کی پہلی مصنفہ ہیں جنھوں نے ہندی میں ملک کی تقسیم کے بارے میں لکھا۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر آشوتوش کمار نے کہا کہ کرشنا سوبتی اپنی زندگی اور تحریروں میں دوٹوک، بے باک اور دلیر تھیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں خواتین کے تجربات کا گہرا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید عالم اور ڈاکٹر مشکاۃ عابدی نے بھی اپنے مقالے پڑھے۔ آخری نشست میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر نیرج کمار نے کہا کہ کرشنا سوبتی زندگی سے کردار لیتی ہیں اور زبان بھی وہیں سے لیتی ہیں۔ ان کی زبان اور کرداروں میں مقامیت ہے۔ انھوں نے 'مترو مرجانی' کے کردار مترو کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ پروفیسر کملانند جھا نے کرشنا سوبتی کے ادب کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ عظیم ادیب ایک صنف میں فٹ نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے حاشیے پر رہنے والے لوگوں کے بارے میں لکھا۔ پروفیسر عاشق علی نے اپنے خطاب میں کہا کہ جب تک دیہی ثقافت سے تعلق نہیں ہوگا، ادیب کی تخلیق میں زندگی نہیں ہوگی۔ کرشنا سوبتی ایک زمینی تخلیق کار ہیں۔ ان کی زبان ثقافتی ماحول سے لی گئی ہے جو اجنبی نہیں لگتی۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر عبدالعلیم نے کہا کہ کرشنا سوبتی کا ادب زندگی کی دھڑکن

والا ادب ہے۔ ان کی زبان کا گہرائی سے مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ حقیقی تخلیق کار وہ ہے جو کسی بحث کے جال میں نہیں پھنستا۔ ادب وژن دیتا ہے، مقصد نہیں۔ سیشن کی نظامت ڈاکٹر دیپ شکھا سنگھ نے کی، جب کہ پروفیسر تسنیم سہیل نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 13 مارچ 2024

دستک ادبی فورم کے زیر اہتمام طلبہ سمینار

بنارس: کسی بھی تعلیمی ادارے کا تصور استاد اور شاگرد کے بغیر ممکن نہیں۔ ادارے کو شناخت اور کامیابی عطا

کرنے میں استاد اور شاگرد دونوں کا یکساں حصہ ہوتا ہے۔ طالب علم اچھا اور کامیاب اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ استاد کے بتائے راستوں پر چلے اور استاد کی کامیابی طلبا کی کامیابی میں مضمر ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے شعبۂ اردو کی ادبی تنظیم 'دستک ادبی فورم' کے زیر اہتمام طلبہ و ریسرچ اسکالر سمینار میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران کیا۔

دستک ادبی فورم کے نگراں ڈاکٹر مشرف علی نے تنظیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دستک ادبی فورم شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کی ادبی تنظیم ہے جس کے تحت طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کی مختلف ادبی اور ثقافتی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ اس کا مقصد طلبہ میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کرنا اور ادب کی افہام و تفہیم کی صلاحیتوں کو صیقل کرنا ہے۔ انھی مقاصد کے حصول کے لیے 9 مارچ 2024 بروز سنیچر شعبۂ اردو کے سمینار ہال میں طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کا سمینار پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں ایم۔ اے۔ سال اول کے دو، ایم۔ اے۔ سال آخر کے تین اور پی ایچ ڈی کے پانچ ریسرچ اسکالرز نے مقالے پیش کیے۔ ایم اے کے طلبا سے کہا گیا تھا کہ وہ نصاب میں شامل کسی ایک نظم کا تجزیہ یا کسی ایک مضمون پر مقالہ اساتذہ کی نگرانی میں تحریر کریں اور ریسرچ اسکالر اپنے موضوع سے متعلق مقالہ لکھیں اور پیش کرنے سے پہلے اپنے نگراں کے سامنے اس کی قرأت کرلیں۔ طلبا اور ریسرچ اسکالرز نے اساتذہ سے رابطہ کیا اور مقالات کی اصلاح کے بعد انھوں نے سمینار میں اپنے مقالے پیش کیے۔ مہمان خصوصی پروفیسر محمد طاہر صدر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج اعظم نے ان مقالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسی تقریبات سے طلبہ میں ادب کی تفہیم، تجزیہ اور مقالہ پیش کرنے کی تربیت ہوتی ہے اور یہاں پیش کیے گئے مقالات کسی بھی قومی سمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات سے کم نہیں تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی اور مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کے روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

اس سمینار میں ایم اے سال اول کے محمد ساجد نے بعنوان 'تنقید کی اہمیت' اور نوشین نوشاد نے 'حالی کی تنقید نگاری کا جائزہ' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ایم اے سال آخر کے محمد شعیب نے 'کلام غالب کا اجمالی جائزہ'، صائمہ پروین نے 'جوش ملیح آبادی کی نظم البیلی صبح کا تنقیدی مطالعہ' اور اثاثہ بی بی نے 'نظیر اکبر آبادی کی نظم بنجارہ نامہ کا تجزیہ' کے عنوان سے اپنے مقالات پیش کیے۔ ریسرچ اسکالرز میں پرویز احمد (ساحر لدھیانوی: احساسات کا شاعر) آصف جمال (مشینی دور میں ادب: وارث علوی کی نظر میں) محمد شاہنواز انصاری (قاضی عبدالستار بحیثیت تاریخی ناول نگار) تسنیم قمر (اردو کی جدید مثنوی 1857 کے بعد) مریم صبا (لالہ رام نرائن لعل اگروال اور رائے صاحب دیال اگروال کی خدمات) نے مقالات پیش کیے۔ ان مقالوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے شعبہ کے استاد ڈاکٹر احسان حسن نے کہا کہ طلبہ کو اسی طرح محنت کرنی چاہیے اور ہم اساتذہ ان کی اصلاح کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ اگر یہ صورت بحال رہی تو بہت جلد ہمارا شعبہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹی کے شعبوں میں ممتاز مقام حاصل کرلے گا۔

پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر محمد صدام اور محمد اعظم نے کی۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر مشرف علی نے تمام مہمانان اور مقالہ نگاران کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر عبدالسمیع، ڈاکٹر رقیہ بانو کے علاوہ شعبے کے ریسرچ اسکالرز اور طلبا کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

پریس ریلیز: عبدالسمیع، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، وارانسی، 11 مارچ 2024

شعبۂ تاریخ میں سرسید لیکچر سیریز کے تحت دو خطبات

علی گڑھ: سرسید نے 1857 کی بغاوت کے بعد اپنی علمی و اصلاحی خدمات سے معاشرے میں تکثیریت اور کثرت میں وحدت کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جو سیاسی بحران کے دور میں ان کی دوراندیشی، دانشمندی اور حکمت عملی کا مظہر تھی۔ ایک مورخ اور ماہر آثار قدیمہ کے طور پر بھی ان کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی کتاب 'آثارالصنادید' دہلی کی یادگاروں پر سب سے زیادہ مستند کاموں میں سے ایک ہے۔'' ان خیالات کا اظہار اگنو کے سابق وائس چانسلر پروفیسر رویندر کمار سریواستو نے 'فن اور تعمیراتی ورثہ کے نظریات: علمیات اور نقطہ ہائے نظر' کے موضوع پر سرسید احمد خاں کی برسی کے موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ، سنٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی میں لیکچر سیریز کے تحت خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ پروفیسر سریواستو نے ہندوستان میں مختلف طبقات کے درمیان بقائے باہمی کو برقرار رکھنے کے لیے سرسید کی جدوجہد کے بارے میں تفصیل سے بات کی اور آثارالصنادید کی روشنی میں ایک مورخ اور ماہر آثار قدیمہ کے طور پر ان کے کردار پر روشنی ڈالی۔ 'ڈیجیٹل عہد میں تاریخ کی تدریس و تحقیق' موضوع پر اپنے دوسرے لیکچر میں پروفیسر سریواستو نے کہا کہ ڈیجیٹل لرننگ نے علم کو جمہوری بنایا ہے اور معاشرے کے ہر طبقے کے لیے علم تک رسائی آسان ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ علم کی ترسیل سے طلبا کے اندر تنقیدی فکر کو فروغ ملنا چاہیے۔ انھوں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی کہ انٹرنیٹ نے کس طرح علم کی نوعیت اور درس و تدریس کی شکل کو بدل دیا ہے۔ اپنے صدارتی کلمات میں شعبہ کے چیئرمین پروفیسر حسن امام نے بنیادی مآخذ سے سرسید کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر زور دیا اور لاہور میں انارکلی آرکائیوز پر تحقیق کے دوران سرسید کے بارے میں حاصل ہونے والی اہم معلومات کا ذکر کیا۔

انھوں نے ڈیجیٹل لرننگ کی اہمیت بیان کی جس پر حکومت ہند کی نئی قومی تعلیمی پالیسی میں خاص زور دیا گیا ہے۔ قبل ازیں مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے لیکچر سیریز کے کنویز پروفیسر پرویز نذیر نے مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ سرسید کے علمی مقام اوران کی میراث کو سمجھنے کے لیے اس طرح کے خطبات اہم ہیں۔ ڈاکٹر نذرالباری نے پروفیسر سریواستو کے دوسرے لیکچر سے قبل تعارفی کلمات پیش کیے۔ پروفیسر وسیم راجا اور ڈاکٹر لبنیٰ عرفان نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔ پہلے لیکچر میں ڈاکٹر انیسہ اقبال صابر جب کہ دوسرے لیکچر میں ڈاکٹر ثنا عزیز نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 اپریل 2024

بہار

تحقیق کی مبادیات اوراس کا طریقۂ کار

پٹنہ: شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ میں 12 مارچ کو 'تحقیق کی مبادیات اوراس کا طریقہ کار' کے موضوع پر ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ مہمان مقرر ڈاکٹر عبدالباسط حمیدی نے تحقیق کی مبادیات اور طریقۂ کار سے متعلق ریسرچ اسکالروں اور دیگر طلبہ کو متعارف کرایا اور اس کی بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی۔ نظامت ڈاکٹر محمد ضمیر رضا نے کی۔ ڈاکٹر سورج دیو سنگھ صدر شعبہ اردو نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر حمیدی نے اس موقعے پر اپنے خطاب میں سمجھایا کہ جب بھی آپ کوئی تحقیق کریں یا کوئی علمی بات سامنے آجائے تو آپ اسے فوراً قبول نہ کریں۔ ڈاکٹر حمیدی نے تحقیق کی مبادیات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا کہ مبادیات کے معنی ابتدائی باتیں یا اصول ہیں۔ یعنی ہر وہ معلومات جو کسی فن کے سمجھنے کے لیے لازم ہوتی ہے اسی کو مبادیات کہتے ہیں۔ انھوں نے اسکالروں کو ہدایت دی کہ جب بھی آپ موضوع کا انتخاب کریں تو ان خاص باتوں کا خیال رکھیں تا کہ مابقیہ تینوں اجزا میں آپ کو کوئی دشواری در پیش نہ ہو۔ روزنامہ'انقلاب' دہلی، 13 مارچ 2024

تلنگانہ

'مانو' میں افسانوی نشست

حیدرآباد: اردو محبت کی زبان ہے۔ یہ مجھے اپنی مادری زبان پنجابی کی طرح عزیز ہے۔ پنجاب میں اردو زبان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور وہاں کی مٹی سے اردو کی عظیم شخصیات نے جنم لیا ہے۔ آج بھی لوگ اس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مشہور افسانہ نگار جناب ملکیت سنگھ مچھانا نے یونیورسٹی لٹریری کلب کی جانب سے ثقافتی سرگرمی مرکز، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی میں اپنے اعزاز میں منعقدہ افسانوی نشست سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے تقسیم ہند کے موضوع پر اپنا افسانہ 'جیتو' پیش کیا جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ صدر اجلاس پروفیسر سید علیم اشرف جائسی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب بابا فرید، گرونانک، بلھے شاہ جیسے بزرگوں کی سرزمین ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ملکیت سنگھ جی جیسے افسانہ نگار آج ہمارے درمیان موجود ہیں جن کا تعلق پنجاب کی مردم خیز دھرتی سے ہے۔ نشست میں شعبۂ تعلیم وتربیت سے وابستہ سینئر استاد اور یونیورسٹی کے پروفیسر صدیقی محمد محمود نے اپنا افسانہ 'اسیرانِ خواب' پیش کیا جس کا موضوع حسن اخلاق اور انسانی اقدار کی اہمیت تھا۔ مہمان افسانہ نگار کا خیر مقدم کرتے ہوئے یونیورسٹی لٹریری کلب کے صدر ڈاکٹر فیروز عالم نے کہا کہ اردو شعر و ادب کے فروغ میں پنجاب کا نمایاں کردار رہا ہے۔ خصوصاً فکشن میں منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ملکیت سنگھ جی اسی افسانوی روایت کی ایک اہم کڑی ہیں۔ اس موقعے پر طلبہ نے پیش کردہ افسانوں پر اظہارِ خیال کیا۔ یونیورسٹی لٹریری کلب کے سکریٹری طلحہ منان نے مہمان کا تعارف پیش کیا اور نشست کی نظامت کی۔ یونیورسٹی کے کلچرل کوآرڈینیٹر جناب معراج احمد کی نگرانی میں ڈراما کلب کے سکریٹری محمد مصباح، قلم کلب کے سکریٹری ثاقب بختاور علی انصاری، جینڈر کلب کے سکریٹری محمد فہیم نے انتظامات میں حصہ لیا۔ نشست میں مختلف شعبوں کے طلبا و طالبات موجود تھے۔ یونیورسٹی لٹریری کلب کی جوائنٹ سکریٹری عالیہ ندا کے اظہار تشکر پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 12 مارچ 2024

شعبۂ عربی مانو میں دو روزہ قومی سمینار

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ عربی کے زیراہتمام 'انیسویں اور بیسویں صدی کے عربی سفرناموں میں ہندوستان: فنی تصویر اور تہذیبی فہم' دو روزہ قومی سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن شیخ الجامعہ نے کی جب کہ پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی، سابق ڈین، اسکول آف آرٹس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں موضوع کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ پروفیسر حبیب اللہ خان، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے سعید الطریحی کے سفرنامے پر روشنی ڈالی اور طلبہ کو اس کے مطالعے کی ترغیب دی۔ پروفیسر عزیز بانو، ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات، مانو نے بھی خطاب کیا۔ افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر سید علیم اشرف جائسی صدر شعبۂ عربی مانو نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا، ڈاکٹر ثمینہ کوثر، اسسٹنٹ پروفیسر نے شکریہ ادا کیا۔ سمینار میں ملک بھر سے عربی ادب کے ماہرین، اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس نے تحقیقی مقالے پیش کیے۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 مارچ 2024

فارسی زبان کی ترویج میں غیر مسلموں کا حصہ

حیدرآباد: ہندوستان میں فارسی کی آمد کے بعد سے ہی تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں فارسی زبان کو صرف مسلمانوں نے ہی پروان نہیں چڑھایا بلکہ غیر مسلموں ہندو، سکھ، عیسائی سبھی نے فارسی کی ترویج و اشاعت میں شانہ بہ شانہ حصہ لیا اور اپنے گراں قدر خدمات سے فارسی کے دامن ادب کو وسعت بخشی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شریف حسین قاسمی نے دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیراہتمام 'سہم غیر مسلمانان در ترویج وتوسیعۂ زبان و ادبیات و فرہنگ فارسی' کا اہتمام کیا گیا تھا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے کی۔ ممتاز مورخ پروفیسر دیپک کمار، شعبۂ تاریخ مہمانِ خصوصی اور پروفیسر اشتیاق احمد، رجسٹرار و پروفیسر سید عبدالخالق رشید، استاد پشتو فارسی کابل یونیورسٹی مہمانانِ اعزازی تھے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنا خطاب جاری رکھتے ہوئے کہا کہ خاص طور پر ہندوؤں نے فارسی زبان کو پورے خلوص سے اپنایا۔ انھوں نے فارسی زبان میں مختلف علوم وفنون میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اگر ہندوستان کے فارسی ادب سے ہندوؤں کی خدمات کے حصہ کو نکال دیا جائے تو صرف ایک چوتھائی ادب رہ جائے گا۔ ہندوؤں بالخصوص کائستھوں کی فارسی خدمات ہندوستان کے فارسی ادب کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ پروفیسر عزیز بانو، ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات نے مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں صدر شعبہ و ڈائرکٹر کانفرنس نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اس بین الاقوامی کانفرنس میں آن لائن و آف لائن 75 مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر افتخار احمد کنویز کانفرنس نے کارروائی چلائی۔ ڈاکٹر محمد رضوان نے شکریہ ادا کیا۔ دوسرے دن اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اشتیاق احمد، رجسٹرار نے کی۔ پروفیسر عبدالخالق رشید، کابل

نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ڈاکٹر علی اکبر نیر ومند، ریجنل ڈائرکٹر، نور مائیکرو فلم، نئی دہلی اور پروفیسر عزیز بانو، ڈین اسکول آف لینگویجز نے مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ ڈاکٹر سید عصمت جہاں نے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر نے کانفرنس کی رپورٹ پیش کی۔ ڈاکٹر قیصر احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر نے شکریہ ادا کیا جب کہ ڈاکٹر محمد رضوان نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 مارچ 2024

دو روزہ تعارف سنسکرت ورکشاپ

حیدرآباد: سنسکرت اور اردو زبان کا لسانی و تہذیبی رشتہ بہت ہی قدیم اور نہایت ہی مضبوط ہے۔ اردو کے لفظی و ثقافتی سرمایے اور نحوی ڈھانچے کا ایک بڑا حصہ

سنسکرت پر ہی مشتمل ہے۔ اس لیے اردو جاننے والے طلبا کے لیے سنسکرت کی بنیادی لسانی مہارتیں کافی مفید ثابت ہوں گی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شیخ اشتیاق احمد، رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے شعبہ ترجمہ کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ تعارف سنسکرت ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر یونیورسٹی کے شعبہ ترجمہ کو اس اہم ورکشاپ کے انعقاد پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ترجمہ ایک مخصوص فن ہے اور یہ فن مختلف زبانوں کے لسانی و تہذیبی عناصر سے واقفیت اور ان پر کماحقہ مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ انھوں نے طلبہ کو مختلف زبانوں کے سیکھنے کی ضرورت اور افادیت سمجھاتے ہوئے کہا کہ آج کی دنیا میں ذولسانیت اور کثیر لسانیت ایک اہم صلاحیت ہے جس کی بازار میں کافی مانگ ہے۔ سنسکرت تو ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے پروفیسر صدیقی محمد محمود نے بھی اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ جن کی مادری زبان پر گرفت اچھی ہوتی ہے وہ مختلف زبانیں بآسانی سیکھ سکتے ہیں۔ سنسکرت زبان و ادب میں ہندوستانی ثقافت کا خزانہ پوشیدہ ہے اور اس کی شاعری و ڈراموں میں مختلف اخلاقی اقدار کا سبق ملتا ہے۔ ورکشاپ کے ریسورس پرسن ڈاکٹر شیخ عبدالغنی نے کہا کہ کسی بھی زبان کو سیکھنے میں ہمیں کوئی تعصب نہیں ہونا چاہیے اور سنسکرت تو وہ زبان ہے جو ہماری مادری زبان یعنی اردو کی اصل زبانوں میں سے ایک ہے۔ قبل ازیں شعبہ ترجمہ کے صدر ڈاکٹر سید محمود کاظمی نے افتتاحی اجلاس کے مہمانوں اور ورکشاپ کے شرکا کا خیر مقدم کیا اور اس ورکشاپ کی غرض و غایت بیان کی۔ اس موقعے پر پروفیسر شگفتہ شاہین، پروفیسر شعبہ انگریزی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

دو روزہ تعارف سنسکرت ورکشاپ میں جملہ آٹھ سیشن رکھے گئے جن میں طلبہ کو سنسکرت زبان کی تین بنیادی مہارتیں رسم الخط و تحریر، سننے کی مہارت اور بولنے کی مہارت سکھائی گئی۔ اس ورکشاپ سے یونیورسٹی کے طلبہ کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔ 8 مارچ کو ورکشاپ کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات کے کارگزار ڈین پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے کی، جب کہ پروفیسر مسرت جہاں، شعبہ اردو، مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک رہیں۔ کنوینر ورکشاپ ڈاکٹر فہیم الدین احمد نے ورکشاپ کی رپورٹ پیش کی۔ اس موقعے پر ورکشاپ میں شرکت کرنے والے تمام شرکا کو اسناد بھی دی گئیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 12 مارچ 2024

تمل ناڈو

قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر میں جلسہ تقسیم اسناد

میل وشارم: اردو زبان محبت اور جوڑنے کی زبان ہے، اس زبان کی مٹھاس ہر ایک کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس زبان کی مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب محمد کاتب حنیف، خزانچی اومیٹ، چنئی نے سی عبدالحکیم کالج میل وشارم میں این سی پی یو ایل، نئی دہلی اور این آئی ای ایل آئی ٹی، نئی دہلی کے ڈپلوما کورسز کے جلسہ تقسیم اسناد میں صدارتی کلمات میں کیا۔

قبل ازیں مہمانوں کا تعارف اور استقبالیہ کلمات، صدر شعبہ اردو و کوآرڈینٹر برائے کمپیوٹر سنٹر پروفیسر محمد یاسر نے پیش کیے۔ کالج کے پرنسپل جناب ایس اے ساجد نے صدر اجلاس جناب محمد حنیف کاتب اور مہمان خصوصی محترمہ ڈاکٹر اندرا گاندھی، پرنسپل گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج، سیر کارڈ ویلور کی خدمت میں ایک یادگار مومنٹو پیش کیا۔ پرنسپل نے پروفیسر یاسر کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی شال پوشی کی۔ مہمانوں کی عزت افزائی اور تکریم کے بعد کالج پرنسپل نے افتتاحی خطاب کرتے ہوئے ڈپلوما حاصل کرنے والے طلبا کو مبارکباد پیش کی اور انھیں نصیحت کی کہ زبان و بیان قدرت کی نشانیوں میں سے ہے، یہ کسی کی پہچان یا شناخت کا ذریعہ نہیں ہے۔ زبان کا سیکھنا دراصل خود کو ہنرمند بناتا ہے۔ صدر اجلاس نے طلبا کو اردو زبان سے جڑے رہنے کی تلقین کی اور کہا کہ آپ نے جو زبانیں سیکھی ہیں وہ دوسروں کو بھی سکھائیں، چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ آپ نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ آج طلبا کی ایک بڑی تعداد نہ صرف اردو، عربی اور فارسی زبان میں ڈپلوما حاصل کر رہی ہے بلکہ وہ ٹیکنیکل مہارت حاصل کرتے ہوئے کمپیوٹر کورسز کی بھی سند حاصل کر رہی ہے۔ ان کی یہ اسناد خلیجی اور بیرونی ممالک میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ مہمان خصوصی پرنسپل محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے خطاب میں مثالیں دے کر وضاحت کی کہ جو لوگ کسی میدان میں کامیاب ہو کر نمایاں خدمات سے اپنے ملک و ملت کا نام روشن کرتے ہیں وہ عموماً ایک زبان کے بجائے تین چار زبانیں بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ زبانیں سیکھنے سے مختلف تجربات اور مشاہدات حاصل ہوتے ہیں۔ جب آپ زبانوں کو تعصب کی عینک سے دیکھنے لگیں گے تو پھر یہ آپ کا اپنا خسارہ ہے۔ آپ نے شعبہ اردو کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج تقریباً پانچ سو طلبا کے مابین جو اسناد تقسیم ہوں گی وہ کوئی معمولی بات نہیں، اس کے لیے آپ نے کالج انتظامیہ، شعبہ اردو اور اساتذہ کی خدمت میں ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کی۔ اس کے بعد این سی پی یو ایل اور این آئی ای ایل آئی ٹی کے شعبے میں خدمت انجام دینے والے اساتذہ کرام عبدالرؤف عمری، بی فیضان احمد، ارشد باشاہ، بی احتشام الحق، حافظ امداد اللہ،

حافظ محمد سیفی عمری، ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری اور ڈاکٹر ظہیر دانش عمری کی خدمت میں یادگار تحفہ پیش کیا گیا۔ طلبہ کے مابین اسناد کی تقسیم کا اعلان عبدالرؤف عمری نے کیا اور ڈاکٹر ظہیر دانش عمری کے ہدیہ تشکر پر یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔ پروفیسرز، اساتذہ، طلبا وطالبات کے علاوہ عوام کی ایک کثیر تعداد اس اجلاس میں شریک رہی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس محمد یاسر، ہیڈ اینڈ سپروائزر، شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم، 20 مارچ 2024

اعزاز و اکرام

ترجمہ ایوارڈ 2023

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر مادھو کوشک کی صدارت میں منعقد ساہتیہ اکادمی ایگزیکٹو بورڈ کے اجلاس میں 24 ہندوستانی زبانوں میں ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2023 کے لیے انعامات کی منظوری دی گئی ہے۔ اردو میں یہ ایوارڈ چترا مدگل کے ہندی ناول 'پوسٹ باکس نمبر 203/نالاسوپارا' کے اردو ترجمہ کے لیے احسن ایوبی کو

دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ دیگر انعام یافتگان میں کشمیری کے لیے گلزار احمد راتھر، ہندی کے لیے ریتا رانی پالیوال کو اور انگریزی کے لیے نومیتا دیوسین کا انتخاب کیا گیا۔ ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ کے لیے اس بار یکم جنوری 2017 سے 31 دسمبر 2021 کے درمیان پہلی بار شائع ہونے والے نمائندہ تراجم زیرغور آئے۔ یہ ایوارڈ امتیازی نشان اور پچاس ہزار روپے پر مشتمل ہے جو آئندہ ایک پروقار تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔ اردو ایوارڈ کا فیصلہ ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال کی صدارت میں منعقد ہوا جس کے جیوری ممبران میں ڈاکٹر نصرت مہدی، اسلم مرزا اور پروفیسر خالد محمود شامل تھے۔ واضح رہے کہ احسن ایوبی اردو کے بہترین مترجم اور فکشن ناقد ہیں۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی اور فی الحال وہ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف ومترجم احسن ایوبی کے ترجمہ کردہ ناول 'پوسٹ باکس نمبر 203/نالاسوپارا'، 'فلسطینی ناول 'حیفا پلٹنے والے' ہندی ناول 'کیرتی گان' اور ہندی کہانیوں کے تراجم پر مبنی کتاب 'کہانی سفر میں ہے' کو ادبی حلقوں میں خوب سراہا گیا ہے۔ ہندی کی سینئر فکشن نگار چترا مدگل کا ناول 'پوسٹ باکس نمبر 203/نالاسوپارا' تیسری جنس کے مسائل پر مبنی ہے جس پر ساہتیہ اکادمی نے انھیں 2018 میں ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 مارچ 2024

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیراہتمام منعقدہ 'ساہتیہ اتسو' کے دوران 24 ہندوستانی زبانوں کے ادبا کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2023 سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر نئی دہلی کے

کمانی آڈیٹوریم میں تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر معروف اڑیا مصنفہ پرتیبھا رائے نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ ادب سب کو جوڑتا ہے، دوسروں کی طرح وہ کبھی تقسیم کی بات نہیں کرتا۔ تمام ہندوستانی زبانیں ہمیں طاقت دیتی ہیں اور محبت کی زبان بولنے کے لیے بھی تیار کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زبان کی ترقی کے بغیر کوئی ثقافت زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے صدر مادھو کوشک نے کہا کہ آج ایوارڈ سے نوازے جانے والے تمام ادبا اپنی اپنی زبانوں کے مہارتھی ہیں اور وہ نہ صرف تخلیق کرتے ہیں بلکہ اس کو محفوظ بھی کرتے ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ دور حاضر میں جو بھی خوبصورتی یا انسانیت نظر آتی ہے، اس کے پیچھے ادیبوں کی تخلیقی کاوشیں ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سری نواس راؤ نے کہا کہ مصنفین علم کی قیمتی دولت کو ہم تک پہنچا کر ہمیں مالامال کرتے ہیں۔ جن کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2023 سے نوازا گیا ان میں پرنب جیوتی ڈیکا (آسامی)، سوپننموئے چکرورتی (بنگالی)، نندیشور ڈیماری (بوڈو)، وجے ورما (ڈوگری)، نیلم سرن گوڑ (انگریزی)، ونود جوشی (گجراتی)، سنجیو (ہندی)، لکشمیش تولپاڈی (کنڑ)، بنیہالی (کشمیری)، پرکاش ایس پریانکر (کونکنی)، باسوکی ناتھ جھا (میتھلی)، ای وی رام کرشنن (ملیالم)، سوروکھائم لمبھینی (منی پوری)، کرشنت تو کارام کھوت (مراٹھی)، یودھویر رانا (نیپالی)، آشوتوش پریدا (اوڑیا)، سوارنجیت ساوی (پنجابی)، گجی سنگھ راجپوروہت (راجستھانی)، ارون رنجن مشرا (سنسکرت)، باسکے (سنتھالی)، ونود اسودانی (سندھی)، این راجاسیکرن (تمل)، ٹلاوالا پتنجلی شاستری (تیلگو) اور صادقہ نواب سحر (اردو) کے نام شامل ہیں۔ واضح رہے کہ آسامی ایوارڈ یافتہ خرابی صحت کی وجہ سے نہیں آسکے۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے نے ایوارڈ حاصل کیا۔ ایوارڈ تقریب کے اختتام پر اظہار تشکر کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کی نائب صدر کمود شرما نے کہا کہ آج اس پلیٹ فارم پر ہندوستانی ادب کی عزت نفس، خوبصورتی اور وقار کو ایک ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ ادب لازوال ہے اور آنے والے معاشرے کے لیے انسانیت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی نظموں پر کستوری کے عنوان سے ایک پیشکش کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مارچ 2024

شاعر ڈاکٹر جتندر پرواز

پنچکولہ: احساس ادبی سوسائٹی، پنچکولہ کی جانب سے نوجوان شاعر ڈاکٹر جتندر پرواز کو 'شانِ اُردو' ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ ان کو مومنٹو، سرٹیفکیٹ اور شال دے کر نوازا گیا۔ اس موقعے پر درشٹی آئی ہاسپٹل کے ڈائریکٹر

ڈاکٹر اشوک گپتا مہمانِ خصوصی کے طور پر شامل ہوئے انھوں نے پرواز کی ایک غزل 'نظر کا چشمہ اتر گیا ہے چمک اٹھی ہیں ہماری آنکھیں' نگاہ کچھ اور بڑھ گئی ہے ہیں جب سے دیکھیں تمھاری آنکھیں' کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ میں آنکھوں کا ڈاکٹر ہوں، اور مجھے ڈاکٹر پرواز کی

آنکھوں پر کہی گئی یہ غزل بے حد پسند ہے۔ اس موقعے پر احساس ادبی سوسائٹی کے صدر بی ڈی کالیہ ہمدم نے کہا کہ نوجوان شاعر ڈاکٹر جتندر پرواز نے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، یہ ایم اے اردو اور ہندی بھی ہیں۔ اردو ادب کے لیے یہ بہت کام کر رہے ہیں۔ ان کا اعزاز کر کے احساس ادبی سوسائٹی، پنچکولہ بے حد فخر محسوس کر رہی ہے اور ہم ان کے روشن مستقبل کی کامنا کرتے ہیں۔ سیکٹر 12 پنچکولہ میں ہوئے اس پروگرام میں چنڈی گڑھ، ٹرائسٹی کے جانے مانے ادیب و شاعر موجود تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر جتیندر پرواز، پنچکولہ، 1 اپریل 2024

سراج زیبائی

چننئی: تامل ناڈو کے مشہور شاعر و ادیب اور صاحب طرز نقاد سراج زیبائی کے تاثراتی و تجزیاتی مضامین کے مجموعے 'لہجوں کی مہک' (حصہ دوم) کو امیر النسا ایجوکیشنل

اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کڈپہ آندھرا پردیش کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد قومی ایوارڈ برائے سال 2023-24 کا حقدار قرار دیا گیا۔ موصوف کی تا حال دس کتابیں منظر عام پر آ کر ارباب علم و دانش سے خراج وصول کر چکی ہیں۔ اس سے قبل بھی آپ کی کتابوں کو متعدد اعزازات حاصل ہو چکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2024

اجرا

تاریخ طب و اخلاقیات

علی گڑھ: اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر محمد گلریز نے پروفیسر ڈاکٹر اشہر قدیر، شعبہ کلیات، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کی تصنیف 'تاریخ طب و اخلاقیات' کے آٹھویں ایڈیشن کا اجرا کیا۔ 2001 میں پہلی اشاعت کے بعد اس کتاب نے یونانی طب کے طلبا و طالبات میں بہت مقبولیت حاصل کی ہے، جو نیشنل کمیشن فار انڈین سسٹم آف میڈیسن (این سی آئی ایس ایم) کے تجویز کردہ نصاب کے عین مطابق ہے۔ کتاب کے اجرا کے موقعے پر پروفیسر فراست علی، ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، شعبہ کلیات کے چیئرمین پروفیسر ایف ایس شیرانی اور اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عرشی ریاض اور ڈاکٹر ہما نور بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 مارچ 2024

کیکٹس کے درمیان

نئی دہلی: ماہنامہ 'آجکل' اردو کے دفتر سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس نئی دہلی میں انصاری اطہر حسین (ساحر داؤدنگری) کی آزاد نظموں کے مجموعے کیکٹس کے درمیان

کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی فکشن نگار خورشید حیات کے علاوہ آجکل اردو کے اعزازی مدیر محمد افروز عالم، ادیب و صحافی حبیب سیفی، ادیب ایڈوکیٹ عمران عظیم نے شرکت کی۔ رسم اجرا کے خصوصی مہمان خورشید حیات نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کی کم و بیش سبھی نظمیں سماج کی صورت حال کی غماز ہیں بلکہ میں اگر یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ سماج کا المیہ بیان کرتی ہیں۔ ساحر داؤدنگری بحیثیت صحافی اپنا مقام تو رکھتے ہی ہیں، شعر و ادب کی دنیا میں بھی وہ محتاج تعارف نہیں۔ محمد افروز عالم نے کہا کہ ان کی نظمیں گاؤں دیہات سے نکل کر شہر میں آ بسے، عذابوں میں مبتلا زندگی، اس کی پیچیدگیوں، اعصابی تناؤ، زندہ رہنے کے لیے کی جانے والی مسلسل بھاگ دوڑ، صنعتی ترقی کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ جانے والی مہذب اور نفیس اقدار کا نہ صرف موثر اور حقیقت پسندانہ اظہار ہیں بلکہ ساحر کی ادبی ساحری کا بھی عمدہ ثبوت ہیں۔ حبیب سیفی نے کہا کہ ان کی نظموں کا مجموعہ نئی فکر کے ادب پسندوں اور اردو کے شیدائیوں کے لیے اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں زندگی کے ایسے موضوعات اور تلخ تجربات نظموں کا روپ لیے ہوئے ہیں جنھیں اب سے پہلے نظموں کے پیرائے میں نہیں دیکھا گیا۔ ساحر داؤدنگری نے جدت اور روایت کے درمیان کی اس لکیر سے خود کو جوڑنے کی کوشش کی ہے جس کے سہارے کلام کو با معنی بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔ یہی لکیر ان کی نظموں میں نئے پن کا احساس دلاتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 مارچ 2024

حسن خیال

لکھنؤ: بزم زندہ دلان اودھ کے زیر اہتمام ملن میرج ہال سیتاپور روڈ کھدرا میں شکیل انصاری کے دوسرے شعری مجموعے 'حسن خیال' کی تقریب اجرا عمل میں آئی۔ تقریب کی صدارت چار دواوین کے خالق مرزا شارق لاہرپوری نے کی۔ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر ہارون رشید نے بحسن و خوبی انجام دیا جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری شریک محفل رہے۔ مہمان اعزازی کے طور پر وسیم حیدر اور رحمت لکھنوی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر انیس انصاری نے کہا کہ شکیل انصاری کا تعلق عمر انصاری جیسے استاد شاعر کے خانوادہ سے ہے۔ وہ تمام تر شعری روایتوں کی پاسداری کے ساتھ اپنے نانا کی وراثت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان کی شاعری دل و نگاہ کو متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر عافیہ حمید نے اپنے مقالے میں لکھا کہ اگر شکیل انصاری کے پہلے مجموعہ کو ذہن میں رکھ کر حسن خیال کی شاعری پر غور کریں تو منکشف ہوتا ہے کہ ان کی فکر ایک نئی توانائی کے ساتھ مسلسل مائل پرواز ہے۔ زبان و بیان کی سطح پر بھی نسبتاً زیادہ صفائی روانی اور شفافیت نظر آتی ہے جو اچھی شاعری کا شناخت نامہ ہے۔ ڈاکٹر اسرار الحق قریشی نے کہا کہ شکیل انصاری کے کلام میں قدیم اقدار کی پاسداری ہے۔ رحمت لکھنوی نے حسن خیال کی شاعری کو زندگی کے تجربات اور معاشرے کے مشاہدات کا عکس قرار دیا۔ وسیم حیدر نے اپنی گفتگو میں شکیل انصاری کو مبارکباد دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ شکیل کی شاعری کا یہ خوبصورت سفر یوں ہی جاری رکھیں گے۔ ڈاکٹر مخمور کاکوروی اور معید رہبر نے منظوم تاثرات پیش کیے۔ عرفان لکھنوی کے اظہار تشکر کے ساتھ تقریب کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 مارچ 2024

خواب سمندر

مراد آباد: گیت غزل سوسائٹی کے زیر اہتمام مشہور شاعر ڈاکٹر مجاہد فراز کے مجموعہ غزل خواب سمندر کی رسم اجرا ایم ایچ پی جی کالج لاجپت نگر میں ہوئی۔ اس خوبصورت

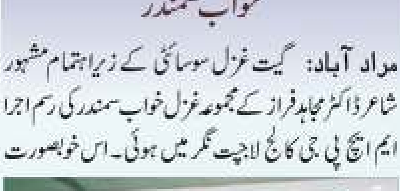

پروگرام کی صدارت منصور عثمانی نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مادھو شرما و ڈاکٹر محمد آصف نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی ایم ایچ ڈگری کالج کے منیجر ڈاکٹر کاویہ رستوگی تھے۔ تقریب کے مہمان ذی وقار محمد احمد خاں

نائب صدر آل انڈیا کانگریس اقلیتی شعبہ وسندیپ مہرو ترا نائب صدر جگر فاؤنڈیشن تھے۔ انھوں نے اس موقعے پر اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر مجاہد فراز کا یہ دوسرا مجموعہ کلام ہے جو بہت ہی اہم تاریخی دستاویز ہے اور اس کے لیے ڈاکٹر مجاہد فراز قابل صد مبارکباد ہیں۔ ڈاکٹر مجاہد فراز نے کہا کہ بقول ڈاکٹر رشید احمد صدیقی غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ موجودہ دور میں اس کی مقبولیت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے اور دونوں خصوصاً ادبی ذوق رکھنے والوں نے غزل کی مقبولیت دن بدن بڑھ رہی ہے کیونکہ غزل آج کے دور میں ہر طرح کے دلی جذبات کی آئینہ داری کا ذریعہ ہے۔ اس میں بات دل سے نکلتی ہے اور دل تک پہنچتی ہے۔ اپنے صدارتی کلمات میں منصور عثمانی نے کہا کہ ڈاکٹر مجاہد یوں تو دوہے ماہیے اور نظمیں بھی کہتے ہیں مگر ان کی فکر کی جو بلندی غزلوں میں نظر آتی ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اس موقعے پر مشہور شاعر ضیا ضمیر، ڈاکٹر منوج رستوگی، یوگیندر ورما نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے کنوینر سید یوسف علی قدوسی نے سبھی مہمان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 مارچ 2024

گفتگو چاند سے

لکھنؤ: بدایوں ضلع اردو ادبی تخلیق کی وجہ سے پوری دنیا میں جانا جاتا ہے، اسی ضلع کے نوجوان شاعر و ناظم مشاعرہ ڈاکٹر ہلال بدایونی نے ضلع کا نام پھر روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر ہلال بدایونی کی ہندی میں لکھی گئی کتاب 'گفتگو چاند سے' کا ملک کے معروف قلمکاروں کے ہاتھوں حیدرآباد کے بین الاقوامی مشاعرہ میں اجرا کیا گیا جس میں ہندوستان کے علاوہ دبئی، کویت، بحرین، نیپال اور عرب کے شعرا نے شرکت کی اور شاعر ڈاکٹر ہلال بدایونی کو ان کی کتاب کے اجرا پر مبارکباد دی۔ داغ دہلوی فاؤنڈیشن کے بانی و صدر سید مسکین احمد کی جانب سے منعقد رویندر بھارتی تھیٹر، حیدرآباد میں منعقدہ تاریخی پانچویں بین الاقوامی مشاعرے میں معروف شاعر و ناظم مشاعرہ ڈاکٹر ہلال بدایونی کی کتاب کی بین الاقوامی سطح پر رونمائی کی گئی۔ ڈاکٹر ہلال بدایونی کی ہندی دیوناگری رسم الخط میں شائع ہونے والی کتاب میں غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات اور دوہے شامل ہیں، جو خاص طور پر ان ہندی بولنے والوں کے لیے ہیں، جو ہندی لکھنے اور پڑھنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں اور ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 مارچ 2024

سلطانہ کا خواب: تعارف وتانیثی تجزیہ

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں منعقدہ بین الاقوامی سماجی علوم کانگریس کے موقعے پر پروفیسر آمنہ تحسین، صدر شعبہ تعلیم نسواں، مانو کی کتاب 'سلطانہ کا

خواب: تعارف وتانیثی تجزیہ' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر، نے اس کا اجرا کیا۔ اس اجلاس میں پروفیسر دھننجے سنگھ، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بہ حیثیت مہمان خصوصی شریک تھے جب کہ پروفیسر فرقان قمر، سابق وائس چانسلر، یونیورسٹی آف راجستھان وسنٹرل یونیورسٹی آف ہماچل پردیش کے علاوہ پروفیسر دیپک کمار، اعزازی پروفیسر، مانو، بہ حیثیت مہمانان اعزازی شریک رہے۔ اس موقعے پر، پروفیسر فریدہ صدیقی، ڈین اسکول برائے فنون وسماجی علام وفنون، مانو بھی موجود تھیں۔ کتاب کی اشاعت پر تمام افراد نے پروفیسر آمنہ تحسین کو مبارکباد پیش کی۔ واضح رہے کہ پروفیسر آمنہ تحسین کی یہ آٹھویں کتاب ہے۔ خواتین کی تاریخ، نسائی ادب، صنفی تصورات ونظریات اور تانیثی تنقید کے علاوہ خواتین کی ترقی و بااختیاری ان کے مطالعہ وتحقیق اور تدریس و سماجی کارکردگی کے میدان ہیں۔ ان موضوعات پر ان کے مقالے ملک کے موقر جرائد اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 مارچ 2024

وفیات

ظفر آغا

نئی دہلی: اردو انگریزی کے بزرگ صحافی اور قومی آواز کے چیف ایڈیٹر ظفر آغا کا 22 مارچ کی صبح دہلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں حرکت قلب بند ہوجانے کے

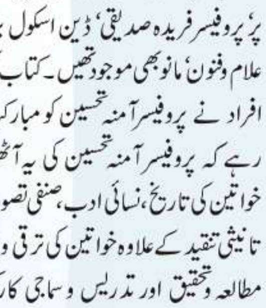

سبب انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 برس تھی اور وہ نمونیہ اور سینے کے انفکشن کے مرض میں مبتلا تھے۔ مسٹر ظفر آغا کو پہلے دہلی کے ایمس میں داخل کرایا گیا تھا بعد میں ایک پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں بھرتی کیا گیا جہاں انھوں نے 22 مارچ کی صبح پانچ بجے آخری سانس لی۔ نماز جنازہ درگاہ شاہ مرداں میں ادا کی گئی جب کہ ان کی تدفین حوض رانی قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں صحافت اور مختلف شعبہ ہائے حیات کے سرکردہ لوگوں نے شرکت کی۔ خاندانی ذرائع کے مطابق پسماندگان میں ایک بیٹا ہے، اہلیہ ثمینہ رضوی کا انتقال کورونا کے دوران ہوگیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی اور معروف صحافی اور تجزیہ نگار قمر آغا ہیں۔ وہ الہ آباد کے رانی منڈی کے رہنے والے تھے، اسکولی تعلیم یادگار حسینی اسکول سے ہوئی اور اعلیٰ تعلیم الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ تعلیم کے بعد روزگار کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز انگریزی روزنامہ 'پیٹریاٹ' سے کیا تھا لیکن ان کو شہرت انڈیا ٹوڈے سے ملی۔ ان کے کالم اردو اور انگریزی کے علاوہ متعدد زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔ مسٹر ظفر آغا 2006 میں اردو روزنامہ صحافت کے بھی مدیر رہے اور اس کے بعد وہ اردو روزنامہ جدید میل کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔ ٹیلی ویژن پر کئی پروگرام پیش کیے اور تجزیہ کار کے طور پر بھی متعدد نیوز چینل میں حصہ لیا۔ ای ٹی وی (اردو) پر ان کا پروگرام گفتگو اردو میں انتہائی مقبول اور سب سے زیادہ دیکھا جانے والا پروگرام ہے۔ 2017 میں جب قومی آواز کی پورٹل کی شکل میں شروعات ہوئی تھی تو ان کے مدیر اعلیٰ بنائے گئے۔ نیلابھ مشرا کے انتقال کے بعد مسٹر ظفر آغا گروپ ایڈیٹر بنائے گئے۔ وہ اس وقت بھی تجزیہ کار اور ایکسپرٹ کے طور پر کئی چینل سے وابستہ تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 مارچ 2024

عارف ایوبی

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے سابق صدر اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے سابق چیئرمین پروفیسر عارف ایوبی کا 12 اپریل 2024 کو تقریباً چار بجے حرکت قلب بند ہوجانے کے سبب انتقال ہوگیا۔ پروفیسر

عارف فرید ایوبی جنھیں عارف ایوبی کے نام سے جانا جاتا تھا، ان کا آبائی وطن سندیلہ تھا، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کے انتہائی

مرحلے لکھنؤ یونیورسٹی میں طے ہوئے۔ انھوں نے فارسی ادبیات میں پی ایچ ڈی کی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں وہ استاد مقرر ہوئے اور پھر شعبہ کے صدر بھی ہوئے۔ اپنے دوران کار میں پروفیسر ایوبی نے فارسی زبان و ادب کے فروغ کے لیے جدید تکنیک کا سہارا بھی لیا جسے کافی پسند کیا گیا۔ ان کی کوشش تھی کہ فارسی کو مزید دلچسپ بنایا جائے تاکہ جو لوگ فارسی کو ایک مشکل زبان سمجھتے ہیں وہ فارسی کے قریب آئیں۔ ان کی اس راہ میں کی گئی مساعی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ پروفیسر ایوبی یو پی ایس سی کے پینل میں بھی شامل رہے اور متعدد سلیکشن کمیٹی میں انھیں مدعو کیا جاتا رہا۔ فارسی اور اردو ادبیات کے علاوہ ان کی رہائش گاہ پر ان ہی کی بنائی ہوئی پینٹنگس کا بھی ذخیرہ موجود تھا۔ وہ جدیدیت سے بہت متاثر تھے اور اسی طرح کے افسانے بھی لکھتے تھے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'ہبوط' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ انھوں نے اتر پردیش کے سابق گورنر شری رام نائک کی کتاب چریوتی چریوتی کا عربی اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کرا کے اپنی زبان دانی کا لوہا منوایا۔ ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی وطن سندیلہ لے جایا گیا جہاں بعد نماز جمعہ ان کی تدفین ہوئی۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 13 اپریل 2024

فرہاد آزر

نئی دہلی: منفرد لب و لہجے کے معروف شاعر ڈاکٹر فرہاد آزر کا طویل علالت کے بعد دہلی کے بترا ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔

وہ جگر کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر تقریباً 68 سال تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹیاں ہیں۔

ڈاکٹر فرہاد آزر کا آبائی وطن بنارس کا قصبہ بھدوہی تھا۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور بی ایڈ کیا اور وہیں سے پی ایچ ڈی کی۔ ملازمت کا آغاز ایم سی ڈی اسکول حوض رانی سے بہ حیثیت استاد کیا۔ پھر ترقی کر کے دہلی سرکار کے سینئر سیکنڈری اسکول سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے شعری مجموعوں میں خزاں میرا موسم، قسطوں میں گزرتی زندگی، ایلین اور بچوں کے ادب پر کئی کتابیں شامل ہیں۔ انھوں نے 'ادب عالیہ' کے عنوان سے ایک مجلّہ کا اجرا کیا تھا جس کے کئی شمارے نہ صرف شائع ہوئے بلکہ ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اردو اکیڈمی دہلی سمیت کئی تنظیموں نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ سے نوازا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اپریل 2024

راشد انور راشد

رانچی: مشہور ادیب، شاعر اور نقاد پروفیسر راشد انور راشد راشد کا 7 اپریل 2024 کو ممبئی کے ٹاٹا میموریل

اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ کافی دنوں سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر تقریباً 53 برس تھی۔ راشد انور راشد 27 مئی 1972 کو جھارکھنڈ کے شہر رانچی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے رانچی یونیورسٹی سے بی اے آنرس کرنے کے بعد جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کریم یونیورسٹی جمشید پور میں چند برسوں کی درس و تدریس کے بعد گذشتہ 21 برسوں سے وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے جہاں وہ ابھی ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر مامور تھے۔ اب تک ان کے چار شعری مجموعے شام ہوتے ہی، کہرے میں ابھرتی پرچھائیاں، گیت سناتی ہوا اور قریب آؤ (ہندی) شائع ہو چکے ہیں۔ مجروح سلطانپوری، علقمہ شبلی، وہاب اشرفی، قاضی عبدالستار اور طارق چھتاری کی حیات و خدمات پر تفصیلی کتابوں کے علاوہ تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد بھی نصف درجن ہے۔ انھیں دہلی، بہار، اتر پردیش اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں نے انعامات سے نوازا ہے۔ 2018 کے بزم صدف نئی نسل ایوارڈ کے لیے راشد انور راشد کے نام کا متفقہ طور پر انتخاب عمل میں آیا جو ان کی شاعرانہ اور تنقیدی خدمات کے لیے 2018 میں دیا گیا تھا۔

روزنامہ 'تصدیق' پٹنہ، 8 اپریل 2024

ستیش فگار

مراد آباد: مراد آباد کے سینئر ادیب ستیش کمار گپتا فگار جنھوں نے اردو اور ہندی میں یکساں اختیار کے ساتھ تخلیق کیا، 14 اپریل کی صبح انتقال کر گئے۔ وہ کافی عرصے سے بیمار تھے۔ ان کی آخری رسومات شام 4 بجے لوکشیڈ کے موکش دھام میں ویدک رسومات کے مطابق ادا کی گئیں۔ 25 جنوری 1941 کو نئی بستی، مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مراد آباد کے ہندی اور اردو ادب میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ ان کی شائع شدہ تصانیف میں فکر جمیل (اردو اور ہندی دونوں میں غزلوں کا مجموعہ)، خواب پریشاں (اردو میں)، عکس جمال (اردو میں غزل کا مجموعہ)، کوثر مدحت (اردو میں منقبت)، کسک (ہندی میں شعری مجموعہ) شامل ہیں۔ بھیگے نین (شعری مجموعہ ہندی میں)، خلوت (اردو میں غزلوں کا مجموعہ)، تمھاری یاد شبدوں میں (ہندی میں تجلی)، ہنستا اور ہنساتا چل (ہندی میں) اور محسن اسلام وغیرہ ادبی دنیا میں بہت مشہور ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی تصانیف بھی غیر مطبوعہ ہیں۔

شری فگار کاویہ سدھا لٹریری فورم مراد آباد کے صدر اور انٹرنیشنل لٹریری آرٹس فورم، مراد آباد کے تاحیات رکن بھی تھے۔ وہ عمر بھر شہر کے کئی دوسرے ادبی اداروں سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے ایک بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر وکیل کے طور پر بھی معاشرے کی خدمت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 اپریل 2024

الحاج قمر مسعود

ارریہ: ضلع کی معروف شخصیت الحاج قمر مسعود کا 23 مارچ کی شب کو انتقال پر ملال ہوگیا۔ ان کی پیدائش ضلع کے جوکی ہاٹ واقع بگڈھرا گاؤں میں 30 ستمبر 1939 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے 18 مارچ 1963 میں بحیثیت

معاون مدرس آزاد اکیڈمی جوائن کیا تھا اور تدریسی ملازمت سے وہ 2000 میں سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بگڈھرا مڈل اسکول نیز ایچ ای ہائی اسکول ارریہ سے ہوئی جبکہ ثانوی تعلیم کٹیہار ڈی ایس کالج سے ہوئی تھی۔

الحاج قمر مسعود نے یادداشت پر مشتمل اپنا سوانحی خاکہ 'اوراق زندگی' بھی لکھا تھا جس میں انھوں نے شب و روز کے واقعات، مشاہدات اور نرم گرم حالات تحریر کیا ہے۔ پسماندگان میں بیوہ اور تین بیٹیاں نیز نواسے نواسیاں ہیں۔

پریس ریلیز: عبدالغنی، ارریہ، 15 مارچ 2024

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

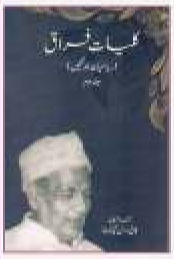

ترتیب و تدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

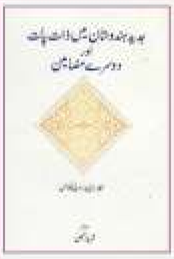

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

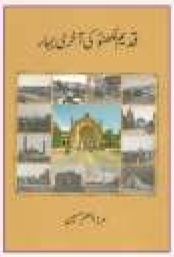

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

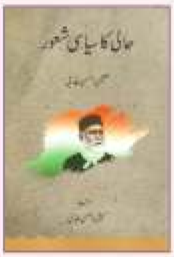

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

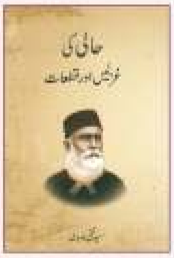

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मई-२०२४,वर्ष:२६, अंक:५
URDU DUNIYA Monthly, May-2024, Vol.26, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/04/2024**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6